بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقہ القرآن

حقوق انسان

اداء الحقوق

مؤلفہ

مولانا عمر احمد عثمانی

ادارہ فکر اسلامی

[illegible] کراچی

طبع اوّل : جولائی ۱۹۸۲ء

طبع دوم : جولائی ۱۹۸۶ء/ جنوری ۲۰۰۳ء

مطبع : فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

ناشر : **ادارۂ فکر اسلامی**

کاشانۂ حفیظ نمبر ۲۴۰

گارڈن ایسٹ، ایسرداس اسٹریٹ، کراچی

﴿نوٹ از ناشر﴾

پہلی اشاعت میں موجودہ کتاب ''حقوقِ نسواں اور باہمی حقوق'' کو **فقہ القرآن** کی جلد سوم کے طور پر شائع کیا گیا تھا لیکن اب چونکہ ہم ہر حصے اور ہر جلد کو مستقل عنوان کے تحت شائع کر رہے ہیں تاکہ قارئین کرام جس عنوان سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ متعلقہ کتاب خرید سکیں۔ اور ذہن پر بوجھ نہ رہے کہ جب تک ہم تمام جلدیں نہ خریدیں، تسلسل باقی نہیں رہے گا، لہٰذا اب یہ کتاب جلد سوم نہیں سمجھی جائے گی بلکہ اپنے عنوان ''حقوقِ نسواں اور باہمی حقوق'' کے تحت دستیاب ہوگی۔

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خان

(صدر ادارۂ فکر اسلامی)

فہرست مشمولات

مضمون	صفحہ
فہرست مشمولات	۳
سرنامہ	۷
انتساب	۸
تشکر	۹
عرضِ ناشر	۱۰
تعارف فقہ القرآن جلد سوم	۱۳
حقوق و فرائض	۲۱
حقوق کی وسعت	۲۶
حقوق کی ترتیب	۳۳
ہر دو اصناف	۳۸
مرد و عورت	۴۰
عہدی قرابت داری	۴۳
مرد اور عورت برابر	۴۵
لباس کی تمثیل	۴۶
صلاحیتوں میں فرق	۵۲
مادّی نقطۂ نظر	۵۳
عورت اور اسلام	۵۶
عورت ہمیشہ مظلوم رہی ہے	۵۷
عورت یورپ میں	۶۱
عورت اسلامی معاشرہ میں	۶۴
کیا مرد عورتوں کے حاکم ہیں؟	۶۵
فضیلت	۶۹
انفاق اموال	۷۱
لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ	۷۲
نشوز کا خوف	۷۸
سزا کی اجازت	۷۹
وراثت میں عورت کا آدھا حصہ	۸۵
شہادت میں دو عورتیں اور ایک مرد۔ حنفیہ کا اصول تقیید	۸۷
تنہا عورتوں کی گواہی	۱۰۱
حدود اور قصاص میں عورت کی شہادت قبول کرنے پر صحابہ کا اجماع	۱۰۵

حضرت نائلہ کا تنہا بیان	۱۰۸
عورت اور مرد کی مشترکہ شہادت	۱۱۳
حدود میں عورتوں کی شہادت	۱۱۸
حنفیہ کا اصول	۱۲۱
روایت حدیث میں عورت پر اعتماد	۱۲۷
طفلانہ استدلال	۱۲۸
جنت میں مردوں کیلئے حوریں	۱۳۰
ازواج مطہرہ	۱۳۱
ایک نکتہ	۱۳۴
عورت کی تعلیم و تربیت	۱۳۹
اجتماعی عبادات میں عورتوں کی شرکت	۱۵۴
عورت میدان عمل میں	۱۶۱
عورت میدان وغا میں	۱۶۶
عورت سربراہِ خانہ	۱۷۶
عورت کی رائے اور مشورہ	۱۸۰
صلح حدیبیہ اور حضرت ام سلمہؓ	۱۸۶
جنازہ کی شکل اور حضرت اسماءؓ	۱۸۷
حضرت عمرؓ اور خواتین	۱۸۷
تنقید و احتساب	۱۸۸
عورت اور ذمہ داری کے مناصب	۱۹۴
امامت صغریٰ	۱۹۸
مردوں کی امامت	۲۰۰
زنانہ مسجدیں	۲۰۲
جہاد	۲۰۵
ایک اہم سوال	۲۱۰
مشترک محفلوں میں شرکت	۲۱۱
مردوں کے مجمع کو خطاب	۲۱۴
مخلوط تعلیم	۲۱۶
مغربی اندازِ معیشت	۲۱۷
تنہا سفر کی اجازت	۲۱۸
عورت کی دیت	۲۲۰
کیا عورت قاضی بن سکتی ہے	۲۳۲
عورت کی ذہنی صلاحیتیں	۲۳۶
عورت سیاسی میدان میں	۲۴۰
عورت سربراہِ مملکت	۲۵۷
خواتین کے لئے اسوۂ حسنہ	۲۹۲
جنگِ جمل کے روشن پہلو	۲۹۳
شرعی پردہ	۳۰۵
جلباب اور خمار	۳۲۴
والدین کا حق	۳۲۸
ماں	۳۳۰
باپ	۳۳۴
والدین کی اطاعت	۳۴۱
اسلام کی سہولت	۳۴۶
قتل اولاد	۳۴۷
اولاد کے حقوق	۳۵۵

اولاد کی عظمت	۳۵۵	حسنِ معاشرت	۴۲۸
بچوں کے حقوق	۳۵۷	شوہر کی اجازت کے بغیر	۴۲۹
اولاد کشی	۳۵۹	نصف مہر یا متعہ	۴۳۰
رضاعت وحضانت	۳۷۲	نان ونفقہ وسکنیٰ کی سال بھر تک وصیت	۴۳۲
تعلیم وتربیت	۳۷۳		
عدم امتیاز	۳۷۵	جہیز کی رسم	۴۳۳
حقوق الزوجین	۳۷۸	حضرت فاطمہؓ کے جہیز کی حقیقت	۴۳۷
قوّامہٗ	۳۸۱	قرابت داروں کے حقوق	۴۴۶
مہر	۳۸۲	ہمسایہ کے حقوق	۴۵۳
نفقہ	۳۸۳	پڑوسی کے ساتھ طرزِ عمل انسانی اخلاق کا معیار ہے۔	۴۶۰
ظلم سے اجتناب	۳۸۴		
ضرار و تعدی	۳۸۵	یتیموں کے حقوق	۴۶۱
ازواج میں عدل نہ کرنا	۳۸۶	بیوہ کے ساتھ حسن سلوک	۴۷۱
حفظ للغیب	۳۸۹	حاجت مندوں کے حقوق	۴۷۵
شوہر کی اطاعت	۳۹۰	بیماروں اور معذوروں کے حقوق	۴۸۲
وعظ ونصیحت	۳۹۴	مسجد مسلمانوں کا ہسپتال	۴۸۸
طلاق	۳۹۸	مہمانوں کے حقوق	۴۹۰
وجوہ نزاع	۴۰۳	کم از کم ایک وقت کا کھانا اہتمام سے ہو۔	۴۹۵
بدصورتی	۴۰۷		
شوہر کی اجازت	۴۱۷	مسلمانوں کے باہمی حقوق	۴۹۶
قرآن کریم کی ہدایت	۴۲۲	بھائی بھائی	۴۹۷
گھر سے نکلنے کی اجازت	۴۲۳	نااتفاقی کی ممانعت	۴۹۹
مسجد میں بلا اجازت جانا	۴۲۴		

بین الاقوامی عدالت انصاف قائم کرنے کا حکم جس کے پاس قوت نافذہ بھی ہو۔	۵۰۰	رحماء بینھم	۵۰۷
		ایک دوسرے سے بدظنی نہ ہو	۵۰۷
		احادیث نبوی	۵۰۸
ایمان لاتے ہی بھائی	۵۰۲	باہمی قتل اور جھگڑا	۵۱۱
غلام بھی بھائی	۵۰۳	انسانی برادری کے حقوق	۵۱۵
قاتل بھی بھائی	۵۰۳	جانوروں کے حقوق	۵۲۳
غیبت کی ممانعت	۵۰۴	جانوروں کے آرام و آسائش کے متعلق احادیث نبوی۔	۵۲۹
یتیم بھی بھائی	۵۰۵		
جو گذر چکے وہ بھی بھائی	۵۰۶	فہرست کتب حوالہ	۵۳۴
ضمیمہ۔ حوروں کی حقیقت			

فقہ القرآن جلد اوّل کتاب الطہارۃ۔ کتاب الصلوۃ۔ کتاب الزکوۃ۔ کتاب الصوم۔ کتاب الحج۔ کتاب النکاح۔ کتاب الرضاعۃ۔ (قیمت پچاس روپئے)

فقہ القرآن جلد دوم کتاب الطلاق۔ باب الرجعۃ۔ باب الایلاء۔ باب الخلع۔ باب الظہار۔ باب اللعان۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق پہلا افسانہ (عمر عائشہؓ) دوسرا افسانہ (نکاح زینبؓ) تیسرا اور چوتھا افسانہ (موہوبات اور تخییر) پانچواں افسانہ (ایلاء) چھٹا افسانہ (تحریم)

باب خیار الفسخ۔ باب العدۃ۔ باب ثبوت النسب۔ باب النفقہ۔ کتاب العتاق کتاب الایمان۔ (قیمت پچاس روپئے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ (۳۳/۶)

(نبی مسلمانوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں اور آپ کی ازواج ان کی مائیں ہیں۔)

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ ام المؤمنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حضور نذرانۂ عقیدت واخلاص پیش کرتا ہے جن کی ذات ہمارے دور کی مسلمان خواتین کے لئے ایک مینارۂ نور ہے اور جن کی شخصیت میں ان کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔

حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تُزَنُّ بِرِيبَةٍ　　وَتُصْبِحُ غَرْثَى مِنْ لُحُومِ الْغَوَافِلِ

آپ پاکدامن، باوقار، ہر تہمت سے مبرا ہیں　　اور ہمیشہ پاکدامن عورتوں کی غیبت سے دور رہی ہیں

حَلِيلَةُ خَيْرِ النَّاسِ دِينًا وَمَنْصِبًا　　نَبِيِّ الْهُدَى وَالْمَكْرُمَاتِ الْفَوَاضِلِ

آپ ایسی ہستی کی بیوی ہیں جو اپنے دین منصب کے لحاظ سے سب سے بلند ہیں جو ہدایت اور بلند اخلاق و اعمال کے لانے والے نبی ہیں

لَهَا رُتَبٌ عَالٍ عَلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ　　تَقَاصَرَ عَنْهُ سُورَةُ الْمُتَطَاوِلِ

ان کا مقام و مرتبہ سب لوگوں پر بلند ہے　　اور بلندی طلب کرنے والے کا مقام اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے

سیدنا حسان ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عمر احمد عثمانی

باسمہٖ سبحانہٗ

انتساب

میں اس قرآن کی خدمت کو جو میری نسبت سے انتہائی حقیر، اور قرآن کریم کی نسبت سے نہایت ہی عظیم المرتبت ہے پھر اپنے جدامجد حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ اور اپنے والد ماجد حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اسمائے گرامی اور حضرۃ الاستاذ الشیخ مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ مظاہر العلوم سہارنپور کے اسمِ گرامی سے معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جن کی دعاؤں اور توجہاتِ عالیہ نے مجھے قرآن کریم کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

پر تقصیر و ناکارہ

عبدہٗ من عبادہٖ عمر احمد عثمانی

تشکر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من لا یشکر الناس لا یشکر اللہ

(ترمذی)

میں بصمیمِ قلب کے ساتھ ادارۂ فکر اسلامی کراچی کے تمام اراکین اور خصوصیت کے ساتھ ادارہ کے چیرمین اور صدر جناب محترم ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں صاحب (ایس ایس، ایم ڈی، ایف سی پی پی، امریکہ) اور ادارہ کے سکریٹری جنرل مولانا قاری طاہر المکی کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں کہ اول الذکر موصوف کی مالی جدوجہد اور ثانی الذکر کے علمی تعاون اور زریں مشوروں سے "فقہ القرآن" جلد سوم ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکا۔

فجزاہما اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

آمین

عمر احمد عثمانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ط (الجاثیہ ۴۵/۲۹)

(یہ ہماری کتاب ہے جو تمہارے سامنے حق ہی بیان کرے گی)

عرضِ ناشر

"فقہ القرآن" جلد دوم کو ابھی ہدیۂ ناظرین ہوئے پورا ایک سال نہیں ہوا کہ میں نہایت ہی مسرت و فخر کے ساتھ اب تیسری جلد کو بھی ہدیۂ ناظرین کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جس پر میں حق تعالیٰ کا جتنا شکر بھی ادا کروں کم ہے فقہ القرآن کی یہ جلد حقوق و فرائض پر مشتمل ہے۔ اس میں عورت اور مرد کے حقوق و فرائض بھی آ گئے ہیں اور اسلامی معاشرہ میں عورت کی کیا حیثیت ہوتی ہے یہ مسئلہ بھی زیر بحث آ گیا ہے۔ حسنِ اتفاق ہے کہ نظامِ اسلامی کی جد و جہد میں جو آجکل ہماری حکومت اور عوام کے پیش نظر ہے یہ مسئلہ بھی ہمارے علماء اور عوام کے سامنے ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کی کیا حیثیت ہے اور اس کا کیا مقام ہے۔ یہ بحث کافی زور و شور کے ساتھ اخبارات میں بھی چلتی رہی ہے اور چل رہی ہے۔ اس لئے میں اگر یہ کہوں تو غالباً بیجا نہ ہو گا کہ یہ جلد وقت کی پکار کا موزوں ترین جواب ہے اور بر وقت جواب ہے۔ خواتین کے طبقہ میں آج کل جو ہیجانی ارتعاش طاری ہے یقیناً یہ کتاب ان کے

ہیجان کو پر سکون کرنے اور قرآن کی روشنی میں اُنہیں اپنے حقوق و فرائض کو سمجھنے میں بہت کارآمد اور مفید ثابت ہوگی۔ اور عورت کے حقوق کو تسلیم نہ کرنے والوں کے لئے مسکت جواب ثابت ہوگی۔

میرے مطالعہ کا جہاں تک تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کسی زبان میں بھی اس سے بہتر، زیادہ جامع اور زیادہ مکمل کتاب نہیں لکھی گئی۔ مولانا عمر احمد عثمانی صاحب نے اس کتاب میں اپنی طرف سے کوئی نئی بات نہیں کہی بلکہ قرآن و سنت کو سامنے رکھتے ہوئے جائزہ اور صحیح استدلال کی روشنی میں انہوں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ پیش کر دیئے ہیں اور حسبِ عادت اُنہوں نے کوشش فرمائی ہے کہ اپنی تائید میں سلف صالحین اور ائمۂ مجتہدین کی جو آراء مل سکیں انہیں پیش کر دیں۔ تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ مولانا نے کسی تجدد پسندی کا سہارا لیا ہے۔ اس سے پہلی دونوں جلدوں میں بھی مولانا نے یہی کوشش کی تھی کہ جہاں وہ قرآن کی روشنی میں فقہ حنفی کے کسی اجتہاد کو چھوڑنے پر مجبور ہوں تو اپنی رائے کی تائید میں دیگر فقہاء و مجتہدین کی آراء سے اپنی تقویت بہم پہنچا دیں۔ مولانا موصوف نے اس جلد میں بھی اپنے اس التزام کو برقرار رکھا ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ ہر مسئلے میں جہاں مولانا نے فقہ حنفی کے کسی مسئلے سے اختلاف فرمایا ہے مولانا کو سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین میں سے کسی نہ کسی کا قول ضرور مل گیا ہے جن سے ان کے استدلال اور استنباط کی تائید ہو جاتی ہے۔ بہرحال یہ کتاب عورتوں کے مسائل اور ان کے حقوق و فرائض پر ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے امید ہے کہ خواتین

اس سے مکمل استفادہ کر سکیں گی۔

ادارۂ فکر اسلامی نے کوشش کی ہے کہ فقہ القرآن جلد سوم بھی پہلی دونوں جلدوں کی طرح اپنی کتابت، طباعت، کاغذ وغیرہ میں تمام ان ہی اہم خصوصیات کی حامل رہے اور کسی طرح ان سے فروتر نہ ہو بلکہ ان سے کچھ نہ کچھ فزوں تر ہی ہو۔

آخر میں اپنے پریس کا شکریہ ادا کرتا چلوں جس نے فقہ القرآن جلد اول و دوم کا بڑی عمدہ آراء سے استقبال کیا تھا امید ہے کہ وہ حسبِ معمول اس نئی جلد کا بھی خیر مقدم فرمائے گا۔

والسلام

مخلص

(ڈاکٹر) حبیب الرحمان خاں

فقہ القرآن جلد سوم ۳	زیر نظر جلد (قیمت پچپن روپے) مجلد ساٹھ روپے)
فقہ القرآن جلد چہارم ۴	کتاب الحدود۔ حد قذف۔ افسانۂ افک کتاب السرقہ۔ باب قطاع الطریق۔

کتاب القصاص۔ قصاص حضرت عثمان ذی النورین رضؓ۔ کتاب الدیات۔ باب الخوارج۔ کتاب التعزیر۔ احکام المرتدین۔ باب الرجم (قیمت ساٹھ روپے)

فقہ القرآن جلد پنجم ۵	رجم (سنگسار کرنا) اصل حد ہے یا تعزیر؟ مسئلہ رجم پر تفصیلی بحث (قیمت بیس روپے)

تعارف فقہ القرآن حصّہ سوم

(حقوقِ نِسواں)

از ــــ طاہر مکی صدر المرکز القرآنی

علامہ اقبال نے ایک جگہ بڑی درد مندی کے ساتھ فرمایا ہے ؎

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں

حقیقت یہ ہے کہ حکماء ودانشور اس مسئلے کو سلجھا سکتے ہی نہیں کیوں کہ وہ اپنے مردانہ مفادات اور طبقاتی سوچ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اس مسئلہ کو صرف وحی الٰہی کی روشنی میں سلجھایا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس کی طرف قلب سلیم کو لے کر آیا جائے (۲۶/۸۹) لیکن اگر ہم نے یہاں بھی بجائے روایات کو کلامِ الٰہی کے ماتحت کرنے کے، کلام الٰہی کو روایات کے ماتحت کر دیا تو پھر آفتابِ قرآنی کی روشنی روایات کے کثیف بادلوں کے تحت کہاں نظر آسکتی ہے؟

اسی صورت حال کے پیش نظر اور حقوق نسوان کے معاملے کو اسلامی اصولوں کے مطابق پیش کرنے کے لئے آج سے پانچ سال قبل میں نے اپنے ایک دوست سے سیدۂ کائنات ام المؤمنین حضرت

عائشہؓ صدیقہ کی ایک سوانح مرتب کرائی تھی۔ اس کے تعارف میں میں نے لکھا تھا کہ :-

" مسلمانوں کے معاشرے کو اگر عمرانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ عجیب و غریب بات سامنے آئے گی کہ ان کے ہاں بحیثیت مجموعی عورت کی عزّت بہت کم ہے۔ ان کے مقابلے میں ایک مسیحی معاشرے اور ہندو معاشرے میں انہیں زیادہ عزّت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے

پھر یہ تعجّب اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کی بنیادی مذہبی کتاب قرآن مجید اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عملی زندگی یعنی سنّت میں مسلمانوں کے اس طرزِ عمل کے برعکس خواتین کی عظمت و اہمیّت اور ان کی بلندی و برتری کے نقوش، قدم قدم پر نمایاں نظر آتے ہیں۔

دوسری طرف ہندوؤں کی مذہبی کتاب ویدا اور مسیحیوں کی بائبل میں عورت کی عظمت کا کہیں پتہ نہیں چلتا مگر عملاً وہ اس معاملے میں مسلمانوں سے بہتر ہیں۔

غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قوموں اور معاشروں پر نظریاتی اصول اتنے اثر نہیں کرتے جتنے نمونہ ہائے عمل اثر کرتے ہیں۔ مثلاً مسیحیوں کے ہاں نظریاتی طور پر اگرچہ عورت کو کوئی بلند مقام حاصل نہیں مگر چونکہ ان کے سامنے بچپن سے بڑھاپے تک حضرت مریمؑ کا تعریفی انداز میں تذکرہ کیا جاتا ہے اس لئے عورت کی عظمت کا نقش ان کے دلوں پر کھُد جاتا ہے۔ اسی طرح گو ہندوؤں کی نظریاتی کتابوں میں عورت کے متعلق نہایت پست خیالات پائے جاتے ہیں مگر مختلف مذہبی

ڈراموں اور راماٗئن میں سیتا وغیرہ کے کردار کے ذریعے بچپن سے ان کے دلوں میں عورت کی عظمت گھر کر جاتی ہے جوان بے جان نظریاتی اصولوں کے کبھی کبھار پڑھ لینے یا سُن لینے سے زائل نہیں ہوتی۔

مگر مسلمانوں کے ہاں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے اور باوجود انتہائی عظیم نمونوں کی موجودگی کے کبھی انہیں عوام کے سامنے یا بچوں کی ابتدائی تعلیم میں پیش نہیں کیا جاتا۔ اب ظاہر ہے قرآن مجید کا سمجھ کر مطالعہ کرنے والے، مسلمانوں میں ایک فی ہزار بلکہ ایک فی لاکھ بھی مشکل سے ملیں گے، پھر ان کے سامنے صحیح نقطۂ نظر بھلا کس طرح آ سکتا ہے؟

مثال کے طور پر مسلمانوں میں ہر اعتبار سے عظیم اور مثالی خاتون ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ صلوات اللہ علیہا ہیں، جو علاوہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی اہلبیت ہونے کے محدّثہ ہیں، مفسّرہ ہیں، حافظہ ہیں، قاریہ ہیں۔ ادیبہ ہیں، خطیبہ ہیں۔ معلّمہ ہیں، فقیہہ ہیں۔ غرض مجموعۂ حسنات و کمالات ہیں۔ بلکہ نظر کو بلند تر کیجئے اور دیکھئے کہ پوری تاریخ عالم میں اتنی عظیم جامع الصفّات اور جامع الحیثیات خاتون جو زبردست عالم و فاضل بھی ہو اور حق کی خاطر سر بکف میدان میں نکل آنے والی بھی، انتہائی شجاع بھی ہو اور زبردست مدبّر بھی، گھریلو خاتون بھی ہو اور انتظامی صلاحیتوں کی مالک بھی ــــــــــ

ــــــ سوائے ان کے کوئی نظر آتی ہے؟

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ (۶۷/۴)

ترجمہ:۔ نگاہوں کو علم کی فضا میں پھر پرواز کا موقعہ دو تم دیکھو گے کہ تلاش وجستجو کے باوجود اسے گوشۂ چشم میں ناکام واپس آنا پڑے گا۔

مگر غور فرمائیے، اتنی عظیم خاتون کے متعلق بھی ہمارے عوام ہی نہیں بلکہ اہل علم اور پڑھے لکھے لوگوں میں بھی کتنی غلط فہمیاں موجود ہیں۔ کیا ان کے کارناموں، فضیلتوں اور عظمتوں سے کوئی واقف ہے؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ دشمنانِ اسلام و دشمنانِ قرآن و محمدؐ نے اپنی منظم فکری و تاریخی سازشوں کے ذریعے سیدۂ کائنات، مادرِ ملّتِ مسلمہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالاتِ زندگی کو اول تو مسلسل چھپانے کی کوشش کی اور جو تھوڑے بہت حالات ان کی دستبُرد سے محفوظ رہے ان میں بھی انہوں نے وہ تحریف کی اور انہیں ایسے رنگ میں پیش کیا جس سے شعوری و غیر شعوری طور پر مسلمانوں میں عورت کی عظمت کے بجائے ایسا تصوّر ابھرا جو آج عامّۃ المسلمین کی اکثریت میں نمایاں ہے۔

اب ذرا سوچیئے! جب اسلام کی اس سب سے عظیم خاتون کے متعلق مسلمانوں کے دل و دماغ میں اس قسم کے نقوش مرتسم ہوں تو پھر دوسری خواتین کے متعلق بلند خیالات کی اُن سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟

اسلام نے وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّھَاتُھُمْ (حضور اکرمؐ کی ازواج مطہرات تمام مسلمانوں کے لئے ماں کی طرح محترم ہیں) کہہ کر اہلبیتؓ نبوت کو جو مقام عطا کیا تھا اور جس مقصد سے عطا کیا

تھا، مسلمانوں نے اس کی اہمیت کو محسوس نہ کیا اور اس کے نتائج بھگت رہے ہیں وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۲۹/۴۰)

حقیقت یہ ہے کہ حادثۂ جمل وغیرہ کے نتیجے میں سیاسی مفادات کے پیشِ نظر سبائی دشمنانِ صحابہؓ نے اُمّ المؤمنین کے خلاف اتنا مکروہ پروپیگنڈہ کیا کہ شرم وحیا کی نگاہیں نیچی ہوگئیں اور حقیقتوں نے منہ چھپالیا۔ بطورِ مثال نہج البلاغہ ملاحظہ ہو جس کا مصنّف رضی پانچویں صدی ہجری (۴۰۶ھ) میں وفات یافتہ ہے۔ اس دور میں عباسی سلطنت پر مصنّف کے ہم مسلک آل بویہ چھائے ہوئے تھے اور مصر وغیرہ پر اسماعیلیوں کی حکومت تھی یعنی بقول ٹوائن بی اس دور میں تمام عالم اسلام شیعوں کے زیر تسلّط تھا۔

مصنّف نے اس کتاب میں حضرت علیؓ کے نام سے منسوب بہت سے خطبات و مکاتیب جمع کر دیئے ہیں جن کی کوئی سند اس نے نہیں دی، کتنے تعجب کی بات ہے کہ ساڑھے تین سو سال بعد ایک شخص ان خطبات و مکاتیب کو مدوّن کرنے کا بیڑہ اٹھاتا ہے مگر نہ ان کی سند دیتا ہے نہ اپنے مآخذ کے حوالہ دیتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نہج البلاغہ میں قدم قدم پر مصنّف نے اپنے خیالات و اعتقادات حضرت علیؓ کی زبان سے کہلوائے ہیں اور حضرت علیؓ کی بلند و بالا شخصیت کو ایک خاص فرقے کا ترجمان بنا کر رکھ دیا ہے۔ بطورِ مثال اس کے ابتدائی خطبوں میں سے ایک "خطبۂ شقشقیہ" ملاحظہ فرمالیا جائے تو اصل حقیقت سامنے آجائے گی۔

کہنا یہ تھا کہ اس کتاب کے مصنّف نے خواتین کے متعلق بھی اپنے ناپسندیدہ خیالات حضرت علیؓ جیسی عظیم شخصیت کی زبان سے کہلوائے ہیں۔ کبھی کہتا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا :۔

اَلْمَرْأَةُ عَقْرَبٌ حُلْوَةُ اللَّبْسَه۔

ترجمہ :۔ عورت خوش معاشرت بچھو ہے ساتھ ہو تو خوشی ضرور ہوتی ہے مگر ڈنک مارنے سے نہیں رُکتی۔[1]

اور کبھی لکھتا ہے کہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے :۔

اَلْمَرْأَةُ شَرٌّ كُلُّهَا وَشَرٌّ مَا فِيْهَا اَنَّهُ لَابُدَّ مِنْهَا۔

ترجمہ :۔ یہ عورت سراپا آفت ہے اور اس سے زیادہ آفت یہ ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔[2]

ایک جگہ انتہائی فحش انداز میں زبان درازی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے جو" جنگِ جمل کے بعد بدکردار عورتوں سے متاثر ہو کر فرمایا :۔

لوگو! عورتوں کا عقیدہ، ان کا حصہ (یعنی حقوق) اور عقلیں ناقص ہیں۔ ایمان ناقص ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ایام میں نماز و روزہ سے مستثنیٰ ہیں۔ عقل ناقص ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ حصے کے کم ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ میراث میں مردوں

---

[1] نہج البلاغۃ (عربی اُردو) حصہ ملفوظات صنـ۸۸ـ ۵۹ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز تیسرا اڈیشن فروری ۱۹۶۳ء زیر نگرانی شیعہ عالم مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔

[2] نہج البلاغۃ (عربی اُردو) حصہ ملفوظات صـ۹۱ـ ۲۳۱

سے آدھا حصّہ ہے۔

تو بدکردار عورتوں سے بچو اور نیکوں سے محتاط رہو۔ اور نیک کاموں میں بھی ان کے فرمانبردار نہ بنو تاکہ بُرائی میں تمہاری فرمانبرداری کی اُمید نہ رکھیں"

(نہج البلاغۃ حصۂ خطبات ص ۲۸۹ خطبہ ع ۷۹)

یہ طریقہ ہوتا ہے پروپیگنڈے کا۔ اور اس طرح بزرگوں کی طرف خواتین کے خلاف اقوال منسوب کرکے انہیں بدنام کیا گیا ہے۔

نہایت مسرت کا مقام ہے کہ فقہ القرآن کی پہلی جلد کتاب النکاح اور دوسری جلد کتاب الطلاق کے بعد اب اس تیسری جلد میں قرآنی روشنی میں حقوقِ نسواں پر اتنی مکمل اور بھرپور بحث کی گئی ہے کہ آج تک اسلامی لٹریچر میں (دنیا کی کسی زبان میں بھی) اس کی مثال نہیں ملتی اور دشمنانِ اسلام و دشمنانِ خواتین کے اٹھائے ہوئے غبار کو قرآن کریم کی برکت سے بالکل صاف کردیا گیا ہے یہ صرف اللہ کا فضل وکرم ہے کہ وہ ادارۂ فکرِ اسلامی سے فقہ کی تدوینِ جدید کا عظیم کام لے رہا ہے۔ اور جو کام حکومتوں اور سلطنتوں کے کرنے کا تھا اور جس کی آرزو میں علامہ اقبال اور ہندو پاک کے کئی عظیم دینی مدارس اور اداروں کے سرکردہ حضرات اپنے خدا سے جا ملے، وہ فریضہ، کارسازِ دوجہاں اپنے چند ناتواں بندوں کے ذریعے پورا کرا رہا ہے فللّٰہ الحمد ولہ الشکر وعلیہ التکلان نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

کیا عجب کہ جس طرح تاریخ اسلام کے دورِ اول میں حضرتِ الٰہیہ کی جانب سے امامنا الاعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو تدوین فقہ کی توفیق عطا

ہوئی اور باوجود ہمعصروں کی مخالفت کے انہیں اور ان کے کام کو قبول عام نصیب ہوا، آج بھی ان کے خوشہ چینوں کی یہ محنت اور فقہ کی جدید تدوین کے لئے یہ کوشش خدا و بندگانِ خدا کے ہاں قبول عام اور خلعت دوام حاصل کرلے اور ملّتِ اسلامیہ کو اس سے بیش از بیش فائدہ ہو وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

غلامِ غلامانِ قرآن
طاہر مکی

فقہ القرآن جلد ششم کتاب الشہادۃ (عورتوں کی شہادت پر تفصیلی بحث) کتاب الدیات۔ عورتوں کی آدھی دیت نہ ہونے پر تفصیلی بحث) کتاب الاجماع
(قیمت پچپن روپے)

فقہ القرآن جلد ہفتم کتاب الوصیۃ والوراثۃ۔ افسانہ فدک۔ یتیم پوتے کی وراثت۔ کتاب الوقف۔
(قیمت پچپن روپے)

ہماری مذہبی جماعتوں کا فکری جائزہ ہماری مذہبی جماعتوں نے اب تک کیا فکری کارنامے انجام دیئے؟ (قیمت بیس روپے)

انہار السکن لمن یطالع اعلاء السنن فقہ حنفی کے مطابق اصول حدیث کی مستند و مفصل کتاب۔ مؤلفہ حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (قیمت بیس روپے)

حقوق و فرائض

اسلام کی بنیادی اور اولین تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان بہترین انسان بننے کی کوشش کرے۔ اس کے تین شعبے ہیں۔ پہلا شعبہ حقوق و فرائض سے متعلق ہے کہ ہر انسان پر انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ حقوق ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے کچھ فرائض ہیں، جنہیں انسان کو مقدور بھر ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی بنیادی ضرورت ہیں۔ دوسری چیز انسان کا ذاتی چال چلن اور کیریکٹر کی خوبی اور بلندی ہے۔ اس کا نام فضائل اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے۔ مثلاً سچ بولنا اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا اخلاقی رذائل میں شمار ہوگا۔

تیسری قسم اعمال کو عمدہ اور اچھے طریقہ سے ادا کرنا ہے۔ اس کو آداب کہتے ہیں مثلاً اٹھنے بیٹھنے ملنے جلنے، کھانے پینے کے طریقے۔ ان تین چیزوں کے بغیر کوئی انسان اچھا انسان نہیں بن سکتا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مسلمانوں کو اچھا انسان بنانے ہی کی کوشش فرمائی تھی جسے دیکھ کر لوگ جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے اس باب میں ہم حقوق و فرائض سے بحث

کر رہے ہیں۔

حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۔ (۲/۲۹)

ترجمہ [زمین میں جتنی چیزیں ہیں اللہ نے تمہارے فائدہ کے لئے پیدا کی ہیں۔]

لہٰذا انسان کو دنیا کی ہر چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے ایک گونہ لگاؤ ہونا چاہیئے۔ اور اس لگاؤ کا یہ تقاضا ہے کہ انسان انکی حفاظت اور نشو ونما کی کوشش کرے۔ تاکہ ان سے وہ نفع حاصل کیا جائے جن کے لئے اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اور انہیں وہیں صرف کیا جائے جہاں صرف کرنے کا حق تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اور انہیں ان تمام مضرتوں سے بچایا جائے جن سے ان کی افادیت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ انسان کی اسی ذمہ داری کا نام حق ہے جسے ادا کرنا ضروری ہے۔ سورۂ ذاریات میں ہے۔

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ○ (۵۱/۱۹)

ترجمہ [اور ان کے مالوں میں ضرورتمند اور محروم لوگوں کا حق ہے۔]

سورۂ المعارج میں ہے۔

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ○ لِلسَّائِلِ وَ الْمَحْرُومِ ○ (۷۰/۲۴-۲۵)

ترجمہ [اور وہ لوگ جن کے مالوں میں حق مقرر ہے ضرورتمندوں اور محروموں کا۔]

اور سورۂ روم میں ہے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۚ (۳۰/۳۸)

ترجمہ [تو قرابت دار کو اور مسکین و مسافر کو اس کا حق ادا کرو۔]

نیز سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۚ (۱۷/۲۶)

ترجمہ [اور قرابت دار اور مسکین و مسافر کو اس کا حق ادا کرو۔]

حق تعالیٰ نے جب اپنے کسی بندہ کو دولت و ثروت بخشی ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو دولت و ثروت نہیں ملی، جو حاجتمند اور محروم ہیں نیز جن سے تمہارا کوئی قرابت داری کا تعلق ہے ان کو فراموش نہ کرو اپنی دولت و ثروت میں ان کو بھی شریک کرلو۔ ان میں قرابت داروں کا حق مقدم ہے۔ ایک اور آیت میں حق تعالےٰ نے حق کی نسبت خود مال کی طرف فرمائی ہے۔

سورۂ انعام میں ہے۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ (۶/۱۴۱)

ترجمہ [اور زمین کی پیداوار کا حق اسے کاٹنے کے دن ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو۔]

یعنی اگر حق تعالیٰ نے کوئی قطعۂ زمین تمہارے تصرف میں دیا ہے۔ اس میں تم نے کھیتی کی ہے یا باغ لگایا ہے۔ کھیتی پروان چڑھی اور باغ ثمر بار ہوا تو جب کھیتی کے کاٹنے یا باغ کے پھل کو توڑنے کا دن آئے تو خدا کی اس نعمت کا شکر ادا کرو۔ اس نعمت کا شکر یہ نہیں ہے کہ زبان سے کہہ دو کہ اے اللہ تیرا شکر ہے۔ بلکہ اس کا شکر یہ ہے کہ اس کا حق ادا کرو یعنی ضرورت مندوں، مسکینوں، محتاجوں

اور محروموں کو بھی اس پیداوار میں شریک کر لو۔ اور بے موقعہ خرچ کر کے اسے ضائع نہ کرو۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (بخاری کتاب الصوم)

ترجمہ [یعنی تمہارے جوڑے کا (شوہر یا بیوی) کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔]

وَلِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (ایضاً)

ترجمہ [اور تمہارے گھروالوں (بیوی بچوں) کا بھی تم پر حق ہے۔]

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اس کو کھانا کھلائے۔ کپڑے پہنائے اور اس کے چہرہ پر تھپڑ نہ مارے۔

(ابوداؤد کتاب النکاح)

خود قرآن کریم میں ہے۔

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

(۲/۲۳۴)

ترجمہ [اور بچّہ کے باپ پر (دودھ پلانے کے زمانہ میں) عورتوں کا کھانا پینا اور لباس پہنانا ضروری ہے۔]

یہاں ان عورتوں کا ذکر ہو رہا ہے جنہیں طلاق دی جا چکی ہے۔ ان کا مردوں سے زن و شوہر کا تعلق بھی نہیں رہا۔ لیکن وہ بچّہ کو دودھ پلا رہی ہیں تو باوجود طلاق ہو جانے کے محض دودھ پلانے کی وجہ سے ان کا کھانا اور کپڑا ان کے بچّوں کے والد کے ذمہ ہوگا۔ تو جب طلاق دے دینے کے بعد بھی یہ مردوں کے ذمّہ ہے تو نکاح میں ہونے کی صورت

میں تو بدرجۂ اولیٰ ان کا نان و نفقہ اور لباس و سکنیٰ ان کے ذمہ ہوگا ہی۔ اسے دوسری جگہ نہایت جامع لفظوں میں قرآن کریم نے یوں بیان کر دیا ہے کہ۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (۴/۳۴)

ترجمہ [مرد، عورتوں کے معاشی کفیل ہیں۔]

قَوَّام کے ایک معنی عربی میں معاشی منتظم کے ہیں۔ (تاج العروس)

خود قرآن مجید میں بھی ہے کہ۔

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ (۴/۱۲۸)

ترجمہ [خدا اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم یتیموں کی دیکھ بھال اور کفالت انصاف کے ساتھ کرو۔]

ملاحظہ فرمائیے کہ قرآن کریم نے مرد کو عورت کا اسی طرح قَيِّمْ قرار دیا ہے جیسا کہ یتیم کے ولی کو اس کا قَيِّمْ قرار دیا ہے۔ تفصیلی بحث آگے آتی ہے۔

اس معاشی کفالت میں تمام معاشی ذمہ داریاں حتیٰ کہ سامانِ زیبائش و آرائش بھی آجاتے ہیں۔ ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر آدمی پر دوسرے بنی نوعِ انسان کے کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہوتا ہے۔ اس کے ایک ایک عضو کا اس پر حق ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

فَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (بخاری کتاب الصوم)

ترجمہ [تو یقیناً تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے جسم کا بھی تم پر حق

ہے اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے۔ یہ ترجمانی ہے اس قرآنی ارشاد کی جو سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا ○ (۱۷/۳۶)

ترجمہ [اور جس بات کا تمہیں علم نہیں ہے اس کے پیچھے نہ پڑو۔ یقیناً کان، آنکھ اور دل ودماغ ان سب کے متعلق تم سے ضرور سوال ہوگا۔]

لہٰذا تمام اعضاء کے حقوق ہیں جن کو ادا کرنا ضروری ہے۔ ہر آدمی سے آخرت میں اس کے اعضاء کے بارے میں بھی باز پرس ہوگی کہ اس نے ان سے غلط کام تو نہیں لیا اور ان کے حقوق ادا کئے تھے یا نہیں۔ اس تفصیل سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔

حقوق کی وسعت

چونکہ انسان کا تعلق کائنات کی ایک ایک چیز سے ہے خواہ اس کا تعلق آسمان سے ہو یا زمین سے۔

وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ ؕ (۴۵/۱۳)

ترجمہ [خدا نے اپنی طرف سے تو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے تمہارے تابع فرمان (مسخر) بنادیا ہے۔]

لہٰذا انسان کی ذمہ داری بھی کائنات کی ہر چیز سے متعلق ہے۔ جمادات سے بھی متعلق ہے کہ اُنہیں بے موقعہ استعمال نہ کیا جائے۔ نباتات سے بھی کہ ان کو نشو ونما اور تربیت کا موقعہ دیا جائے۔

حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ان کے آرام اور آسائش کا خیال رکھا جائے۔ انسانوں سے بھی کہ ہر ضرورت میں ان کی مدد کی جائے اور ان کے فریضۂ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور پر وہی کام لیا جائے۔

غرضیکہ اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات میں اس طرح تقسیم کر دیا ہے کہ اس کا دائرہ محیط اعظم بن کر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔

انسان کے علاوہ دوسری جاندار اور بے جان چیزوں کے دو حق انسان پر ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لئے وہ پیدا کی گئی ہیں ان سے وہی کام لیا جائے۔ دوسرا یہ کہ ان کے قدرتی نشوو نما، پرورش اور ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے بلکہ ان کے مناسب حالات واسباب پیدا کئے جائیں کہ وہ پھل پھول سکیں اور نشوونما پا سکیں۔ ان کے لئے مناسب غذا، سیرابی اور آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے۔ یہ دونوں حقوق قرآن کریم کی اسی حقیقت کے کہ۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ط (۲/۲۹)

ترجمہ [زمین میں جو کچھ ہے اللہ نے تمہارے لئے (یعنی انسانوں کے لئے) پیدا کیا ہے۔]

صریح نتائج ہیں کہ جب یہ تمام چیزیں ہمارے ہی فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہیں تو ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ان سے وہی کام لیں جن کے لئے وہ بنائی گئی ہیں تاکہ وہ وقت مقررہ تک ہمیں نفع پہنچاتی رہیں۔

لہٰذا ان کی پرورش اور نشوونما کے اسباب کو مہیا کرتے رہنا ضروری قرار دیا ہے۔

اسی لئے شجرکاری کو ثواب کا کام قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ اسے حق تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت دی چنانچہ ارشاد ہے کہ۔

ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ○ (۵۶/۷۲)

ترجمہ [کیا یہ (آگ) کا درخت تم نے پیدا کیا ہے یا ہم اسے پیدا کرنے والے ہیں؟]

حتیٰ کہ کھیتیاں بھی خدا ہی اُگاتا ہے۔

أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ○ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ○ (۵۶/۶۳-۶۴)

ترجمہ [بھلا دیکھو تو جو تم کھیتی کرتے ہو، اسے تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں؟]

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو جو پرندے، جانور اور انسان اس کا پھل کھاتے ہیں اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ○ (۶/۱۳۲)

ترجمہ [اور ہر ایک کے لئے جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں اس کی وجہ سے ان کے درجے بلند ہوتے ہیں اور (اے پیغمبر!) تیرا پروردگار ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔]

اور۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ○ (۱۸/۱۰۷)

ترجمہ [یقیناً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور انہوں نے صلاحیت بخش کام کئے ہوں ان کی میزبانی کے لئے فردوس کے اعلیٰ باغات ہوں گے]

ظاہر ہے کہ غلے اور پھل وغیرہ پیدا کرنا۔ ان کے لئے جدوجہد کرنا پوری مخلوق کے حق میں نہایت ہی صلاحیت بخش کام ہیں۔ اسی وجہ سے پھل دار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسند کیا گیا ہے۔

(فتح الباری شرح صحیح بخاری ج ۵ مطبوعہ مصر)

سورۂ انعام میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنّٰتٍ مَعْرُوشٰتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشٰتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ○ (۶/۱۴۱)

ترجمہ [اللہ ہی تو ہے جس نے باغات پیدا کئے جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے اور کھجوریں اور کھیتیاں جن کے پھل یا ذائقے مختلف ہوتے ہیں اور زیتون اور انار کچھ ملتے جلتے اور کچھ مختلف۔ ان کا پھل کھاؤ جب وہ پھل لائیں اور کاٹنے یا پھل توڑنے کے دن اس کا حق ادا کرو اور اسراف نہ کرو، اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔]

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے باغات اور ان کے درختوں اور کھیتوں کو نعمائے الٰہی میں شمار کیا ہے۔ حق تعالیٰ کی نعمتوں کو ضائع

کر دینا، انہیں برباد کرنا، اُن کی تخریب کرنا مستحسن فعل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا درختوں اور کھیتوں کو ضائع کرنا اور انہیں بلا وجہ کاٹ دینا پسند نہیں فرمایا گیا۔ ہاں ان کا پھل کھائیے۔ ان سے رزق حاصل کیجئے۔ انہیں ضائع نہ کیجئے۔

سورۂ حشر میں ہے۔

فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِي الْاَبْصَارِ ○ (۵۹/۲)

ترجمہ [پس آیا اللہ نے انہیں جدھر سے انہیں گمان تک نہ تھا اور ڈال دیا ان کے دلوں میں رعب کہ وہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے اجاڑنے لگے۔ تو لے بصیرت والو! عبرت حاصل کرو۔]

اس آیت کریمہ میں گھروں کو اجاڑنا اللہ تعالیٰ کا عذاب اور اس کی گرفت قرار دیا گیا ہے اور اہل عقل و بصیرت کے لئے اسے سامان عبرت قرار دیا ہے۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جو نعمائے الٰہی خود انسانوں کے فائدہ کے لئے ہوں انہیں برباد کرنا، ضائع کرنا اور اجاڑنا عذاب الٰہی اور سامان عبرت ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ط (۲/۱۱۴)

ترجمہ [اور ان لوگوں سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ کی مسجدوں

میں اس سے روکیں کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے اور انہیں ویران کرنے کی کوشش کریں۔]

مسجدیں اس لئے ہوتی ہیں کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے لئے صلوٰۃ اور تسبیح و تحمید قائم کی جائے۔ لوگوں کو اس سے روکنا کہ لوگ وہاں اللہ کا نام نہ لے سکیں اور وہ آباد نہ رہ سکیں۔ حق تعالیٰ نے بڑا ظلم قرار دیا ہے۔ کیونکہ مسجدیں جن مقاصد کے لئے بنائی جاتی ہیں ایسے لوگ ان مقاصد کو پورا کرنے میں حارج ہوتے ہیں اور یہ بڑی زیادتی ہے۔ حق تعالیٰ نے جو چیزیں جن مقاصد کے لئے بنائی ہیں انہیں انہی میں استعمال ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی چیز آپ اس کے مقصد میں استعمال نہیں کرتے تو اسی کا نام ظلم ہے۔ کیونکہ ظلم کے لغوی معنے یہی تو ہیں کہ کوئی چیز اپنے محل میں استعمال نہ کی جائے یعنی وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ (چیز کو اپنے مقام و محل میں نہ رکھنا) ایسے ہی باغات، کھیتیاں، درخت اس لئے نہیں ہیں کہ ان کو کاٹ کر ضائع کر دیا جائے اور ان کی منفعت کو ختم کر دیا جائے۔ ہم جس چیز کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ کرتے ہیں وہ ظلم ہی شمار ہوگا۔ ان میں مساجد ہی کی تخصیص نہیں ہے۔ بلا شبہ مساجد کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا شدید ترین جرم ہے لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اور دوسری چیزوں کے ساتھ یہی برتاؤ کرنا معاف ہے اور وہ جرم نہیں ہے۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیلی حکایت میں فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لئے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیلسے کتے کو پانی پلاکر

اس کی جان بچائی تھی اور ایک شخص پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو کسی کمرے میں بند کر دیا اور اسے کھانے پینے کو نہیں دیا حتی کہ وہ بھوکی پیاسی سسک سسک کر مر گئی۔ ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا اس پر اس سے باز پرس ہوئی۔ (صحیح بخاری) اس کی وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حق تعالیٰ نے زمین کی ہر چیز انسانوں کے فائدہ کے لئے پیدا کی ہے۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (۲/۲۹)

لہٰذا جو چیزیں ہمارے ہی فائدہ کے لئے پیدا ہوئی ہیں ان کی حفاظت اور ان کی پرورش ہمارے ذمہ ہے۔ اس کے برخلاف اگر ہم ان کی ایذاء رسانی اور تکلیف دہی کا ارتکاب کریں تو ہم اپنے فرض سے نہ صرف پہلو تہی کرتے ہیں بلکہ بڑی حد تک قساوتِ قلبی کا بھی ارتکاب کرتے ہیں۔ بے زبان اور کمزور جانوروں کو ستانا اور انہیں ایذاء دینا رحم دلی اور مہربانی کی ضد ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۳۹/۲۲)

ترجمہ [تباہی اور بربادی ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل ذکر الٰہی کی طرف سے سخت ہو گئے ہوں، یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔]

اور سورۃ الحدید میں ہے۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (۵۷/۱۶)

ترجمہ [کیا اہل ایمان کے لئے اس کا وقت نہیں آگیا کہ اللہ کے ذکراور اوراس حق کی وجہ سے (جو ان کی طرف) نازل ہوا ہے ان کے دل نرم ہوجائیں اور وہ ان اہل کتاب کی طرح نہ ہو جائیں جن پر اس سے پہلے خدا کی کتابیں نازل ہو چکی تھیں۔ لیکن عرصۂ دراز گذر جانے کی وجہ سے (وہ ان ہدایات سے روگرداں ہوگئے تو) ان کے دل سخت ہو گئے اور بیشتر لوگ ان میں سے فسق وفجور میں مبتلا ہیں۔]

ان اشارات سے واضح ہے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے جس کی تفصیل اپنے اپنے موقعہ پر آئے گی۔

حقوق کی ترتیب

لیکن ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات و ہدایات کو مختصر ترین الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو تورات اور انجیل کی طرح مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا۔ لیکن صرف محبت کرنا کہہ دینا کافی نہیں ہے بلکہ ان چیزوں کی تفصیل بھی کرنا ہوگی جو اس محبت کا تقاضا اور اس کے مظاہر ہیں۔ یہی تفصیل وتکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ۔

"ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لئے بھی وہی کچھ پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔" (صحیحین کتاب الایمان)

اس سے معلوم ہوا کہ جسم وجان اور مال ومتاع کے وہ تمام معاملات

جوانسان اپنے جسم وجان اور اموال واملاک کے لئے پسند کرتا اور خواہش کرتا ہے۔ اسی کی دوسروں کے لئے خواہش کرے اور اسی کو دوسروں کے لئے پسند کرے۔ یہ اصول تورات وانجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں بھی سرفہرست ہے۔ بلکہ اسلام اس سے بھی آگے جاتا ہے اور وہ دوسروں کے مفادات کو اپنے مفادات پر ترجیح دینے کا قائل ہے۔

سورۃ الحشر میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۵۹/۹)

ترجمہ [اور وہ لوگ جو دارالاسلام اور ایمان کو پہلے ہی اختیار کر چکے ہیں، پھر جو لوگ ان کی طرف ہجرت کر کے (بعد میں) آتے ہیں۔ وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ اُنہیں دیا جائے اس کی وجہ سے اپنے سینوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے بلکہ اور اپنے آپ پر اُنہیں ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ خود کتنے ہی فاقہ میں ہوں اور یاد رکھو جو نفسانی لالچ اور حرص سے بچا دیا گیا تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔]

اور۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا

اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا ○ (۷۶/۸-۱۰)

ترجمہ [اور باوجود شدید خواہش اور اشتہاء کے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہم تمہیں محض اللہ کی رضا کی خاطر کھلا رہے ہیں۔ ہم کسی بدلہ کے یا کسی شکریئے کے ارادہ سے ایسا نہیں کر رہے۔ بلکہ ہم تو اپنے پروردگار سے اس دن کی ہولناکی سے ڈرتے ہیں جس دن عام طور پر لوگ ترش رو اور چین بجبین ہوں گے]

لیکن اسلام نے مطلقاً دوسروں سے محبت کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس نے انسانی تعلقات کے ضمن میں ایک ترتیب رکھی ہے جسے ہمیشہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اسلام نے ان فرائض کو تعلقات کی کمی بیشی اور دوری و نزدیکی کی تدریج و ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے۔ مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی، غیروں اور بیگانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز اور قرابت دار کی، عزیزوں میں بھی دور کے قرابت دار کے مقابلہ میں قریبی عزیز کی امداد کی جائے گی مگر یہ ترتیبی امداد بھی حق کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر کوئی عزیز قریبی رشتہ دار باطل پر ہو تو اس کے مقابلہ میں اس غیر اور بیگانہ کی امداد کی جائے گی جو حق پر ہو۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ج (۴/۱۳۵)

ترجمہ [اے پیروانِ دعوت ایمانی! انصاف کے (قیام کے) ذمہ دار بنے رہو۔ اور اللہ کے لئے نگراں اور گواہ رہو، خواہ وہ ذمہ داری اور

شہادت خود تمہارے یا والدین اور اقرباء کے خلاف ہی کیوں نہ پڑے]
اگر محض اس بناء پر کسی کی طرفداری کی جائے کہ وہ آپ کا عزیز و قریب ہے تو اسلام اسے پسند نہیں کرتا، وہ اسے عصبیت جاہلیہ (جاہلانہ تعصب) کے نام سے یاد کرتا ہے۔

اسلام کے سوا تمام دیگر مذاہب میں حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں کی گئی، مہاتما گوتم بدھ کی تعلیمات میں انسان وحیوان، اور پھر انسانوں میں اپنوں بیگانوں کی کوئی تمیز نہیں کی گئی۔ بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی گئی، ہندومت میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل یکساں ہے۔ یہودیت اور عیسائیت میں قرابت داروں میں سے صرف ماں باپ کو اہمیت دی گئی ہے۔

اسلام نے ان مذاہب کے برخلاف ان تعلقات میں ترتیب قائم کی ہے۔ مثلاً سب سے پہلا درجہ ماں کا ہے۔ پھر باپ کا۔ پھر بھائی بہن اور بیوی بچوں کا، پھر دوسرے قرابت داروں کا الاقرب فالاقرب کے مطابق، پھر پڑوسی کا، پھر اہلِ وطن کا، پھر اپنے ملک والوں کا، پھر تمام دوسرے مسلمانوں کا پھر باقی انسانوں کا۔ اس فرق کا ظہور اس طرح ہوگا کہ آپ کے پاس ایک وقت کا کھانا ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، بیوی بچے سب بھوکے ہیں۔ آپ سب کو نہیں کھلا سکتے لہٰذا جو کچھ ہے۔ آپ تھوڑا تھوڑا سب میں تقسیم کر دیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کا پڑوسی بھی بھوکا ہے۔ تو اگر آپ ماں باپ، بھائی بہن اور بیوی بچوں کو بھوکا چھوڑ کر پڑوسی کی مدد کے لئے کھڑے ہو جائیں تو یہ ظلم ہوگا۔ ایک بالکل اجنبی اور غیر آدمی کو وہ

کھانا کھلادیں تو یہ بھی ظلم ہوگا۔ قرآن کریم نے اسی فطری ترتیب کو ان آیات میں پیش کیا ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (۴/۳۶)

ترجمہ [اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور قرابت داروں کے ساتھ، اور یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ اور قریبی ہمسائے کے ساتھ اور اجنبی ہمسایہ کے ساتھ، اور مجلس میں ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے کے ساتھ اور مسافروں کے ساتھ اور جو لوگ تمہارے ہاتھ کے نیچے ہوں (مثلاً غلام، کنیز، ملازم وغیرہ)۔]

نیز سورۃ بقرہ میں ہے۔

قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ○ (۲/۲۱۵)

ترجمہ [اے پیغمبرِ اسلام! کہہ دیجئے کہ جو کچھ تم خرچ کرو مال ودولت میں سے تو اس کے مستحق والدین ہیں، قرابت دار ہیں، یتیم ہیں، مسکین ہیں، مسافر ہیں۔ اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتے ہیں۔]

اور سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ○ (۱۷/۲۶)

ترجمہ [اور قرابت داروں کو ان کا حق ادا کرو۔ نیز مسکین و مسافر کو بھی اور بے موقعہ خرچ کر کے مال کو ضائع نہ کرو۔]

پہلی آیت کے آخر میں یہ بھی بتا دیا کہ جو کچھ تم ان ضرورت مندوں کو دیتے ہو وہ تمہارا کوئی احسان نہیں ہے جس کے وہ ممنون ہوں۔ بلکہ یہ ان کا حق ہے جس کی ادائیگی تمہارا فریضہ ہے۔ لہٰذا احسان خود ان کا ہے کہ تمہاری ایک ذمہ داری اور فریضہ سے وہ سبکدوشی کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

عموماً دیگر مذاہب عالم نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے۔ اسلام میں بھی ماں باپ کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اسلام نے دوسرے قرابت داروں اور حاجت مندوں کو نظر انداز نہیں کیا جبکہ دوسرے مذاہب نے ان سے کوئی اعتنا نہیں کیا۔ لہٰذا اسلامی تعلیمات کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے عنوان ہیں۔

(ہر دو اصناف)

انسانوں کے درمیان باہمی تعلقات کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔ اور اسلام نے ان تمام نوعیتوں کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکا۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے گذشتہ باب میں تفصیل کے ساتھ بتایا ہے۔ اسلام نے ان تمام تعلقات کی باقاعدہ درجہ بندی کر دی ہے۔ اور کس تعلق کو دوسرے تعلقات پر فوقیت اور ترجیح ہے اسے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

لیکن یہ ساری تفصیل حقوق و فرائض کے اعتبار سے ہے۔ جہاں تک ان باہمی تعلقات میں برتری اور افضلیت کا تعلق ہے۔ اس میں اس نے کوئی امتیاز نہیں رکھا۔ اس نے تمام اولادِ آدم کو یکساں قرار دیا ہے اور سب کو لائق تکریم اور مستحق عزت قرار دیا ہے۔

سورۂ اسراء میں ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ○ (۱۷/۷۰)

ترجمہ [اور ہم نے ساری اولادِ آدم کو معزز و مکرم بنا کر پیدا کیا ہے۔ اور اسے خشکی اور تری پر اقتدار بخشا ہے]

کسی رنگ، نسب، قومیت اور وطن کی بنیاد پر کسی کی فضیلت اور برتری کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ حسنِ کردار اور حسنِ عمل اور کیریکٹر کی خوبی کی بنیاد پر کسی کی فضیلت اور برتری کا فیصلہ کیا جائے گا۔ جو عملی اور اخلاقی اعتبار سے جتنا اچھا ہے۔ وہ اتنا ہی افضل، برتر اور اچھا ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ط (۴۹/۱۳)

ترجمہ [تم میں سے جو جتنا تقویٰ شعار (برائیوں سے بچنے والا ہے) ہے وہ اتنا ہی لائق عزت اور قابلِ تکریم ہے۔]

تخلیقی اعتبار سے سب کے سب آدم کی اولاد ہیں اور ان کی پیدائش یکساں طریقہ پر ہوئی ہے۔ نہ کوئی برہما کے منہ سے پیدا ہوا ہے۔ نہ دست و بازو سے، نہ پیٹ سے نہ پیروں سے، نہ کوئی اللہ کا بیٹا ہے نہ کوئی نسل الوہی عظمت کی حامل ہے جیسا کہ یہودیوں کا تصور ہے کہ۔

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ (۵/۱۸) ہم اللہ کے بیٹے ہیں۔

نہ کوئی آلِ رسول ہونے کی بنا پر کسی عظمت کا دعویٰ کر سکتا ہے کیونکہ اصل چیز کردار ہے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے سوال (قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۲/۱۲۴) کے جواب میں ارشاد ہے کہ تمہاری ذرّیت میں سے بھی اگر کوئی ظالم ہوگا تو وہ کسی عظمت کا مستحق نہیں ہے (۲/۱۲۴) اس لئے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت اور برتری حاصل نہیں ہے۔

مرد اور عورت ان میں سرفہرست انسانوں کی دو صنفیں (مرد و عورت) آتی ہیں۔ وہ ان میں بھی خلقی اور پیدائشی اعتبار سے کسی ایک صنف کی برتری اور فضیلت کا قائل نہیں۔ اس کا کہنا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ○ (۲۵/۵۴)

ترجمہ [اللہ ہی تو ہے جس نے پانی سے انسان کی تخلیق (کی ابتدا) فرمائی۔ چنانچہ پھر اس کی خاندانی اور سسرالی رشتہ داریاں بنا دیں اور اے پیغمبر! تیرا پروردگار قدرت والا ہے۔]

اس آیت کریمہ میں یہ بتانے کے بعد کہ عملِ تخلیق کی ابتدا حق تعالیٰ نے پانی سے شروع فرمائی اور یہ عمل تخلیق اپنے ارتقائی مدارج طے کرتا ہوا انسانیت کی منزل تک پہنچ گیا اور اس طرح انسانیت کی منزل تک پہنچ جانے کے بعد اس کے باہمی تعلقات کی دو نوعیتیں بن گئیں سلسلہ حیات کی ابتداء کے متعلق سورۂ انبیاء میں بھی یہی بتایا گیا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (۲۱/۳۰)

ترجمہ [اور ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی عطا فرمائی ہے۔ تو کیا لوگ

اس بات پر یقین نہیں کرتے ۔]

قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں ہے کہ وہ عمل تخلیق کی تمام کڑیاں ترتیب وار بیان کرے ۔ وہ مقصد تبلیغ کے لئے جہاں جس کڑی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اسے بیان کر دیتا ہے ۔ چنانچہ تخلیق انسانی کی دوسری کڑی کا بعض دوسرے مقامات پر تذکرہ فرمایا گیا ہے پانی کے دیر تک جمع رہنے سے کناروں پر مٹی کچھ کھنکھناتی ہوئی اور سڑی ہوئی پائی جاتی ہے ۔ یہ تخلیق کی ایک دوسری کڑی ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے ۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝

(۲۵/۲۶،۲۸،۳۳ ، ۱۵/۲۶ ، ۵۵/۱۴)

ترجمہ [اور ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے پیدا کیا ہے ۔]

اس کھنکھناتی سڑی ہوئی مٹی سے ایک خلیۂ حیات (LIFE CELL) پیدا ہوتا ہے جس میں زندگی کی پہلی نمود ظہور پذیر ہوتی ہے جو آگے چل کر خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے ۔ ایک حصہ (OVUM) یعنی مادہ کا خلیہ ہوتا ہے اور دوسرا (SPERMATAZOON) نر کا خلیہ ہوتا ہے ۔ چنانچہ اس اسٹیج کا بیان قرآن کریم نے ان الفاظ کے ساتھ فرمایا ہے ۔

يَاۤ اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ

(۴/۱ ، ۶/۹۸ ، ۷/۱۸۹ ، ۳۹/۶)

ترجمہ [اے افراد نسل انسانی ! اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو جس نے

تمہیں ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے اور اسی جان سے اس کا جوڑا بھی بنا دیا اور پھر اس جوڑے سے بے شمار مرد اور عورتیں (نر اور مادہ) پیدا کر دیئے۔]

ابتدائی خلیۂ حیات میں نر اور مادہ کی دونوں خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو آگے چل کر خود بخود تقسیم ہو جاتی ہیں۔ نر کا خلیہ الگ اور مادہ کا خلیہ الگ ہو جاتا ہے۔ اور ان دونوں سے نر خلیئے اور مادہ خلیئے بے شمار پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تخلیق انسانی کے متعلق قرآن کریم کا یہ بیان ہے جس کی تائید موجودہ سائنسی تحقیقات سے ہوتی جارہی ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کی رو سے اس تخلیقی عمل میں نہ مادہ کو اولیت حاصل ہے نہ نر کو۔ خلیۂ حیات (LIFE CELL) ایک تھا اور اس میں بیک وقت نر اور مادہ کی دونوں صلاحیتیں موجود تھیں۔ آگے چل کر وہ تقسیم ہو کر نر اور مادہ خلیات میں منقسم ہو گیا۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پہلے نر کا خلیہ پیدا ہوا اور اس سے مادہ کا خلیہ پیدا ہوا تھا اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے مادہ کا خلیہ پیدا ہوا اور اس سے نر کے خلیئے نے اپنا وجود حاصل کیا۔ دونوں ایک ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ اور ایک ساتھ تقسیم ہو کر الگ الگ ہوئے ہیں۔ لہٰذا نہ نر کو مادہ پر کوئی فوقیت اور اولیت حاصل ہے نہ مادہ کو نر پر۔

(دیکھیئے ترجمان القرآن تفسیر سورۂ فاتحہ و سورۂ ج ۲ صفحہ ۵۲۱ از مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، نیز "قرآن اور علم جدید" از ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم۔ شائع کردہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور۔)

عہدی قرابت داری

غرض یہ کہ تخلیق انسانی کی ابتداء نر اور مادہ خلیوں کے وجود سے ہوئی۔ باقی تمام نسبی رشتہ داریاں ان دونوں کے اختلاط کا نتیجہ ہیں اس لئے ہم اس کی تقدیم کے پیش نظر اسی کو مقدم رکھتے ہیں اور ان کا بیان پہلے کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم نے نر و مادہ کے وجود اور باہمی اجتماع کو زَوْجٌ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے (زَوْجٌ کی لغوی بحث فقہ القرآن ص ۴۸۷/۱ میں گزر چکی ہے۔ اسے دوبارہ دیکھ لیں) زَوْجٌ شوہر کو بھی کہتے ہیں اور بیوی کو بھی کہتے ہیں۔ دو چیزیں جو ایک دوسرے کے مطابق یا مقابل ہوں زَوْجَیْنِ کہلاتی ہیں دن اور رات۔ سردی اور گرمی۔ پیروں کے دونوں جوتے، گاڑی کے دونوں پہئے ایک دوسرے کے زَوْجٌ ہوتے ہیں۔ کائنات میں جو چیز اکیلی ہو، نہ اس کا کوئی مقابل ہو نہ کوئی چیز اس کے مطابق ہو فَرْدٌ کہلاتی ہے۔ حتیٰ کہ مسجع اور مقفیٰ عبارت کے دو جملے جو ایک دوسرے کے مطابق ہوں یا شعر کے دونوں مصرعے جو ایک دوسرے کے ہم وزن اور ہم قافیہ ہوں ایک دوسرے کے زوج کہلاتے ہیں۔ دنیا میں زیادہ تر چیزیں زوجین ہیں۔ فرد بہت کم ہیں۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○ (۵۱/۴۹)

ترجمہ [اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کئے ہیں۔ شاید تم غور و فکر کرو۔]

حتیٰ کہ نباتات اور تمام حیوانات میں سب جوڑے جوڑے بنائے گئے ہیں۔

خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ

وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۳۶/۳۶)

ترجمہ [اللہ کی ذات پاک ہے جس نے تمام چیزوں کے جوڑے پیدا کئے

ہیں، زمین جو (درخت اور پودے) اگاتی ہے اور انسانوں کی اپنی

جانوں کے بھی اور ان چیزوں کے بھی جن کا انسانوں کو علم نہیں

ہے]

ہر زوج اپنے مقابل زوج کا نقیض نہیں ہے بلکہ اس کی تکمیل

کرنے والا ہے۔ کوئی چیز تنہا بغیر اپنے زوج کے ارتقار میں حصہ نہیں

لے سکتی۔ اور اس کائنات میں ہر چیز ارتقار پذیر ہے کائنات کسی

ایک مقام پر ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔ اس میں برابر ارتقار ہو رہا

ہے اور ارتقار ہوتا رہے گا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ

سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ

مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ○ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ

مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ

اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ (۳۲/۴-۵)

ترجمہ [اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان

واقع ہے چھ اَدوار (ایام) میں پیدا کیا اور پھر تخت حکومت پر متمکن

ہو گیا۔ تمہارا اس کے سوا نہ کوئی مددگار ہے اور نہ ساتھ دینے والا۔

تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ وہ تمام امور کا آسمان (بلندیوں)

سے زمین (پستیوں) کی طرف انتظام کر رہا ہے پھر ہر امر اس کی طرف

بلند ہوتا جارہا ہے ایک دور (یوم) میں جس کی مقدار تمہاری گنتی سے ہزار ہزار سال بنتی ہے]

اور یہ ارتقاء برابر جاری و ساری ہے حتیٰ کہ۔

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ○ (۵۳/۴۲)

ترجمہ [اور یہ واقعہ ہے کہ آپ کے پروردگار کی طرف اس کا آخری نقطۂ عروج ہے۔]

مرد اور عورت برابر

نر درخت، مادہ درخت سے، نر حیوان مادہ حیوان سے، دن رات سے، سردی گرمی سے، پاؤں کا ایک جوتہ دوسرے جوتہ سے، گاڑی کا ایک پہیا دوسرے پہیئے سے۔ غزل کا ایک مصرعہ دوسرے مصرعہ سے۔ سجع کا ایک فقرہ دوسرے فقرہ سے۔ کمرہ کا ایک کواڑ اپنے جوڑ یعنی دوسرے کواڑ سے افضل اور برتر نہیں ہوتا۔ دونوں مساوی ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ایک دوسرے میں حسن پیدا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مفید اور کارآمد بناتے ہیں۔ اسی طرح مرد اور عورت ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو کارآمد اور مفید بناتے ہیں۔ قدرت کا منشاء یعنی افزائش نسل نہ تنہا مرد سے ہو سکتی ہے نہ تنہا عورت سے ہو سکتی ہے۔ قرآن کریم نے دونوں کو ایک مرتبے پر رکھا ہے۔

قرآن فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ○ (۱۷/۷۰)

ترجمہ [ہم نے اولادِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔ اسے خشکی اور تری پر (اقتدار عطا فرمایا) سوار کیا اور پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی اکثر مخلوقات پہ اسے بڑی فضیلت بخشی ہے]

بنی آدم سے مراد سارے انسان ہیں۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ قرآن کریم نے اڑتیس ۳۸ جگہ بنو اسرائیل اور بنی اسرائیل کا لفظ اور سات جگہ بنی آدم کا لفظ استعمال فرمایا اور دو جگہ حضرت ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی اولاد کے لئے بَنِیْہِ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ ظاہر ہے ان تمام موقعوں پر بنو اسرائیل کے مرد اور عورتیں، آدم کی اولاد کے مرد اور عورتیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور یعقوب علیہما السلام کے بیٹے اور بیٹیاں سب ہی مخاطب ہیں بنی اسرائیل یا بنی آدم ...... یا بنی ابراہیم اور بنی یعقوب کے خطاب کے ساتھ جو احکام آئے ہیں۔ ان کا مطالبہ اگر ان کے مردوں سے ہے تو انکی عورتوں سے بھی ہے۔ ایک موقعہ پر بھی عورتیں ان احکام سے مستثنیٰ اور بری الذمہ نہیں ہیں۔ لہٰذا آیت محولہ بالا میں اولادِ آدم میں جس طرح مرد معزز و مکرم ہیں اسی طرح عورتیں بھی معزز و مکرم ہیں۔ جیسا کہ مرد عورتوں کے لئے باعث زینت ہیں۔ اسی طرح عورتیں بھی مردوں کے لئے باعثِ زینت ہیں۔

لباس کی تمثیل

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط (۲/۱۸۷)

ترجمہ [عورتیں تمہارے لئے لباس ہیں اور تم عورتوں کے لئے لباس ہو]

قرآن کریم نے اس آیت کریمہ میں لباس کی تمثیل سے دو بنیادی حقیقتوں کو بیان کیا ہے۔ اول تو یہ کہ لباس انسان کی بنیادی ضروریات میں شمار ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے جنت کی زندگی کا بیان کرتے ہوئے

آدم سے فرمایا تھا کہ۔

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ○ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ○ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ○ (۲۰/۱۱۷-۱۱۹)

ترجمہ [توہم نے کہا کہ اے آدم یقیناً یہ (ابلیس) تیرا اور تیرے جوڑ کا دشمن ہے۔ تو وہ تمہیں جنت سے نکال نہ دے کہ تو جگر پاش مشقتوں میں پڑجائے بے شک یہاں تجھے یہ نعمتیں حاصل ہیں کہ نہ تو اس میں بھوکا رہتا ہے اور نہ ننگا رہتا ہے۔ اور بے شک نہ تجھے پیاس ستاتی ہے نہ دھوپ]

یہ چار قطعاً بنیادی ضروریات ہیں۔ غذا، لباس، پانی اور سر چھپانے کو سایہ (یعنی مکان) ان کے بغیر انسان کے لئے زندگی گذارنا انتہائی دشوار ہے۔ آج بھی اتنی ترقی کے باوجود انسان کی بنیادی ضروریات یہی ہیں۔ جس معاشرہ میں انسان کو کم سے کم یہ بنیادی ضروریات حاصل نہ ہوسکیں اسے جہنمی معاشرہ ہی کہا جائے گا۔ تو مرد عورت کے لئے لباس ہی کی طرح اس کی بنیادی ضرورت ہے۔ اسی طرح عورت بھی مرد کے لئے اس کی بنیادی ضرورت ہے۔ اگر مرد کو عورت میسر نہ آسکے اور عورت کو مرد میسر نہ آسکے تو اس کی ایک بنیادی ضرورت پوری نہیں ہورہی۔

دوسرے یہ کہ لباس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کے ستر کو یعنی ان اعضاء کو جنہیں دکھانا نہیں چاہیئے مستور رکھے۔ انسان میں خلقی طور پر بعض کمزوریاں ضرور ایسی ہوتی ہیں کہ بعض کام مرد نہیں

کر سکتا اور بعض کام عورتیں نہیں کر سکتیں ۔ یہ خلقی نقائص ہوتے ہیں جن کی وجہ سے کسی کو قابل ملامت قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ وہ کمزوریاں ، کوتاہیاں اور نقائص ہیں ۔ کمالات نہیں ہیں اور فطری طور پر ہر شخص اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور نقائص کو واشگاف کرنا نہیں چاہتا ۔ ان کی پردہ پوشی چاہتا ہے ۔ لہٰذا مرد اپنی صلاحیتوں سے عورت کی کمزوریوں کی اور عورت اپنی اہلیتوں سے مرد کی نااہلیتوں کی پردہ پوشی کر دیتے ہیں ۔ اسی طرح مَردوں کی نوع ، عورتوں کی نوع کی کمزوریوں کی تلافی کر کے ان کی تکمیل (CUMPLIMENT) کر دیتے ہیں ۔ اور عورتوں کی نوع ، مَردوں کی نوع کی بے صلاحیتوں کی تلافی کر کے ان کی تکمیل (COMPLIMENT) کر دیتی ہیں ۔ اس طرح ہر نوع اپنی زوج کے لئے (COMPLIMENTRRY) بن جاتے ہیں ۔ اس اعتبار سے مرد ، عورتوں کا لباس (پردہ پوش) ہے اور عورت مردوں کے لئے لباس (پردہ پوش) ہے ۔ ہر ایک دوسرے کی تکمیل کر دیتا ہے ۔

ایک طبیب کسی مرض کی تشخیص کر کے ایک نسخہ لکھتا ہے ۔ مریض کے مزاج ، طبیعت کے نقص اور مرض کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے نہ وہ اسے بالکل حار اور گرم ادویہ دے سکتا ہے نہ بالکل بارد اور سرد ادویہ ۔ نہ قطعاً خشک ادویہ دے سکتا ہے نہ تر ۔ وہ ایک معتدل اور متوازن نسخہ تحریر کرتا ہے ۔ اس میں کچھ دوائیں خشک مزاج کی ہیں تو کچھ تر مزاج کی ، کچھ سرد ہیں تو کچھ گرم ہیں اور ہر دوا کا اپنا اپنا مقام ہے ۔ اور یہ اعتدال و توازن ہی ہے جو مریض کو تندرست کر سکنے کی صلاحیت

رکھتا ہے۔ اس میں نسخہ کا ہر جزو اپنی اہمیت کا مالک ہے کسی ایک کو بھی آپ غیر ضروری اور غیر اہم نہیں کہہ سکتے۔ آپ کھیت میں بیج بوتے ہیں۔ اس کی نشو ونما اور روئیدگی کے لئے پانی کی تراوٹ مٹی کی یبوست۔ سورج کی حرارت اور چاندنی کی برودت درکار ہے۔ نہ مٹی تنہا اس بیج سے کوئی کونپل نکال سکتی ہے۔ نہ تنہا پانی اس کونپل میں ایک پتہ لگا سکتا ہے۔ نہ سورج کی حرارت اسے نشو ونما دے سکتی ہے۔ نہ چاند کی چاندنی اسے بار آور کر سکتی ہے اس کی نشو ونما میں چاروں چیزوں کا حصّہ ہوتا ہے۔ اس میں ہم کسی ایک چیز کو اعلیٰ اور دوسری چیز کو ادنیٰ نہیں کہہ سکتے۔ مشین کا ایک ایک پرزہ اپنا اپنا مقام رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ مشین کا ایک معمولی سا پیچ بھی خصوصی اہمیّت کا حامل ہوتا ہے۔ مشین کے ایک پرزہ کو آپ افضل اور دوسرے پرزہ کو ادنیٰ نہیں کہہ سکتے۔ سارے پرزے مل کر ہی مشین کی صورت گری کرتے ہیں اور اسے متحرک بناتے ہیں۔ مشین کا ایک پیچ نکال دیجئے۔ پوری مشین کی افادیت ختم ہوجائے گی۔

جو کچھ خارجی دنیا میں ہوتا ہے وہی کچھ انسانی معاشرہ میں بھی ہورہا ہے۔ زندگی کی گاڑی کے دو پہیئے عورت اور مرد ہیں۔ گاڑی ان دونوں پہیؤں کے اشتراک اور تعاون ہی سے چل سکتی ہے۔ آپ ایک پہیئے کو نکال کر الگ رکھدیں اور گاڑی کو چلانا چاہیں تو آپ اسے کبھی بھی نہیں چلا سکتے۔ اس میں ہر پہیہ اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں نہ کوئی پہیہ افضل ہے اور نہ کوئی پہیہ غیر افضل۔

مرد اور عورت بھی زندگی کی گاڑی کے دو پہیئے ہیں۔ ان کی صلاحیتوں اور خصوصیات میں ضرور فرق ہے۔ کچھ خصوصیات مردوں میں ایسی ہیں جو عورتوں میں نہیں ہیں۔ کچھ خصوصیات عورتوں میں ایسی ہیں جو مردوں میں نہیں اور بیشتر خصوصیات دونوں میں مشترک اور مساوی ہیں۔ ان ہی امتیازی خصوصیات کی بنا پر ہر ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہے۔ ایک کام مرد کر سکتا ہے عورت نہیں کر سکتی۔ اس کام میں مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے۔ ایک کام عورت کر سکتی ہے مرد نہیں کر سکتا۔ اس کام کے اعتبار سے عورت کو مرد پر برتری حاصل ہے۔

قرآن کریم نے اسی بات کو یوں کہا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۱۷/۲۱)

ترجمہ [دیکھو، ہم نے کس طرح بعض افراد کو دوسرے بعض افراد پر (بعض معاملات میں) برتری دے رکھی ہے۔]

قرآن کریم نے فضیلت و برتری کے لئے کسی ایک نوع کو مخصوص نہیں کیا۔ چنانچہ اس نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے مردوں کو عورتوں پر یا عورتوں کو مردوں پر برتری دیدی ہے بلکہ اس نے بعض کی بعض پر برتری کا بیان کیا ہے۔ وہ بعض مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ بعض خصوصیات میں مرد برتر ہیں اور بعض خصوصیات میں عورتیں برتر ہیں۔ ان میں سے کسی ایک صنف (مرد یا عورت) کا یہ سمجھ لینا کہ چونکہ مجھ میں فلاں فلاں خصوصیت ہے جو صنف مخالف میں نہیں ہے اس لئے میں اس سے افضل اور برتر ہوں انتہائی غلط بینی ہے۔ ہر صنف کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ مجھ میں ایک ایسی کمی یا کوتاہی

ہے جو صنف مقابل کی رفاقت سے پوری ہو سکتی ہے۔ لہٰذا مجھے اپنی تکمیل کے لئے دوسری صنف کی رفاقت ضروری ہے۔ لہٰذا میں اس سے افضل نہیں بلکہ اپنی تکمیل میں اس کا محتاج ہوں۔

قرآن کریم نے رشتۂ ازدواج کی نسبت فرمایا ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ (۳۰/۲۱)

ترجمہ [اور حق تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے خود تمہارے نفسوں سے تمہارے جوڑے پیدا کر دیئے تاکہ تمہیں ان کی طرف سکون و اطمینان حاصل ہو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی]

اس آیت میں خطاب نوعِ انسانی کو ہے کسی خاص صنف کو نہیں ہے۔ (تفصیل پہلے گذر چکی ہے) فرمایا کہ خود تمہارے نفسوں سے یعنی نہ مردوں سے نہ عورتوں سے بلکہ جرثومۂ حیات سے جو نر اور مادہ دونوں اصناف کا مجموعہ تھا۔ تقسیم کر کے نر کا خلیہ الگ اور مادہ کا خلیہ الگ کر دیا گیا۔ اور دونوں خلیوں کا جوڑ بنا دیا گیا۔ نر خلیہ کا جوڑ مادہ خلیہ اور مادہ خلیئے کا جوڑ نر خلیہ، تاکہ تمہیں (مردوں اور عورتوں دونوں کو) ایک دوسرے سے سکون و اطمینان حاصل ہو سکے۔ اور آپس میں محبت اور رحمت پیدا ہو سکے مودّت کے معنے باہمی کشش اور محبت کے ہیں جو دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دے کہ دونوں ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہوں (اس کا مادّہ وَدٌّ ہے جس کے معنے میخ کے ہوتے ہیں۔ میخ کا کام یہ ہے کہ مثلاً دو لکڑی کے ٹکڑوں

کو جوڑ دے کہ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بن جائیں) رحمت کے معنے ایسی مہربانی اور ربوبیت کے ہیں جیسی رحم مادر میں جنین کو حاصل ہوتی ہے۔ یعنی دونوں ایک دوسرے کے لئے پرورش اور ارتقار کا باعث بن سکیں۔ لہٰذا مردوں کے لئے عورتیں اور عورتوں کے لئے مرد باعث سکون و اطمینان ہونے کے ساتھ ساتھ باہمی اتصال و تقویت اور ربوبیت و ارتقار کا باعث ہوتے ہیں۔

صلاحیتوں میں فرق

جیسا کہ ہم نے بتایا کہ صلاحیتوں کے اعتبار سے مردوں اور عورتوں میں فرق ناگزیر ہے۔ بعض صلاحیتیں مردوں میں زیادہ ہوتی ہیں اور بعض صلاحیتیں عورتوں میں زیادہ ہوتی ہیں۔ کیونکہ دونوں کے وظیفۂ زندگی مختلف ہیں اور اپنے اپنے دائرۂ عمل کے مطابق دونوں کو مختلف صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ وہ عام صلاحیتیں تو مشترک ہوتی ہیں جن کا تعلق انسانی یا حیوانی زندگی سے ہے۔ لیکن بعض صلاحیتوں میں فرق ہونا ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ مردوں کا دائرۂ عمل گھر سے باہر ہے اور عورتوں کا دائرۂ عمل گھر کے اندر ہے۔ عورتوں کو اولاد پیدا کرنا۔ اُنہیں پالنا پوسنا اور پروان چڑھانا اور امور خانہ داری سے نمٹنا ہوتا ہے اور مردوں کو اکتساب رزق کے لئے جدوجہد کرنا، گھر کی اور خاندان کی حفاظت کرنا۔ ضرورت پڑے تو ملک اور قوم کی حفاظت کرنا اور مسلح جدوجہد میں حصہ لینا ہوتا ہے۔ چونکہ مردوں اور عورتوں کا دائرہ کار الگ الگ ہے اس لئے دونوں کی صلاحیتوں میں بھی فرق ہے۔ مردوں کو قوت و صلابت کی ضرورت ہے کیونکہ انہیں جگر پاش محنت و

مشقت سے سابقہ پڑتا ہے اور عورتوں کو نرمی، نزاکت، لچک اور رحم دلی اور شفقت کی زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ انہیں بچوں کی پرورش نگہداشت اور ان کی تیمار داری کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے دونوں کے دائرۂ کار کے مطابق صلاحیتوں میں بھی قدرت نے فرق رکھا ہے۔

مادّی نقطۂ نظر دینی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے تو فضیلت اور برتری کا معیار انسان کا اپنا حسن عمل اور خوبیٔ کردار ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط (۴۹/۱۳)

ترجمہ [یقیناً تم میں معزز ترین اللہ کے نزدیک تم میں متقی ترین افراد ہیں]

لیکن مادّی نقطۂ نظر کے مطابق پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے عزت اور فضیلت کو دولت و ثروت کے پیمانوں سے ناپا جاتا اور سونے چاندی اور بنک بیلنس کے ڈھیروں سے تولا جاتا ہے۔ چونکہ اکتسابِ رزق مردوں کا فریضہ ہوتا ہے۔ وہ کماتے ہیں۔ روپیہ پیسہ لاتے ہیں۔ بیوی بچوں پر خرچ کرتے ہیں۔ عورتوں کو لباسِ فاخرہ اور ہلکے بھاری زیورات سے نوازتے ہیں۔ ان کی روٹی کپڑے کا بندوبست کرتے ہیں۔ لہٰذا سمجھتے ہیں کہ ہم پیسے والے ہیں اس لئے ہم افضل اور برتر ہیں۔ لیکن اسلام اسے قبول نہیں کرتا۔ یہ دنیا دارانہ نقطۂ نظر تو ہے مگر دین کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَھْوٌ وَّ زِیْنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ وَ تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ط کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا ط وَ

فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ○ (۵۷/۲۰)

ترجمہ[دنیوی زندگی محض کھیل، تماشا، زیبائش، باہمی فخر و مباہات اور مال اور اولاد میں دوسروں پر بڑھوتری کا نام ہے. جیسے بارش برسے تو کسانوں کو سرسبزی اور کھیتوں کا نشو و نما عُجب و غرور میں مبتلا کر دے۔ لیکن پھر وہ خشک ہو جائے اور پیلی پڑ جائے پھر چورا چورا ہو جاتے۔ (دنیا میں تو یہ حاصل ہو) اور آخرت میں سخت عذاب سے سابقہ پڑے۔ حالانکہ حق تعالیٰ کی طرف سے مغفرت، اور اللہ کی رضا اصل چیز ہے اور یہ دنیوی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔]

دینی نقطۂ نظر سے عزت و فضیلت کا معیار انسان کا اپنا حُسنِ عمل اور خوبیٔ کردار ہوتی ہے اور یہ مردوں کی جاگیر نہیں ہے یہ مردوں کو بھی حاصل ہو سکتا ہے اور عورتوں کو بھی۔ بلکہ اس میں دونوں کا برابر حصہ ہوتا ہے۔

سورۂ احزاب میں ہے۔

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللّٰهَ كَثِيرًا وَّالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيمًا ○ (۳۳/۳۵)

ترجمہ [یقیناً مطیع و منقاد مرد اور مطیع و منقاد عورتیں۔ ایمان و یقین رکھنے والے مرد اور ایمان و یقین رکھنے والی عورتیں۔ سراپا نیاز و فرماں پذیر مرد اور سراپا نیاز و فرماں پذیر عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں۔ حق تعالیٰ کے حضور گڑگڑانے والے مرد اور گڑگڑانے والی عورتیں۔ صدقہ و خیرات کرنے والے مرد اور صدقہ و خیرات کرنے والی عورتیں۔ روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں۔ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ اللہ کو بکثرت یاد کرنے والے مرد اور بکثرت یاد کرنے والی عورتیں۔ اللہ نے ان سب کے لئے مغفرت اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔]

اس آیت کریمہ میں حُسنِ کردار کے تمام کاموں میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی تذکرہ فرما کر بتادیا گیا ہے کہ حُسنِ عمل کے لحاظ سے نہ مردوں کو عورتوں پر کوئی برتری حاصل ہے نہ عورتوں کو مردوں پر۔ دونوں یکساں طور پر حُسنِ عمل کے ان تمام کاموں میں برابر کے حصّہ دار ہوتے ہیں۔ لہٰذا حُسنِ عمل اور تقویٰ میں جس پر فضیلت اور برتری کا مدار ہے دونوں کا یکساں حصّہ ہے۔

قرآن کریم کا دو ٹوک فیصلہ یہ ہے کہ۔

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ○ (۴/۱۲۴)

ترجمہ [جو بھی صلاحیت بخش کام کرے گا، مرد ہو یا عورت ہو، اور وہ صاحب ایمان ہو تو وہ سب جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔]

مرد یا عورت جو بھی صلاحیت بخش کام کرے گا۔ اس کا پورا پورا اجر اسے ملے گا۔ کسی کا کوئی عمل ضائع نہیں جائے گا۔

لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ

(۳/۱۹۵)

ترجمہ [میں کسی کام کرنے والے کا کوئی عمل ضائع نہیں کرتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو (کیونکہ یہ حقیقت ہے) کہ تم میں سے بعض اپنا وجود دوسرے بعض سے حاصل کرتے ہیں۔]

لہٰذا نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرد کی پسلی سے عورت پیدا ہوئی نہ یہ کہ عورت کے رحم سے مرد پیدا ہوا۔ دراصل مرد اور عورت بنیادی طور پر دونوں ہی ایک (LIFE CELL) سے پیدا ہوئے ہیں۔ کسی کو کسی پر تفوق اور ترجیح نہیں ہے۔ دونوں ایک جرثومۂ حیات کے رہین منت ہیں جس کی اپنی تقسیم سے دونوں الگ الگ جدا ہو کر وجود پذیر ہو گئے۔

عورت اور اسلام

جیسا کہ ہم نے عرض کیا اسلام نے نہ مردوں کو عورتوں پر کسی قسم کی فضیلت و برتری عطا کی ہے۔ اور نہ عورتوں کو مردوں پر کوئی فوقیت بخشی ہے۔ دونوں مساوی حیثیت کے مالک ہیں۔ لیکن انسان نے اس حقیقت کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ ہر ملک اور ہر قوم اور ہر ملت میں عورت ہمیشہ سے مظلوم و مقہور رہی چلی

آتی ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی قوم ایسی ہوئی ہو جس نے اس کی عزت و حرمت کا خیال کیا ہو۔

عورت ہمیشہ مظلوم رہی ہے

زمانۂ ما قبل التاریخ کے متعلق تو نہ ہمیں یقینی طور پر کچھ معلوم ہو سکا ہے، نہ اس زمانہ کے کوائف کے متعلق ہم کچھ اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ لیکن جب سے تاریخی دستاویزات اور تاریخی مواد انسان حاصل کر سکا ہے اس کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ کے ہر دَور میں عورت محض مرد کا ایک کھلونا اور اس کے ہاتھوں میں ایک مرغِ اسیر ہی رہی ہے۔ ہم تک رومی اور یونانی دَور کے کچھ نوشتے پہنچے ہیں۔ انہوں نے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں بڑی ترقی کی تھی جس کی بنیاد پر بڑی بڑی تہذیبیں اور علوم و فنون وجود میں آئے۔ لیکن ان کا کیا حال تھا اور ان کے ہاں عورت کی کیا قدر و قیمت تھی اسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ:۔

"آگ سے جل جانے اور سانپ سے ڈسے جانے کا علاج ممکن ہے لیکن عورت کے زہریلے ڈنگ کا کوئی علاج نہیں۔"

نیڈورا نامی عورت کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ:۔

"وہ تمام دنیوی آفات و مصائب کا سرچشمہ ہے۔"

افلاطون نے بلاشبہ مرد و عورت کی مساوات کا دعویٰ کیا تھا لیکن اس کی ساری تعلیمات کتابوں کی زینت بنی رہیں۔ یونانیوں نے کبھی ان پر عمل نہیں کیا۔

رومی قانون میں خاندان کا سربراہ، باپ ہو یا شوہر اپنے بیوی بچوں پر لامحدود اختیارات رکھتا تھا۔ وہ عورت کو جب چاہے گھر سے

نکال سکتا تھا۔ حتیٰ کہ اسے بیوی کو قتل کر دینے تک کا اختیار تھا۔ عورت کا کام محض خدمت اور چاکری کرنا تھا۔ نہ وہ کسی ذمہ داری کی اہل سمجھی جاتی تھی، نہ کسی معاملہ میں اس پر اعتبار کیا جا سکتا تھا۔ وہ اس لائق نہیں تھی کہ کسی معاملہ میں گواہی دے سکے۔ بعد کے ادوار میں رومیوں نے عورت کو کچھ حقوق دیئے لیکن اس کا درجہ مرد سے فروتر ہی رہا۔

یورپ میں ایک صدی سے کچھ پہلے تک وہ سوسائٹی کی حقیر ترین ہستی تھی۔ وہ مال کی مالک نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے مال و متاع کا مالک شوہر ہوتا تھا۔ لڑکیاں اپنے باپ کی ملکیت ہوتی تھیں وہ جس سے چاہتا ان کی شادی کر دیتا۔ بلکہ وہ اپنی بیٹیوں کو باقاعدہ فروخت کرتے تھے۔ آج بھی عورت کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا اور اسے بوقتِ نکاح گرجا میں عمر بھر شوہر کی اطاعت کا عہد کرنا پڑتا ہے۔

یہودیت کا یہ خیال تھا کہ مرد ہمیشہ نیک سرشت اور نیک کردار ہوتا ہے اور عورت بد طنیت اور مکار۔ نسل انسانی کا پہلا مرد یعنی آدمؑ جنت میں عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ عورت ہی نے اسے ورغلا کر اللہ کی اس سے نافرمانی کرائی اور اسے جنت سے بیک بینی و دو گوش نکلوا کر مصائب و آلام میں گرفتار کر دیا۔ (پیدائش باب۳)

حق تعالیٰ کو یہ بات بڑی ناگوار گذری اور اس کی سزا اسے حمل اور ولادت کی صورت میں دی گئی۔ (گنتی باب۳)

اس کے ساتھ یہودی قانون کے مطابق مرد وارث کی موجودگی

میں عورت وراثت سے محروم ہو جاتی ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا)
عیسائیت نے عورت کی تذلیل و تحقیر میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ اس پہ اضافہ ہی کیا۔ عورت کے متعلق سینٹ طرطولین کے یہ الفاظ ہیں۔

"عورتو! تم نہیں جانتیں کہ تم میں سے ہر ایک حوّا ہے۔ خدا کا فتویٰ جو تمہاری جنس پر تھا وہ اب بھی تم میں موجود ہو تو پھر جرم بھی تم میں موجود ہوگا تم تو شیطان کا دروازہ ہو۔ تم ہی نے آسانی سے خدا کی تصویر یعنی مرد کو ضائع کیا۔"

سینٹ پال اپنے ایک خط میں لکھتا ہے۔

"عورت کو چپ چاپ کمال تابعداری سے سیکھنا چاہیئے اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے یا مرد پر حکم چلائے بلکہ چپ چاپ رہے کیونکہ پہلے آدم بنایا گیا۔ اس کے بعد حوّا۔ اور آدم نے فریب نہیں کھایا بلکہ عورت فریب کھا کر گناہ میں پڑ گئی۔"

(تیمتھس کے نام پولس کا پہلا خط ۲)

ہندو مت کا حال بھی کچھ ایسی قسم کا ہے۔ ہندوستان کے سر آوردہ مقنن منوراج فرماتے ہیں۔

عورت لڑکپن میں اپنے باپ کے اختیار میں رہے جوانی میں شوہر کے اختیار میں اور بیوہ ہونے کے بعد اپنے بیٹوں کے اختیار میں رہے۔ خود مختار ہو کر کبھی نہ رہے۔ (منوسمرتی ۵/۱۴۸)

اور۔

"عورت کے لئے قربانی اور برت کرنا گناہ ہے۔ صرف شوہر کی

خدمت کرنا چاہیئے۔ عورت کو چاہیئے کہ اپنے شوہر کے مرنے کے بعد دوسرے شوہر کا نام بھی نہ لے اور کم خوراکی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن پورے کرے۔" (باب ۵ ۱۵۵-۱۵۷)

اور

"جھوٹ بولنا تو عورتوں کا ذاتی خاصہ ہے۔" (باب ۹ ۱۷)

چانکیہ برہمن جنہوں نے منوجی مہاراج کی منوسمرتی کو حشو و زوائد سے پاک کیا فرماتے ہیں۔

"دریا، مسلح سپاہی، بچے اور سینگ رکھنے والے جانور، بادشاہ اور عورت پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔" (چانک نیتی ۱/۱۵)

ہندوستان میں ستی کا رواج خود اس بات کا شاہد ہے کہ وہاں عورت کی کیا قدر و قیمت تھی۔

یہ تو متمدن ملکوں اور مہذب قوموں کا حال تھا۔ عربوں میں جو صدیوں سے جہالت و بربریت کا شکار چلے آتے تھے۔ جو کچھ حال ہو گا ظاہر ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ان کے یہاں لڑکی کی پیدائش نحوست کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو جاتی تو ماں باپ کے چہروں کا رنگ قرآن مجید کے الفاظ میں سیاہ پڑ جاتا تھا۔ اور وہ سوچ میں پڑ جاتے تھے کہ اس ذلت و رسوائی کی علامت کو برداشت کریں یا اس لعنت کو زندہ زمین میں گاڑ دیں حتیٰ کہ آج بھی لوگوں کے گھروں میں لڑکی پیدا ہونے کی وہ خوشی کہیں نہیں منائی جاتی جو لڑکے کی پیدائش پر منائی جاتی ہے۔

عورت یورپ میں

یورپ کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ آزادیٔ نسواں کا بڑا علم بردار ہے اور یہ خیال عام ہے کہ اس نے عورت کو مرد کے برابر لا کھڑا کیا ہے اور اس نے عورتوں کے حقوق کو بڑی حد تک تسلیم کرلیا ہے۔ لیکن یہ بھی محض خوش فہمی ہی خوش فہمی ہے۔ اس نے بظاہر عورت کو مردوں کے برابر کھڑا کر کے عورت پر کوئی احسان نہیں کیا، بلکہ کیا یہ ہے کہ اس نے عورت کو اس کے بوجھ کو کچھ کم کرنے کے بجائے مردوں کا بوجھ بھی اس کے سر پر لاد دیا ہے۔ وہ اپنے فرائض بھی ادا کرے اور مردوں کے فرائض بھی ادا کرے۔

یورپ کے عظیم مفکر پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پچھلے دنوں ہم نے خالص مادّی پہلو سے اپنی مشکلوں کا حل سوچنے کی جو کوشش بھی کی وہ ناکام رہی اور ہمارے تمام منصوبے تمسخر بن کر رہ گئے۔ ہم سوچتے ہیں کہ ہم نے ایسی مشینیں ایجاد کر کے جن سے ہزاروں آدمیوں کو مشقت سے بچایا جا سکتا ہے ہم نے بڑی عظیم الشان ترقی کی ہے۔ بیشک یہ صحیح ہے، لیکن اس کا یہ ایک عجیب نتیجہ نکلا ہے کہ عورت عزیب آج اتنی محنت کر رہی ہے جتنی اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی مثلاً امریکی عورت ہی کو لیجیئے وہ گھریلو کام کاج کے لئے بیرونی مدد لینے سے محروم ہے۔ اور خود اس کے حالات اُسے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ محض خانہ داری کی دیکھ بھال ہی کے لئے اپنا سارا وقت

دے سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بیچاری دوہری مشقت میں پسی جارہی ہے۔ گھر میں وہ بیوی اور ماں ہے اور باہر وہ کسی دفتر یا کارخانہ میں ملازمہ ہے۔

جنگ کے دنوں میں انگلستان میں عورت کی یہ حیثیت تقریباً ملک گیر تھی۔ حالات کا یہ رخ کسی طرح بھی حوصلہ افزا نہیں کہا جاسکتا۔ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ دنیا میں تنزل کے دَور عام طور پر وہی رہے ہیں جب عورت گھر کی چار دیواری کو چھوڑ کر باہر نکلی ہے۔ قدیم تاریخ میں پانچویں صدی قبل مسیح کا یونان ترقی کی معراج پر پہنچا ہوا تھا۔ لیکن اس دَور میں عورت گھر کی زینت تھی مگر اسکندر کے بعد جس زمانہ میں شہری ریاستیں رو بہ زوال تھیں تو جب بھی ایک ایسی ہی نسوانی تحریک شروع ہوئی تھی جیسی آج ہمارے زمانہ میں پائی جاتی ہے۔"

عورت کا گھر کی چار دیواری کو چھوڑنا عموماً دو وجوہ سے زوال کا سبب بنتا ہے۔ ایک تو یہ کہ زندگی کا بہت بڑا حصّہ معطل ہو جاتا اور اس کے بے شمار مسائل لاینحل رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ ان مسائل کو عورت ہی کا ناخن تدبیر حل کر سکتا تھا۔ لیکن عورت جب مردانہ مسائل میں بھی حِصّہ لینے لگتی ہے تو اس کے گھریلو مسائل لاینحل رہ جاتے ہیں۔ عورت کو انہیں حل کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ وہ بھی انسان ہے۔ اس کی صلاحیتیں لامحدود تو نہیں ہیں کہ وہ اپنے فرائض بخیر وخوبی ادا کرنے کے بعد بھی اس قابل رہ جائے کہ وہ مردوں کے حصہ کے فرائض بھی انجام دے سکے۔ جب وہ بیرونِ خانہ

مسائل کی طرف رجوع کرتی ہے تو اندرونِ خانہ کے مسائل سے اغماض برتنا ہی پڑتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں مردوں کے قوائے عملیہ میں اضمحلال پیدا ہو جانا فطری تقاضا ہے کیونکہ جب کسی کو اپنے مسائل میں سہارا دینے والی کوئی ہستی میسر آجاتی ہے تو اسے یہ خیال نہیں رہتا کہ یہ سارا کام مجھے ہی سرانجام دینا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس میں میرے کام کو بٹانے والا بھی کوئی ہے۔ اور اس یقین کی وجہ سے اس کے قوائے عملیہ کا سست پڑجانا لازمی ہے۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اکتسابِ رزق کی جدوجہد میں جب مرد اور عورت دونوں لگ جاتے ہیں تو اسبابِ معیشت کی فراہمی کی مقدار لامحالہ بڑھ جاتی ہے جس کے نتیجہ میں انسان صرف بنیادی اور اہم ضروریات کی فراہمی تک خود کو محدود نہیں رکھتا بلکہ اسباب طرب و تفریح تک پاؤں پھیلانے لگتا ہے اور طرب و تفریح میں منہمک ہونے کے بعد محنت و مشقت اور جد و جہد کے جذبہ میں فرق آجانا لازمی بات ہے۔ وہ محنتی اور جفاکش نہیں رہتا وہ طاؤس و رباب ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور یہ چیزیں بالآخر پوری قوم کے زوال کا باعث بن جاتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ معاشرہ میں عورت اور مرد کا صحیح مقام اور دونوں کے باہمی تعلق کو متعین کرنے میں نہ تو قدیم تصوّرات کو کوئی کامیابی حاصل ہوئی اور نہ جدید تصوّرات کو۔ دونوں ہی اپنی اپنی عقل کے مطابق ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے اور انہیں حل نہیں کر سکے۔ انسان

میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ خالص عقل کی بنیاد پر اپنے تمام مسائل کو جلد حل کر سکے۔ اس کی عقل و فہم کو مسائل کے صحیح حل تک پہنچانے والی چیز وحی کی روشنی ہے۔ جس طرح آنکھ کا کام دیکھنا ہے لیکن وہ اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتی اسے اپنی صلاحیت کو روبکار لانے کے لئے بیرونی فضا میں روشنی کی ضرورت ہوتی ہے ایسے ہی انسانی عقل و فکر کا کام مسائل کو حل کرنا ہے مگر وہ اپنی صلاحیت سے اس وقت تک کام نہیں لے سکتی جب تک اسے وحی کی روشنی میسّر نہ ہو۔ وہ محض اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر مسائل کو حل کرتی تو ہے لیکن اسے برابر ٹھوکریں کھا کھا کر سبق سیکھنے پڑتے ہیں اور ہزارہا سال میں منزل تک پہنچ پاتی ہے جبکہ وحی کی روشنی اگر اسے میسّر آجائے تو ہزاروں سال کا کام وہ چند دنوں میں انجام دے لیتی ہے۔

عورت اسلامی معاشرہ میں

حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورت کے صحیح مقام کا تعین اسلام اور صرف اسلام نے پیش کیا ہے اس نے دونوں کے دائرہ کار کا الگ الگ تعین کر کے اس مسئلہ کا صحیح حل پیش کیا تھا۔ لیکن خود مسلمان بھی اُن قدیم تصورات کو یکسر نہیں بھلا سکے جو صدیوں سے انسانی برادری میں چلے آرہے تھے۔ چنانچہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صورت حال مسلمانوں کے پورے معاشرہ میں یہی ہے کہ عورت مردوں کی خدمت کے لئے پیدا ہوئی ہے حتیٰ کہ قرآن کریم سے مردوں کی افضلیت و حاکمیت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں۔

کیا مرد عورتوں کے حاکم ہیں؟

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم سے ایسا کوئی استدلال صحیح نہیں ہے۔

سورۂ نساء میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝ (۴/۳۴)

ترجمہ [مرد عورتوں کے سربراہ اور کارفرما ہیں۔ اس لئے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر (خاص خاص باتوں میں) فضیلت دی ہے۔ نیز اس لئے کہ مرد اپنا مال (جو ان کی محنت سے جمع ہوتا ہے، عورتوں پر) خرچ کرتے ہیں۔ جن کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ اطاعت شعار ہوتی ہیں۔ اور اللہ کی حفاظت سے (جو انہیں حاصل ہو جاتی ہے) پوشیدگی اور غیبت میں بھی (شوہروں کے حقوق و مفاد کی) حفاظت کرتی ہیں۔ اور جن بیویوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو، تو (یہ نہیں کرنا چاہیئے کہ فوراً دل برداشتہ ہو کر قطع تعلق کر لو، بلکہ) چاہیئے، اُنہیں (پہلے نرمی و محبت سے) سمجھاؤ، پھر خواب گاہ میں ان سے الگ رہنے لگو۔ اور (اس پر بھی نہ مانیں، تو) انہیں (بغیر نقصان پہنچائے۔ محض بطور تنبیہ کے) مارو۔ پھر اگر وہ تمہارا کہا مان لیں،

تو (سختی سے درگذر رو، اور) ایسا نہ کرو کہ الزام دینے کے لئے راہیں ڈھونڈو (یاد رکھو) اللہ سب سے اوپر اور سب سے زیادہ بڑائی رکھنے والا موجود ہے!

یہ آیت کریمہ ہمارے علماء کے ہاتھ میں بڑا زبردست ہتھیار ہے جس سے وہ مردوں کی حاکمیت کا استدلال کیا کرتے ہیں۔ آیت مذکورہ بالا کا ترجمہ ہم نے خود نہیں کیا بلکہ طبقۂ علماء کے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمے (صفحہ ۳۴/۱) سے نقل کیا ہے۔

اس آیت کریمہ پر اپنا تشریحی نوٹ دیتے ہوئے مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ۔

نزول قرآن سے پہلے دنیا کا عالمگیر اعتقاد یہ تھا کہ وجود انسانی کا کامل ظہور صرف مردوں ہی کی جنس میں ہوا ہے۔ عورتوں کی ہستی کوئی مستقل ہستی نہیں رکھتی۔ وہ صرف اس لئے بنائی گئی ہیں کہ مردوں کی کامجوئیوں کا ذریعہ ہوں اور ان کی چاکری اور پرستاری میں فنا ہو جائیں۔

قرآن تاریخ عالم کی سب سے زیادہ پرانی آواز ہے جو اس اعتقاد کے خلاف بلند ہوئی۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے نوع انسانی کو مرد اور عورت دو جنسوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی ہستی، اپنے اپنے فرائض، اور اپنے اپنے اعمال رکھتی ہیں۔ کارخانۂ معیشت کے لئے جس طرح ایک جنس کی ضرورت تھی۔ ٹھیک اسی طرح دوسری جنس کی بھی ضرورت تھی۔ انسان کی معاشرتی زندگی کے لئے دو مساوی عنصر ہیں جو اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ایک

دوسرے کے ساتھ مل کر ایک مکمل زندگی پیدا کر دیں۔

البتہ اللہ نے دنیا میں ہر گروہ کو دوسرے گروہ پر خاص خاص باتوں میں مزیت دی ہے، اور ایسی ہی مزیت مردوں کو بھی عورتوں پر ہے۔ مرد عورتوں کی ضروریاتِ معیشت کے قیام کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے سربراہی و کارفرمائی کا کام قدرتی طور پر انہی کے لئے ہو گیا (۳۸)

عورتیں اس خیال سے دل گیر نہ ہوں کہ وہ مرد نہ ہوئیں اور مردوں کے کام ان کے حصے میں نہ آئے۔ وہ یقین کریں ان کے لئے بھی عمل و فضیلت کی ساری راہیں کھلی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ نیک عورتیں وہ ہیں جو اطاعت شعار ہوتی ہیں اور ظاہر و باطن ہر حال میں شوہروں کے مفاد کی حفاظت کرتی ہیں۔ اگر ایک عورت شوہر کے حقوق کی رعایت نہ کرے اور اطاعت شعاری کے دائرہ سے باہر ہو جائے تو شوہر کو چاہیئے، اسے سمجھانے اور نرمی و سختی سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے۔

اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ اندیشہ ہو، شوہر اور بیوی میں تفرقہ پڑ جائے گا تو پھر چاہیئے کہ خاندان کی پنچایت بٹھائی جائے پنچائت کی صورت یہ ہو کہ ایک آدمی مرد کے گھرانے سے لیا جائے ایک عورت کے۔ دونوں مل کر اصلاحِ حال کی کوشش کریں۔ الخ

(ترجمان القرآن ص ۳۳۹ - ۳۴۰ ج ۱ مطبوعہ جید پریس دہلی۔ پہلا ایڈیشن)

قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ

اس آیت کریمہ میں بنیادی لفظ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ ہے جس کے معنے ہمارے مفسرین و مترجمین نے حاکم اور داروغہ کے کر دیئے

ہیں۔ حالانکہ لغت کے اعتبار سے قَوَّامٌ کے معنے حاکم یا داروغہ کے نہیں ہیں بلکہ معاشی کفیل کے ہیں۔ تاج العروس میں ہے۔ قَامَ الرَّجُلُ الْمَرْأَةَ وَقَامَ عَلَيْهَا کے معنے ہیں مرد نے عورت کی کفالت کی اس کی ضروریات کو پورا کیا۔ اور ان کا ذمہ دار ہوا۔ اس کے لئے سامانِ رسد لایا۔ قَوَّامٌ سامانِ رزق مہیا کرنے والا۔ کیونکہ رزق سے معاشرتی زندگی کا توازن قائم رہتا ہے۔ لہٰذا اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کے معنے ہیں کہ مرد عورتوں کے اخراجات پورے کرنے والے ہیں۔ یعنی تقسیم کار کی رو سے مردوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل ہوں۔ کیونکہ انہیں بچوں کی نگہداشت، پرورش اور تربیت میں مصروف رہنا پڑتا ہے اور وہ اکتساب رزق کے جھمیلوں کے لئے وقت نہیں نکال سکتیں لہٰذا قرآن کریم نے عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت کا بار مردوں کے کاندھوں پر ڈال دیا ہے۔ غالباً اسی لئے مولانا آزاد نے قَوَّامُوْنَ کا ترجمہ "سربراہ اور کارفرما" کے الفاظ سے کیا ہے۔ مرد چونکہ کماتا ہے۔ بیوی بچوں کا کفیل ہوتا ہے۔ پورے گھرانے کا معاشی ذمہ دار ہوتا ہے اس لئے اسے ہی بیرونی معاملات میں (HEAD OF THE FAMILY) خاندان کا سربراہ ہونا چاہیئے اور ہوتا ہے۔ چونکہ وہی کماتا دھماتا ہے اور معاشی اور معیشتی افکار و اعمال میں سرگرداں رہتا ہے اس لئے اسے کارفرما کہنا بھی صحیح ہے۔ لیکن داروغہ اور حاکم کا تصوّر قَوَّامُوْنَ کے لفظ سے پیدا کرنا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے یہ معنے اہل لغت نے نہیں بتائے۔

فضیلت اس کے بعد بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ کا یہ مطلب سمجھ لیا گیا ہے کہ "چونکہ اللہ تعالےٰ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دیدی ہے" حالانکہ قرآن کریم نے بِمَا فَضَّلَھُمْ عَلَیْھِنَّ نہیں فرمایا۔ اگر آیت کا یہی مطلب ہوتا تو اَلرِّجَالُ اور اَلنِّسَآءِ کا لفظ پہلے آچکا ہے۔ اب اسم ظاہر کا موقعہ نہیں تھا بلکہ اسم ضمیر کا موقعہ تھا۔ بِمَا فَضَّلَھُمْ عَلَیْھِنَّ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی صحیح تھا اور مختصر ترین فقرہ تھا۔ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ نے اسے چھوڑ کر بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ کا انداز بیان بلاوجہ اختیار نہیں فرمایا جو (اُس معنیٰ میں) فصاحت و بلاغت کے بھی خلاف ہے اور طوالت آمیز بھی ہے۔ حق تعالیٰ کو یوں فرمانے میں کیا تکلف تھا کہ مرد عورتوں کی ضروریات کے کفیل ہیں اور ہم نے اُنہیں عورتوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اگر اسم ظاہر ہی استعمال فرمانا تھا تو بِمَا فَضَّلَ الرِّجَالَ عَلَی النِّسَآءِ فرما دینا تھا، تاکہ بات اگرچہ فصاحت کے خلاف ہوتی لیکن صاف، واضح اور دو ٹوک ہوجاتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کسی ایک صنف کی برتری دوسری صنف پر نہیں بتا رہے ہیں بلکہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے مردوں میں عورتوں سے زیادہ فضیلت ہوتی ہے جیسا کہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے عورتوں میں مردوں سے زیادہ فضیلت ہوتی ہے۔ اور یہ مشاہدہ ہے کہ فطری طور پر مردوں اور عورتوں کے دائرہ ہائے کار الگ الگ ہیں۔ عورتوں کا کام گھریلو زندگی کی دیکھ بھال، خانگی انتظام و انصرام، اولاد کی پرورش

اور تربیت وغیرہ ہے۔ اور مردوں کا کام باہر کی دنیا میں اکتساب رزق کے لئے جد وجہد اور پُر مشقت کاموں کی انجام دہی ہے اور ہر صنف اپنے دائرہ کار میں دوسری صنف سے برتر ہے۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرد اپنے مفوضہ فرائض کے علاوہ گھر کی دیکھ بھال اور امور خانہ داری کا انتظام وانصرام اور بچّوں کی پرورش وتربیت کے فرائض بھی ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ بچوں کی ماں مرگئی ہے۔ اور یہ فرائض انجام دینے والی گھر میں کوئی عورت نہیں ہے۔ مرد نے اس اندیشہ سے کہ سوتیلی ماں کی وجہ سے بچوں کی زندگی جہنم نہ بن جائے نکاح ثانی نہیں کیا۔ ہمارے معاشرہ میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

اسی طرح بعض عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں اور بکثرت ہوتی ہیں کہ اپنے خانگی فرائض ادا کرنے، بچوں کی غور وپرداخت، پرورش وتربیت کے علاوہ انہیں اکتساب رزق کے لئے باہر کی دنیا میں بھی مصروفِ عمل رہنا پڑتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں ایسی عورتیں بھی بکثرت موجود ہیں جو ملازمتیں کرتی ہیں اور محنت ومشقت کرکے پیسہ کماتی ہیں۔ خود اپنے گھروں میں، سلائی اور کشیدہ کاری اور گھریلو صنعتوں سے اپنا اور اپنے بچوں کا آذوقہ تلاش کرتی ہیں۔ ہماری دیہاتی زندگی میں (اور وہ ہمارے معاشرہ کا کم از کم اسّی فی صد ہے) عورتیں ہل چلاتی ہیں۔ کھیتوں کو پانی دیتی ہیں یا جانوروں اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں ان کی سانی کرتی ہیں۔ ان کا دودھ دوہتی ہیں۔ ان کا گوبر صاف کرتی ہیں۔ ظروف سازی کرتی ہیں۔ بلکہ میں نے تو اپنی آنکھوں سے لوہار کی بھٹی پر جب مرد لوہا گرم

کر کے اسے مختلف شیپ دیتا ہے تو عورتوں ۲۰، ۳۰ دس سیر کے ہتھوڑے چلاتے اور گرم لوہے پر مارتے دیکھا ہے۔ ایسے مرد جو اپنے فرائض کے ساتھ عورتوں کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں ہزار عورتوں پر بھاری ہیں اور ایسی عورتیں جو اپنے مفوضہ فرائض کی انجام دہی کے ساتھ مردوں کے فرائض بھی انجام دیتی ہیں ہزار مردوں پر بھاری ہیں۔ ایسے مرد عورتوں سے اور ایسی عورتیں مردوں سے یقیناً افضل ہیں۔ اور قرآن کریم کا مقصد بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کے اچھوتے انداز بیان سے ایسی ہی مثالوں کا بیان ہے۔

انفاق اموال اس کے بعد تیسرا فقرہ وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ کا آیا ہے۔ یعنی یہ اس وجہ سے ہے کہ وہی تو اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ اس فقرہ سے مردوں کی معاشی ذمہ داری کی وجہ بتا دی گئی ہے۔ یعنی مردوں کو بیوی بچوں کا معاشی کفیل اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہی کماتے دھماتے ہیں۔ اکتساب رزق کے لئے جد و جہد کرتے ہیں۔ بیوی بچوں کی ضروریات کے لئے مال خرچ کرتے ہیں۔ اور اسی قانون کے ماتحت کارخانۂ حیات چل رہا ہے۔ کارگہِ حیات میں یہ مردوں ہی کا فریضہ ہے کہ وہ اکتسابِ رزق کی جد و جہد میں محنت و مشقت کریں۔ اسی وجہ سے ہم نے مردوں کو قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (عورتوں کے معاشی کفیل) بنایا ہے۔ ورنہ مردوں اور عورتوں میں حقوق و فرائض کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲/۲۲۸)

ترجمہ [اور عورتوں کے لئے ایسے ہی حقوق ہیں جیسا کہ دستور کے مطابق ان کے ذمے فرائض (یعنی مردوں کے حقوق ہیں)]

لہٰذا حقوق اور فرائض کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔

لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ

سورۂ بقرہ کی اسی آیت میں وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ آگیا ہے۔ (اور مردوں کو عورتوں پر یک گونہ برتری ہے) یہ فقرہ ہمارے علماء کے ہاتھ میں عورتوں کی منقصت ثابت کرنے کے لئے دوسرا بڑا ہتھیار ہے۔ ہمارے مفسرین نے اسی فقرہ کو اپنے سیاق و سباق سے کاٹ کر ایک مستقل حکم کی حیثیت سے پیش کر کے مردوں کی عورتوں پر برتری کے ثبوت میں پیش کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ فقرہ اپنے سیاق و سباق سے الگ نہیں ہے۔

پوری آیت کریمہ اس طرح ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۲/۲۲۸)

ترجمہ [اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو وہ اپنے نفسوں کے ساتھ تین ماہواری ایام تک انتظار کریں گی۔ اور ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ جو کچھ اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہو اسے چھپائیں۔ اگر وہ اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہوں۔ اور ان کے

شوہر اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ وہ اُنہی کو واپس کر دی جائیں بشرطیکہ دونوں کی نیت اس میں اصلاح کی ہو۔ اور عورتوں کے (مردوں پر) ایسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے حقوق ہیں۔ اور مردوں کو عورتوں پر یک گونہ برتری ہے۔ اور اللہ غلبہ اور حکمت والا ہے۔]

اس آیت کریمہ میں جیساکہ ظاہر ہے، طلاق اور عدت کے احکام بیان ہو رہے ہیں۔ ابتداء میں یہ بتایا گیا ہے کہ طلاق کی صورت میں عورتوں کو عدت گذارنی ہوگی۔ یعنی وہ تین ماہواری ایام تک انتظار کریں گی اور کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکیں گی۔ (حالانکہ مردوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ مرد اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد دوسرے ہی منٹ میں کسی دوسری عورت سے نکاح کر سکتا ہے) اگلے فقرہ میں اس کی وجہ بتادی گئی ہے کہ عورتوں پر یہ پابندی کیوں ہے۔ یہ پابندی اس لئے ہے کہ نسب کی پیچیدگیاں پیدا نہ ہوں جس سے اور نئی نئی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا اگر عورتیں اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لئے قطعاً جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے حمل یا حیض کو چھپائیں۔ اگر وہ حمل سے ہیں اور اُنہیں ماہواری ایام نہیں آرہے ہیں تو وہ اسے ظاہر کر دیں۔ اور اگر وہ حاملہ نہیں ہیں اور ماہواری ایام آرہے ہیں تو اسے بھی ظاہر کر دیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اگر انہیں حمل ہے تو اس سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ اسی شوہر کا ہوگا۔ (کتاب العدۃ جلد دوم فقہ القرآن میں ہم اس پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں اسے دوبارہ دیکھ

لیں) اس کے بعد طلاق ہی کے تعلق سے قرآن کریم نے یہ بات بتادی ہے کہ طلاق دینے کے بعد ہر عورت (اسے کسی طرح بھی طلاق دی گئی ہو بجز خلع کی بالعوض طلاق کے) کے لئے یہی بہتر اور مناسب ہے کہ اگر اصلاح حال ہوسکے تو مطلقہ عورتوں کو اپنے شوہروں ہی کی طرف واپس کر دیا جائے۔ کیونکہ عورتوں کی فطری شرم وحیا کا تقاضا ہے کہ انہیں نئے نئے مردوں کی آغوش میں جانے سے روکا جائے۔ لہٰذا عورت کے رشتہ داروں کو اس خیال سے کہ شوہر نے ہماری بچی کو طلاق دے کر ہمارے خاندان کی توہین کر دی ہے۔ اپنے شوہر کی طرف لوٹ جانے سے رکاوٹ نہیں بننی چاہیئے۔ چونکہ گزشتہ آیات میں یہ بتایا گیا تھا کہ معاہدۂ نکاح ختم ہو جانے (طلاق) کی صورت میں عورتوں کو تین مہینے تک انتظار کرنے کی (عدت گذارنے کی) پابندی ہے جبکہ مردوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے جو مساواتِ انسانی کے تصور کے خلاف ہے۔ اس لئے اگلے فقرہ میں اس خیال کی تردید کر دی گئی ہے۔ کہ یہ بات عدم مساوات کا ثبوت نہیں ہے۔ عورتوں کے بھی ایسے ہی حقوق ہیں جیسے ان کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں۔ چونکہ اس انتظار کی پابندی سے عورتوں کی کمتر حیثیت کا ثبوت دیا جا سکتا تھا اس لئے قرآن کریم نے عورتوں کے حقوق ہی سے بات کی ابتداء کی ہے۔ ورنہ حقوق کی یکسانیت کا بیان یوں بھی کیا جا سکتا تھا کہ وَلَهُمْ مِثْلُ مَا عَلَيْهِمْ (اور مردوں کے عورتوں پر بھی ایسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں پر عورتوں کے حقوق ہوتے ہیں) لیکن قرآن کریم نے عورتوں کے حقوق پر (وَلَهُنَّ) پہلے

زور دینا اس لئے ضروری سمجھا کہ پچھلے فقروں سے عورتوں کی کمتری اور مردوں کی برتری کا ثبوت مہیا کیا جا سکتا تھا اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ وہ ان ذرا ذرا سی باتوں کا بھی لحاظ رکھتا ہے اس کے بعد قرآن کریم نے بتا دیا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ برتری وہی ہے جو اوپر بیان کر دی گئی ہے کہ عورتیں طلاق کی صورت میں تین ماہواری ایام تک انتظار کرتی ہیں اور مرد انتظار نہیں کرتے۔ کیونکہ عورتوں کے ارحام میں حمل بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ان پر انتظار کی پابندی نہ لگائی جائے تو نسب کے خلط ملط ہونے کا اندیشہ ہے۔ پیدا ہونے والا بچہ کس شوہر کا شمار ہوگا؟ وہ کس سے وراثت پائے گا؟ اس کی پرورش اور نگہداشت کے لئے اخراجات کا کون سا شوہر ذمہ دار اور کفیل ہوگا؟ بڑا ہونے کے بعد وہ کس کا بیٹا کہلائے گا اور کون اس کا باپ ہوگا جو خود اس کا وارث ہو سکے؟ یہ شدید قسم کی پیچیدگیاں ہیں جن کی وجہ سے عورتوں پر یہ پابندی لگانی ضروری ہے۔ مردوں کو پابند نہ کرنے سے اس طرح کی کوئی پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوں گی اس لئے ان پر پابندی بھی عائد نہیں کی گئی۔ یہ ہے وہ درجہ جس کا تذکرہ اس آیت میں ہے۔

عام طور پر گھروں کے معاملات کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق بیرون خانہ سے ہوتا ہے اور کچھ معاملات اندرون خانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ گھریلو معاملات صرف گھر کے اندر ہی نہیں ہوتے گھریلو معاملات جو گھر سے باہر ہوتے ہیں ان کو نمٹانا اور ان کو حل کرنا مردوں کا کام ہے۔ کیونکہ عورتوں کا دائرہ کار عموماً گھر ہوتا ہے لہٰذا وہ گھر

کے اندرونی معاملات کی ذمہ دار ہونی چاہئیں اور گھر کے باہر جو معاملات ہوتے ہیں ان کو سلجھانا مرد کی ذمہ داری ہے۔ مولانا آزاد نے اس آیت کا ترجمہ یوں فرمایا ہے کہ :-

" مرد عورتوں کے سربراہ اور کارفرما ہیں۔ اس لئے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ نیز اس لئے کہ مرد اپنا مال جو ان کی محنت سے جمع ہوتا ہے۔ عورتوں پر خرچ کرتے ہیں "

سربراہ اور کارفرما قَوَّامُوْنَ کا ترجمہ ایک حد تک قابل قبول ہو سکتا ہے۔ مگر حاکم اور داروغہ کا ترجمہ تو قَوَّامُوْنَ کے مفہوم کو ادا ہی نہیں کرتا۔ بہرحال گھر سے باہر کے جو معاملات ہوں ان میں سربراہ مرد کو ہونا چاہیئے اور مرد ہی سربراہ ہوتے بھی ہیں لیکن گھر کے اندرونی معاملات کی ذمہ داری خواتین کی ہوتی ہے۔ لہٰذا گھر کے اندرونی معاملات میں سربراہ خاتون خانہ کو ہونا چاہیئے اور وہی ہوتی ہے۔

خود سورۂ نساء ہی میں آگے چل کر حق تعالیٰ نے قَوَّامُوْنَ کے معنے کی تفسیر فرمادی ہے جہاں فرمایا ہے۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۚ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۚ (۴/۱۲۷)

ترجمہ [اے پیغمبر! لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب

کرتے ہیں (یعنی حکم دریافت کرتے ہیں) تم کہہ دو، اللہ تمہیں ان کے بارے میں حکم دیتا ہے (جواب بیان کیا جائے گا) نیز وہ تمہیں یتیم عورتوں کی نسبت حکم دیتا ہے جو تمہیں قرآن میں سنایا جارہا ہے۔ (اور پہلے نازل ہو چکا ہے کہ ان کے ساتھ ناانصافی نہ کرو)۔ وہ یتیم عورتیں (جو تمہاری سرپرستی میں ہوتی ہیں، اور) جنہیں تم ان کا حق (جو وراثت میں) ان کے لئے ٹھہرایا جاچکا ہے، نہیں دیتے اور چاہتے ہو کہ (ان کے مال پر قابض ہونے کے لئے خود) ان سے نکاح کر لو۔ نیز جو کچھ بے بس (یتیم لڑکوں) کی نسبت قرآن میں سنایا جارہا ہے (اور پہلے نازل ہو چکا ہے) تو اس بارے میں بھی اللہ تمہیں حکم دیتا ہے (کہ ان کے حقوق تلف نہ کرو) اور نیز وہ حکم دیتا ہے کہ یتیموں کے معاملہ میں (خواہ وہ لڑکیاں ہوں خواہ لڑکے ہوں اور تمہاری سرپرستی میں ہوں یا نہ ہوں، ہر حال میں حق وانصاف کے ساتھ ان کی خبر گیری کرتے رہو۔]

اس آیت کریمہ میں اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ کے معنے یہی ہیں کہ انصاف کے ساتھ ان کی خبر گیری کرو۔ ان کی معاشی کفالت کرو، ان کی حفاظت وصیانت کا فریضہ انجام دو۔ لہٰذا معاشی ذمہ داری چونکہ مرد (یعنی شوہر) کی ذمہ داری ہے اسی طرح بیرونی معاملات کو سلجھانا بھی اسی کا فریضہ ہوگا۔ اسے خاندان کا سرپرست (HEAD OF THE FAMILY) ہونا چاہیئے اور عورت گھر کے اندرونی معاملات کی ذمہ دار ہے۔ لہٰذا اس کو سربراہ خانہ ہونا چاہیئے۔ اس تقسیم عمل سے تمام کام بہ سہولت انجام پائیں گے۔

نشوز کا خوف

اس آیت کریمہ کا فقرہ وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَھُنَّ ہمارے دور کے علماء و فقہاء کے ہاتھوں میں ایک زبردست ہتھیار کی حیثیت رکھتا ہے جس سے وہ مردوں کے جابرانہ اقتدار کا ثبوت لاتے ہیں۔ نشوز کی بحث ہم "فقہ القرآن" جلد دوم کے باب الطلاق کے شروع میں کر چکے ہیں۔ اسے دیکھ لینا چاہیئے۔ مختصراً یہ کہ ہم نے وہاں بتایا تھا کہ شوہر اور بیوی کے درمیان نزاع و شقاق کی وجوہ عام طور پر خانگی ضروریات، مثلاً کھانے پینے اوڑھنے پہننے کے معاملات نہیں ہوا کرتے۔ ان معاملات کی اتنی اہمیت کبھی بھی نہیں ہوتی کہ نوبت قطع تعلق کی پہنچ جائے۔ میاں بیوی کے درمیان ناچاقی اور مخالفت کی وجہ عام طور پر جنسی بے توجہی اور بے رغبتی ہوا کرتی ہے۔ عورتوں کو اپنے شوہروں کی نسبت اور شوہروں کو اپنی بیویوں کی نسبت جب یہ بداعتمادی پیدا ہو جائے کہ شوہر یا بیوی کو میری طرف رغبت نہیں ہے۔ اسے دوسری عورتوں یا دوسرے مردوں کی طرف رغبت ہے۔ اس کی آنکھ کہیں لڑی ہوئی ہے تو یہ بات دونوں کے لئے قابل برداشت نہیں ہوا کرتی۔

نُشُوۡزٌ کے معنے اپنے آپ کو برتر سمجھنا اور دوسرے کو اپنے قابل نہ سمجھنا ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام ابوبکر جصاص رازی نے فرمایا ہے کہ نشوز کے اصل معنے شوہر پر اپنی تعلّی، ترفع اور بلند مرتبہ ہونے کا مظاہرہ ہے یہ نَشَزَ الْاَرْضُ سے ماخوذ ہے جو زمین کی اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔ (احکام القرآن ص ۲۳۲ مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصر)

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس کے معنے، مخالفت پر اتر آنا، نافرمانی

کرنے لگنا، متنفر ہو جانا، جھگڑنا، بدسلوکی کرنا، مقابلہ پکڑا ہو ہو جانا وغیرہ ہو جاتے ہیں۔ (تاج وابن فارس) راغب نے لکھا ہے کہ نشوز کے معنے کسی چیز کا اپنے مقام سے ہٹ جانا ہوتے ہیں (مفردات) لہٰذا ہر نامناسب اور ناملایم رویہ نشوز کے ضمن میں آجاتا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کی بنیاد دہی ہوتی ہے کہ مرد یا عورت اپنے آپ کو فریق ثانی کے مقابلہ میں ارفع و اعلیٰ سمجھتا ہے اور فریق ثانی کو اپنے قابل نہیں سمجھتا اور خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔

سزا کی اجازت

اسلام نے مسیحیت اور دیگر مذاہب کی طرح نکاح کے معاہدہ کو ابدی قرار نہیں دیا ہے کہ اگر شوہر اور بیوی میں موافقت نہ ہو سکے تب بھی ایک کو دوسرے سے کبھی چھٹکارا حاصل ہی نہ ہو سکے۔ اس نے مرد کے لئے طلاق کا اور عورت کے لئے خلع کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ اگرچہ یہ ایک انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے مگر مجبوری کی صورت میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ دروازہ کھلا ہونے کے باوجود گھر کو جہنم بنائے رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اگر اس کے باوجود عورت خلع کے ذریعہ سے طلاق بھی نہیں لیتی اور شوہر کے نکاح میں رہتے ہوئے دوسرے لوگوں سے یارانے گانٹھنے سے باز نہیں آتی۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ بیوی کا دل شوہر سے ملا ہوا نہیں ہے وہ اسے پسند نہیں کرتی لیکن شوہر دولت مند ہے وہ اس کی دولت کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتی یا شوہر میں کچھ دوسری خصوصیات ایسی ہیں جن کی بنا پر وہ اس سے الگ بھی ہونا نہیں چاہتی۔ مثلاً وہ رحم دل ہے۔ نرم مزاج ہے۔ بھولا بھالا

اور سیدھا سادہ ہے۔ وہ اسے بیوقوف بنا سکتی ہے۔ یہ ذہنیت یقیناً قابل برداشت نہیں ہے۔ اس کی اسے سزا ملنی چاہیئے (نشوز کی حقیقت کو ذہن میں رکھیئے) تو پھر عورت کی یہ ایسی زیادتی ہے جس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اول اس عورت کو سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے۔ اگر وہ پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو اسے خواب گاہ میں تنہا چھوڑ دیا جائے۔ اگر یہ علاج بھی کارگر نہ ہو تو اسے معمولی جسمانی سزا دی جا سکتی ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجۃ الوداع کے مشہور خطبے میں اسے مزید واضح فرما دیا ہے۔ یہ خطبہ کافی طویل ہے ہم اس کا صرف وہ حصہ یہاں نقل کرتے ہیں جو موضوع زیر بحث سے متعلق ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

"عورتوں کے بارے میں میری عمدہ وصیت یاد رکھو۔ وہ اپنی جوانی تم پر لٹا کر ادھیڑ ہو جاتی ہیں۔ (حدیث میں عوَانٌ کا لفظ آیا ہے اور عوَانٌ کے معنے ادھیڑ ہوتے ہیں۔ دیکھیئے آیت ۲/۶۸) تمہیں اس صورت میں کہ وہ کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوں اس سے زیادہ کا ان پر کوئی حق نہیں کہ انہیں ان کی خوابگاہوں میں اکیلا چھوڑ دو۔ اور انہیں ایسی جسمانی سزا دو جو زیادہ اذیت رساں نہ ہو۔ تو پھر اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں تو ان پر (زیادتی کی) راہیں تلاش نہ کرو۔ دیکھو، تمہاری بیویوں پر کچھ تمہارے حقوق ہیں۔ اور تمہاری بیویوں کے تم پر حقوق ہیں۔ تو تمہارا حق تمہاری بیویوں پر تو یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر ان آدمیوں کو براجمان نہ ہونے دیں جنہیں

تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھروں میں ایسے آدمیوں کو نہ آنے دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو۔ اور دیکھو، ان کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ ان کے لباس اور کھانے پینے میں حُسن سلوک سے کام لو۔"

اس روایت کو ترمذی نے عمرؓ وابن الاحوص سے اور بخاری و مسلم نے ابن عمرؓ سے بیان کیا ہے۔

(جمع الفوائد۔ کتاب الایمان۔ احکام اللعان و ذکر البیعۃ وغیر ذالک صہ ۱۴/۱ مطبوعہ مطبعہ خیریہ میرٹھ)

اس آیت میں دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ یہاں خطاب میاں بیوی کو نہیں ہے بلکہ جماعت کو ہے۔ خود آیت مذکورہ بالا میں بھی میاں بیوی کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ بلکہ نوع انسان کی دو اصناف یعنی صنف رجال (مرد) اور صنفِ نساء (عورت) کی بات ہو رہی ہے۔ قرآن کریم نے اس آیت کریمہ میں دونوں اصناف کے فرائض بتلائے ہیں۔ مردوں کا کام اکتسابِ رزق اور اکتساب مال اور اس کے بعد اہل خانہ پر اس کو خرچ کرنا ہے اور عورتوں کا کام گھر اور اس کے ساز و سامان کی حفاظت اور گھر کا انتظام خانہ داری کرنا ہے۔ اگر عورتوں کی طرف سے نشوز اور نامناسب رویہ کا اظہار ہو رہا ہو تو انہیں عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے اس کا بیان فرمایا جا رہا ہے۔

لہٰذا گھر کا بڑا بزرگ، خاندان کا سربراہ، حاکم مجاز، باپ، بھائی سب اس خطاب میں آجاتے ہیں کہ وہ اول عورت کو نصیحت

کریں، اسے اس کے سونے کے کمرہ میں تنہا چھوڑ دیں، ان باتوں سے اصلاح نہ ہو تو جسمانی سزا دیں جو اذیت رساں نہ ہو۔ بشرطیکہ معاملہ کھلی بے حیائی اور بے راہ روی کا ہو۔

یہ روش جیسا کہ عورتوں میں ہو سکتی ہے، ایسے ہی مردوں میں بھی ہو سکتی ہے۔ جہاں عورتوں کے متعلق حق تعالیٰ نے یہ احکام دیئے ہیں، وہیں مردوں کے متعلق بھی احکام دیئے ہیں۔ مردوں کو اس نے آزاد نہیں چھوڑا۔

سورۂ نساء ہی میں ارشاد ہے۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ (۴/۱۲۸)

ترجمہ[اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے نشوز اور بے اعتنائی کا اندیشہ ہو تو ان دونوں کے لئے کیا مشکل ہے کہ دونوں آپس میں اچھی طرح صلح کر لیں، اور صلح کر لینا ہی بہتر ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ نفوس انسانی حرص و آز کے شکار ہوتے ہی ہیں۔ لیکن اگر تم حسن سلوک اور تقویٰ اختیار کرو تو یقیناً اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے خوب واقف ہے]

کاروبار حیات کے سلسلہ میں چونکہ مردوں کا زیادہ تر وقت گھروں سے باہر گذرتا ہے۔ اور معاملات کی دنیا میں مردوں کو ہر قماش کے لوگوں سے، مردوں سے بھی اور عورتوں سے بھی واسطہ

پڑتا ہے۔ اس لئے عورتوں کے لئے مردوں کے متعلق شکوک و شبہات کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں جن میں سے اکثر بے محل اور غلط فہمی پر مبنی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس آیت کریمہ میں ایک اصولی بات بیان کردینے کے ساتھ کہ نفوس انسانی حرص و آز کا شکار ہوتے ہی ہیں صلح و صفائی کا حکم دے کر اس نصیحت پر اکتفار کر لیا گیا ہے کہ لوگ اگر حسن سلوک اور تقویٰ اختیار کریں تو یہی بہتر ہے۔ اور حق تعالیٰ خوب خوب واقف ہیں کہ تم کیا کچھ کرتے ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مردوں کو حق تعالیٰ نے چھٹی ہی دیدی ہے کہ وہ جو چاہیں کرلیں انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔

اسی سورۂ نسار میں پہلے آچکا ہے۔

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ (۴/۱۶)

ترجمہ [اور جو بھی تم دونوں میں سے مرد اور عورتیں بے حیائی اور بے راہ روی اختیار کریں تو تم دونوں کو ایذا دو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے درگذر کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والے اور رحم فرمانے والے ہیں۔]

عورتوں کے نشوز کے سلسلہ میں ہم نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خطبۂ حجۃ الوداع کے حوالہ سے بتا دیا تھا کہ عورتوں کو سزا اسی وقت دی جا سکتی ہے جبکہ کھلی بے راہ روی اور بے حیائی تک بات پہنچ جائے۔ اس آیت کریمہ نے واشگاف طریقہ پر بتا دیا ہے کہ بے حیائی اور بے راہ روی کا صدور کسی سے ہو مردوں سے ہو یا عورتوں سے

تو ان کو ایذار دی جانی چاہیئے۔ ایذار دہی میں جسمانی سزا آجاتی ہے۔ لیکن وہ جسمانی سزا مجرموں کے مناسب حال ہونی چاہیئے۔ عورتیں خلقی طور پر کمزور ہوتی ہیں ان کے مناسب حال وہی سزا ہوسکتی ہے جو دردناک نہ ہو۔ مرد قوی ہوتے ہیں ان کے مناسب حال جو سزا ہوگی وہ بہرحال عورتوں کی سزا سے زیادہ ہوگی۔ اس آیت کریمہ نے مردوں اور عورتوں کو دونوں کو ایک ہی درجہ میں رکھا ہے۔ نہ عورتوں کی تخصیص فرمائی ہے نہ مردوں کی۔ جو بھی بے حیائی کا مرتکب ہو اسے ایذار دی جانی چاہیئے۔

واضح رہے کہ بے راہ روی اور بے حیائی سے اس آیت کریمہ اور نشوز والی آیت میں مراد زنا نہیں ہے۔ بلکہ زنا سے کم کم ساری بیحیائیاں اور ساری بے راہ رویاں مراد ہیں۔ خود زنا کا بیان سورۂ النور کی آیت میں آگیا ہے۔ جس کا بیان ہم کتاب الحدود میں کریں گے۔

بہرحال اس پوری تفصیل سے یہ بات ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے نوع انسانی کی دونوں اصناف یعنی مردوں اور عورتوں میں کسی کی فضیلت اور برتری کو ثابت نہیں کیا۔ قرآن کریم کی رو سے دونوں صنفیں یکساں حیثیت کی مالک ہیں اور کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ جیسا کہ مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، ایسے ہی عورتوں کے حقوق بھی مردوں کے ذمہ ہیں۔ جیسا کہ عورتوں کے کچھ فرائض و واجبات ہیں، ایسے ہی مردوں کے بھی فرائض و واجبات ہیں اپنے اپنے فرائض و واجبات کے مطابق حق تعالیٰ نے کچھ صلاحیتیں مردوں میں زیادہ رکھی ہیں اور کچھ صلاحیتیں عورتوں میں زیادہ رکھی ہیں۔ اور

جن صلاحیتوں میں ایک صنف کو دوسری صنف پر فوقیت ہے ان کے اعتبار سے دونوں اصناف میں سے ہر صنف کو اپنی مقابل صنف پر برتری اور فضیلت حاصل ہے۔

وراثت میں عورت کا آدھا حصہ

اس سلسلہ میں عورتوں پر مردوں کی فضیلت ثابت کرنے کے سلسلہ میں بعض لوگ ایک یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے وراثت کے سلسلہ میں فرمایا ہے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۔ (۴-۱۱)

ترجمہ[اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت فرماتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔]

اس حکم سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر رکھا ہے۔ لہٰذا ایک عورت آدھے مرد کے برابر ہوئی۔ یہ کھلی ہوئی فضیلت اور برتری ہے جو حق تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر عطا فرمائی ہے۔ لیکن یہ ایک مغالطہ ہے جو یہ لوگ دیا کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، حق تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کے وظائف حیات مختلف رکھے ہیں۔ اکتساب رزق اور بیوی بچوں کے نان و نفقہ اور دیگر ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری مرد کے کاندھوں پر ڈالی ہے۔ وہ اپنے لئے بھی کماتا ہے اور اپنے بیوی، بچوں، والدین، اور چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے بھی کماتا ہے۔ جبکہ عورتوں کی ذمہ داری اندرون خانہ انتظام خانہ داری، بچوں کی نگہد

پرداخت، ان کی تعلیم و تربیت وغیرہ ہوتی ہے۔ وہ نہ اپنے لئے کماتی ہے نہ اپنے بچوں اور دیگر افرادِ خاندان کے لئے یہی وجہ ہے کہ دیگر مذاہبِ عالم نے وراثت میں عورتوں کا حصہ ہی نہیں رکھا تھا۔ سب سے پہلے اسلام نے وراثت میں عورت کا حصہ رکھا ہے۔ لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا یہ فیصلہ عورتوں کی برتری اور فضیلت کی دلیل ہے نہ کہ مردوں کی۔ قرآن کریم عورتوں کو اس کے باوجود کہ ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، وراثت میں حصہ دلوارہا ہے۔ اور مردوں کو اس کے باوجود کہ وہ ان عورتوں کے نان و نفقہ اور دیگر تمام ضروریات کے کفیل ہیں عورتوں سے صرف دوگنا حصہ دلوا رہا ہے۔ ایک شخص کو آپ دو ہزار روپئے دیتے ہیں اور اس پر اخراجات اور ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ ڈال دیتے ہیں کہ اس کے وہ سارے دو ہزار روپئے یا اس کا بیشتر حصہ خرچ ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف آپ دوسرے آدمی کو پہلے آدمی سے آدھا یعنی ایک ہزار روپئے دیتے ہیں اور اس پر کوئی خرچ کی ذمہ داری نہیں ڈالتے۔ اور اس سے کہتے ہیں کہ تیرے سارے اخراجات پہلے شخص کے ذمے ہیں۔ تیرے بھی اور تیری اولاد کے بھی اور اسی کے ساتھ اس کے اپنے والدین اور چھوٹے بھائی بہنوں کے بھی۔ تیری اپنی ذمہ داری روپیہ پیسہ کے معاملہ میں کچھ نہیں ہے۔ تو اپنا یہ ایک ہزار روپیہ بنک میں جمع کر دے۔ انصاف سے بتائیے کہ نفع میں کون رہا۔ وہ رہا جس نے دو ہزار روپئے لئے تھے یا وہ رہا جس نے ایک ہزار روپئے پائے تھے ظاہر ہے کہ ایک ہزار روپئے پانے والا ہی نفع میں رہا۔ لہٰذا یہ آیت کریمہ

مردوں کے حق میں ہوئی یا عورتوں کے حق میں ؟ اس سے عورتوں کی برتری اور فوقیت ثابت ہوئی کہ کسی خرچ کی ذمہ داری کے بغیر اسے مرد سے آدھا حصہ مل گیا یا مردوں کی برتری ثابت ہوئی کہ انہیں عورتوں سے ڈبل حصہ دے کر ان پر ان کے گھر کے سارے اخراجات کا بوجھ ڈال کر سب کا سب یا اس کا بیشتر حصہ خرچ کرا دیا گیا ؟

بہر حال یہ آیت کریمہ مردوں کی کسی برتری کا ثبوت نہیں ہے۔

شہادت میں دو عورتیں اور ایک مرد

ہماری فقہ کا مشہور مسئلہ ہے کہ شہادت میں عورتوں کی شہادت کافی نہیں ہے۔ اگر کسی معاملہ میں دو مرد گواہ نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتیں شہادت دے سکتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شہادت کے معاملہ میں بھی دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہوتی ہیں۔ ایک عورت کی گواہی ایک مرد کے مقابلہ میں نصف مانی جائے گی۔ اس میں بھی تھوڑی سی غلط فہمی ہے جس کی وجہ سے مردوں کی افضلیت اور برتری کا ثبوت مہیا کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں شہادت کے احکام آٹھ جگہ بیان ہوئے ہیں۔ طلاق[1] کی عدت[2] گذرنے پر جدائی[3] کے لئے یا تجدید نکاح کے لئے۔ لعان[4] ۔ وصیت[5] ۔ اثبات فاحشہ[6] ۔ اموال یتمٰی[7] کی حوالگی ۔ قذف[8] اور قرض[9] کے لئے ان میں لعان اور وصیت کے سلسلہ میں تو انہیں شہادت کے لفظ سے تعبیر فرمانا محض مجاز ہے۔ ورنہ حقیقت میں وہ شہادتیں نہیں ہیں بلکہ قسمیں ہیں۔

(ملاحظہ فرمائیے $\frac{۲۴}{۹-۲}$ اور $\frac{۵}{۱۰۷-۱۰۹}$)

باقی چھ موقعوں پر واقعی شہادتیں ہیں۔

① ان میں ایک تو عورتوں کی عدت گذر جانے پر حکم دیا گیا ہے کہ یا تو عورتوں کو (تجدید نکاح کر کے) روک لو یا ان سے دستور کے مطابق الگ ہو جاؤ۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ (۶۵/۲)

ترجمہ [تو جب وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انہیں دستور کے مطابق (تجدید نکاح کر کے) روک لو یا ان سے دستور کے مطابق الگ ہو جاؤ اور اپنے میں سے دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنا لو اور اللہ کے لئے شہادت کو قائم کرو۔]

اس آیت کریمہ کے علاوہ۔

② سورۂ نساء کی آیت میں عورتوں کی بے حیائی کے ارتکاب پر چار گواہ بنا لینے کا حکم ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء میں ہے۔

وَالّٰتِىْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِى الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۝ (۴/۱۵)

ترجمہ [اور تمہاری عورتوں میں سے جو بےحیائی کی مرتکب ہوں تو ان پر اپنے میں سے چار گواہ بنا لو۔ پھر اگر وہ گواہی دیدیں تو انہیں گھروں میں بند کر دو تا آنکہ انہیں موت آجائے یا اللہ ان

کے لئے کوئی سبیل نکال دے۔]

جس طرح عدت کے گواہوں والی آیت میں عورتوں کی گواہی کی مخالفت نہیں ہے اسی طرح اس آیت میں بھی چار گواہ بنا لینے کا جو حکم دیا گیا ہے تو کوئی ایسا اشارہ نہیں فرمایا گیا کہ یہ چاروں گواہ مرد ہی ہونے ضروری ہیں۔ قرآن کریم کے الفاظ مردوں اور عورتوں دونوں کا احتمال رکھتے ہیں۔ یہ کہنا زیادتی ہوگا کہ قرآن کریم نے مِنْكُمْ کی قید لگا کر جس میں كُمْ جمع مذکر حاضر کی ضمیر ہے مردوں کی تخصیص فرمادی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں عموماً مذکر ہی کے صیغوں سے مردوں اور عورتوں کو دونوں کو خطاب فرمایا گیا ہے۔ ورنہ عورتوں کو تمام مسائل سے سبکدوش کرنا پڑے گا۔

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ

ترجمہ [صلوٰۃ قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔]

جمع مذکر ہی کے صیغے ہیں تو کیا یہ کہہ دیا جائے کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ صرف مردوں پر فرض ہے۔ اور عورتیں اس خطاب میں داخل نہیں ہیں۔ کیونکہ جمع مذکر کے صیغوں ہی سے خطاب فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں آیتوں میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔

(۳) تیسرے یتیموں کے اموال جب ان کے حوالے کئے جائیں تو حکم دیا گیا ہے کہ گواہ بنا لیا کرو۔ سورۂ نساء ہی میں ہے۔

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝ (پ۴)

ترجمہ [تو جب ان کے اموال ان کے حوالہ کرو تو ان پر گواہ بنا لیا کرو۔ اور

اللہ حساب لینے والا کافی ہے۔]

اس حکم میں بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ گواہ مرد بنائے جائیں یا عورتیں گواہ بنائی جائیں۔ اس آیت کریمہ میں صرف شاہد بنا لینے کا حکم دیا گیا ہے اور شاہد یعنی گواہ مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ قرآن کریم کی کسی آیت یا سنت صحیحہ سے یہ بات ثابت نہیں کی جا سکتی کہ عورتیں گواہ بننے کی اہلیت ہی نہیں رکھتیں۔ بلکہ قرآن کریم سے تو صراحت کے ساتھ ایک موقعہ پر عورتوں کے گواہ بننے کی اہلیت کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے (اس پر گفتگو آگے آتی ہے) لیکن گواہ بننے کی صلاحیت سے وہاں بھی انکار نہیں فرمایا گیا۔ بہرحال یہ آیت کریمہ بھی مردوں اور عورتوں، دونوں کے لئے مطلق گواہی کے ثبوت کی شہادت دے رہی ہے۔

④ چوتھے قذف کے سلسلہ میں شہادتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ نور میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۲۴/۴)

ترجمہ [اور جو لوگ پاکدامن عورتوں کو تہمتیں لگاتے ہیں پھر چار گواہ پیش نہیں کر پاتے انہیں اسّی کوڑے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو۔ یہی لوگ تو فاسق ہیں۔]

اس آیت کریمہ میں چار گواہ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے گواہ مرد

بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ اَلَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ
جمع مذکر کا صیغہ ہے۔ لیکن اگر عورتیں تہمت لگائیں تو حد قذف
ان پر بھی جاری کی جاتی ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ میں عورتیں
بھی شامل ہیں۔ لہٰذا اَرْبَعَةِ شُھَدَآءَ میں بھی لازماً عورتیں
بھی شامل ہوں گی اور تمام فقہاء کے نزدیک بالاتفاق ہوتی ہیں۔
آیت کریمہ میں یہاں بھی مطلق حکم ہے۔ اس کے ساتھ کوئی بھی
قید لگی ہوئی نہیں ہے۔

⑤ پانچویں وصیت کے سلسلہ میں شہادت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔
چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَھَادَةُ بَیْنِکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ
الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ اَوْاٰخَرَانِ
مِنْ غَیْرِکُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَاَصَابَتْکُمْ
مُّصِیْبَةُ الْمَوْتِ (۵/۱۰۶)

ترجمہ [اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تمہارے درمیان وصیت کے
وقت شہادت ضروری ہے جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے
اپنے میں سے دو معتبر آدمیوں کی، یا دو اپنے غیروں (غیر مسلموں)
میں سے اگر تم زمین میں سفر کرو اور وہاں تمہیں پہنچنے والی موت
آ پہنچے۔]

اس آیت کریمہ میں بھی مردوں یا عورتوں کی کوئی تخصیص
نہیں فرمائی گئی۔ حالت سفر میں اگر کسی کو موت آنے لگے اور اس
کے پاس وہاں کچھ مال ہو اور وہ اس کے لئے کوئی وصیت کرنا چاہتا

ہو تو دو معتبر آدمی مسلمانوں میں سے اور اگر دو مسلمان نہ ہوں تو کفار ہی میں سے وصیت کے گواہ بنا لینے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمان آدمی مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ عورتوں کو آدمیت سے خارج نہیں کیا جا سکتا نہ اسلام سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی آدمی ہوتی ہیں اور وہ بھی مسلمان ہوتی ہیں۔ حالتِ سفر میں جہاں کافروں کو بھی گواہ بنایا جا سکتا ہے۔ مسلمان عورتوں کو کیوں گواہ نہ بنایا جائے گا۔ بہر حال اس آیت کریمہ میں بھی عورتوں اور مردوں کی کوئی تخصیص یا تقیید نہیں فرمائی گئی اور حکم کو مطلق رکھا گیا ہے۔

(۶) اسی سلسلہ میں اگر مورث کے ورثاء کو یہ شبہ ہو کہ جو دو گواہ وصیت کی گواہی دے رہے ہیں، انہوں نے کوئی خیانت کی ہے تو حکم دیا گیا ہے کہ مورث کے ورثہ میں سے دو آدمی قسمیں کھائیں کہ انہوں نے خیانت کی ہے اور ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ سچی ہے اور ہم ان پر الزام لگانے میں کوئی زیادتی نہیں کر رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ اگرچہ شہادت نہیں ہے بلکہ قسم ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اسے بھی شہادت ہی سے تعبیر فرمایا ہے۔ لیکن آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اس شہادت میں بھی مردوں اور عورتوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اگر کسی کی وارث صرف اس کی بیوی اور بیٹی ہو۔ تو کیا شریعت اسلامی اسے ان قسموں کی اجازت نہیں دے گی اور ان کے مال میں خیانت کا کوئی نوٹس نہیں لیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ دونوں بھی قسمیں کھا کر خیانت

کرنے والوں سے اپنا حق وصول کرنے کا حق رکھتی ہیں۔

⑦ ساتویں شہادت لعان کے سلسلہ میں آتی ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں قسمیں کھا کر تہمت سے براءت اور فریق ثانی کی تکذیب کرتے ہیں۔ شوہر پانچ قسمیں کھاتا ہے کہ میں نے جو تہمت لگائی ہے۔ اس میں میں سچا ہوں اور بیوی پانچ قسمیں کھاتی ہے کہ شوہر نے مجھ پر جو تہمت لگائی ہے۔ اس میں وہ جھوٹا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے سورۂ نور کی آیت ($\frac{24}{6-9}$)) یہ بھی شہادتیں نہیں ہیں بلکہ قسمیں ہیں۔ مگر قرآن کریم نے ان کو بھی شہادتیں ہی کہا ہے۔ یہاں تو واضح طور پر قرآن کریم نے مردوں اور عورتوں دونوں کو ایک ہی درجہ میں رکھا ہے۔ مرد کے لئے بھی پانچ قسمیں ہیں اور عورت کے لئے بھی پانچ ہی قسمیں ہیں۔ ایسا نہیں کیا گیا کہ مرد کو تو قسمیں کھانے کا حق دیا جاتا اور عورتوں کو اس سے محروم رکھا جاتا اور یہ بھی نہیں کیا گیا کہ مردوں سے تو پانچ قسمیں لی جاتیں اور عورتوں سے کہا جاتا کہ وہ دس قسمیں یعنی مردوں سے ڈبل قسمیں کھائیں۔ بلکہ دونوں صنفوں کو مساوات کا درجہ دیا ہے۔

⑧ شہادت کا آٹھواں حکم قرض کے لین دین سے متعلق ہے اور یہی وہ آیت ہے جس سے شہادت کے بارے میں عورتوں کی کمتری بتائی گئی ہے۔ پوری آیت یوں ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيۡنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى فَٱكۡتُبُوهُۚ وَلۡيَكۡتُب بَّيۡنَكُمۡ كَاتِبُۢ بِٱلۡعَدۡلِۚ وَلَا يَأۡبَ كَاتِبٌ أَن يَكۡتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ ٱللَّهُۚ فَلۡيَكۡتُبۡ وَلۡيُمۡلِلِ

الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْئًا ؕ
فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ
اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ
مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ
اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ (۲/۲۸۲)

ترجمہ [اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جب تم آپس میں مدت مقررہ تک قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ اور تمہارے درمیان لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ اور کوئی لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے۔ اللہ نے جیسا اسے سکھایا ہے تو وہ لکھدے اور جس کے ذمہ قرض ہے وہی لکھوائے اور اللہ، اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے اور اس میں سے کچھ بھی کمی نہ کرے (کہ ایک ہزار روپئے لئے ہیں اور نوسو لکھوا دے) تو اگر قرض لینے والا بیوقوف یا کمزور ہو یا وہ لکھوا نہ سکتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھولئے اور اپنے مردوں میں سے اس پر دو گواہ بنا لیا کرو۔ تو اگر دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لو۔ جو گواہ تمہیں پسند ہوں یہ اس لئے کہ اگر ایک عورت کسی الجھن میں پڑ جائے۔ تو دوسری اسے یاد دلا دے۔]

اس آیت کریمہ میں قرض کے لین دین کے سلسلہ میں جہاں یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اگر مدت مقررہ تک کسی سے کچھ قرض کا لین دین کرنا ہو تو اس کو لکھ لینا چاہیئے وہیں یہ بھی ہدایت

فرمائی گئی ہے کہ اس پر معتبر آدمیوں کی گواہی بھی لے لیا کرو۔ دو معتبر مرد گواہ ہونے چاہئیں اور اگر کسی وجہ سے دو مرد گواہ نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالینا چاہئیے اس آیت کریمہ میں واقعی دو عورتوں کو ایک مرد کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے اور ایک عورت کی گواہی ایک مرد کے نصف کے برابر قرار دی گئی ہے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں کے دائرہ ہائے کار کا تعین کر دیا ہے۔ مردوں کا کام بیرون خانہ اکتسابِ رزق کی تگ ودو اور جدوجہد قرار دیا گیا ہے اور عورتوں کا کام اندرون خانہ افزائش نسل، اولاد کی پرورش، غور و پرداخت، ان کی تربیت اور امور خانہ داری کی دیکھ بھال قرار دیا گیا ہے۔ اس کے ذمہ نہ کسی کا نان و نفقہ ہے اور نہ اخراجات زندگی کا حصول ہے۔ یہ کام مردوں کا ہے۔ قرض کا لین دین ظاہر ہے وہی کرے گا جسے نقد رقم کی ضرورت ہوگی۔ عورتوں کو اس کی ضرورت عموماً لاحق نہیں ہوتی۔ اُنہیں تو بیٹھے بٹھائے گھر میں اس کا باپ یا شوہر رقم مہیا کر کے دے دیتا ہے اور وہ اس رقم سے گھر کا سارا نظام چلاتی ہے۔ اس کا باپ یا شوہر خود کما کر لائے یا کسی سے قرض، ادھار لے کر لائے۔ بہر حال قرض کا لین دین عموماً عورت کے دائرۂ کار میں آتا ہی نہیں۔

یہ اصول بالکل فطری ہے کہ آدمی کو اپنے دائرۂ کار ہی میں دلچسپی ہوتی ہے اور اسی میں اس کا ذہن چلتا ہے۔ ایک آرٹس کے

طالب علم سے جو بی۔ اے کی کلاس میں پڑھ رہا ہے آپ یہ توقع قائم نہیں کر سکتے کہ وہ بی۔ ایس سی کے فزکس یا کیمسٹری کا کوئی فارمولا آپ کو سمجھا سکے گا۔ یا ایک بی۔ ایس سی کے اسٹوڈنٹس سے آپ دیوانِ غالب سبقاً سبقاً سمجھنا چاہیں تو یہ توقع محض بے جا ہو گی۔ ایک لا گریجویٹ سے آپ کسی عمارت کا نقشہ نہیں بنوا سکتے۔ اور ایک کوالیفائڈ انجینیر سے آپ قانونی موشگافیوں کی توقع نہیں کر سکتے۔ ہر آدمی کا ذہن اپنے دائرۂ کار ہی میں چلتا ہے اس سے باہر وہ اور ایک جاہل اجڈ برابر ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا عورتوں کا ذہن مالی لین دین اور قرض و ادھار کے معاملات میں ظاہر ہے مردوں کی طرح نہیں چل سکتا۔ جیسا کہ آپ مردوں سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ گھریلو معاملات کو بہتر طور پر حل کر سکیں گے۔ اسی طرح عورتوں سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ بیرونِ خانہ اقتصادی معاملات کو بھی بہتر طور پر سمجھ سکتی، سمجھا سکتی اور حل کر سکتی ہیں۔

عدالتوں کے چکر میں پھنسنا جہاں بال کی کھال نکالی جاتی ہے اور وکیل صاحبان اپنی جرح قدح سے اچھے اچھوں کے اوسان خطا کر دیتے ہیں۔ قرض لین دین کے سلسلہ میں جو عورتوں کے دائرۂ کار سے تعلق بھی نہیں رکھتا ایک عورت کے لئے دردِ سر ہے۔ وہ تفصیلات کے بیان میں الجھ سکتی ہے جس سے پورا مقدمہ ہی خراب ہو سکتا ہے۔ اسی الجھاؤ اور اضطراب (CONFUSION) کو قرآن کریم نے اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى سے تعبیر فرمایا ہے۔ کہ اگر ایک عورت اپنے بیان میں الجھ جائے تو

دوسری عورت اسے یاد دلادے۔ تَضِلَّ کے معنے بھول جانے کے نہیں ہیں جو ہمارے عام مترجمین نے بیان کر دیئے ہیں۔ بلکہ اس کے معنے الجھاؤ اور اضطراب کے ہوتے ہیں۔ اَلضَّلَالَۃُ کے بنیادی معنے، تحیّر، حیرانی، سرگردانی، اضطراب - (PERPLEXED - CONFUSED) کسی چیز کا پوشیدہ اور غائب ہو جانا۔ مختلف چیزوں کا باہم خلط ملط ہو جانا کہ پھر انہیں جدا نہ کیا جا سکے، ہوتے ہیں (تاج العروس) لہٰذا اس کے معنے یہ ہیں کہ واقعہ کے مختلف پہلو خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے عورتیں الجھ سکتی ہیں اور بات کو واضح نہیں کر پاتیں۔ اور واقعہ کے بیان میں الجھاؤ سے پورا مقدمہ خراب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا دو عورتیں ہونی چاہئیں کہ ایک عورت کو کوئی الجھاؤ ہو تو دوسری اسے صاف کر دے۔ یہ عورتوں کا کوئی نقص نہیں ہے بلکہ ان کے طبعی اور خلقی ساخت کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ عورتیں قابل اعتماد نہیں ہوتیں۔ ان کی بات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ خود مردوں کے متعلق بھی قرآن کریم نے دوؔ کی شہادت ضروری قرار دی ہے۔ ایک آدمی کی شہادت پر کوئی عدالت فیصلہ صادر نہیں کرتی۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ایک مرد قابل اعتماد اور لائق اعتبار نہیں ہوتا؟ ہر مرد خواہ ایک ہو یا دو ہوں قابل اعتبار ہے۔ لیکن عدالت اپنا فیصلہ اسی وقت صادر کر سکتی ہے جبکہ اسے پوری طرح یہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ واقعہ اسی طرح ہے جیسا کہ بیان کیا جا رہا ہے۔ تہمت کے سلسلہ میں قرآن کریم نے چار شاہد طلب کرنے کا حکم دیا ہے تو کیا دوؔ اور تین مرد قابل

اعتبار نہیں ہوتے؟ علاوہ ازیں لعان کے سلسلہ میں قرآن کریم نے مرد اور عورت دونوں کے لئے چار چار شہادتیں ضروری قرار دی ہیں اور مردوں اور عورتوں میں کوئی امتیاز نہیں رکھا۔ اس نے مردوں سے چار اور عورتوں سے بھی چار شہادتوں کا مطالبہ فرمایا ہے۔ یہاں اس نے عورتوں سے آٹھ شہادتوں کا مطالبہ نہیں فرمایا۔

بہرحال صرف ایک آیت جو قرض کے لین دین سے متعلق ہے صرف اسی میں مردوں اور عورتوں کی شہادت کے نصاب میں قرآن کریم نے فرق کیا ہے کہ دو مرد گواہی دیں اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ باقی تمام آیات میں جو شہادت ہی سے متعلق ہیں اس نے کوئی فرق نہیں کیا۔ (آیات ہم بیان کر چکے ہیں)۔

لہٰذا نہ یہ بات قابل فہم ہے کہ عورتوں کی شہادت صرف اموال کے بارہ ہی میں قابل قبول ہو سکتی ہے دیگر معاملات میں قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ دیگر شہادت کی آیات میں عورتوں کی شہادت کا ذکر ہی نہیں فرمایا گیا۔ کیونکہ عدم ذکر کبھی بھی عدم شئے کو مستلزم نہیں ہوا کرتا دوسری آیات شہادت میں خصوصیت سے عورتوں کا ذکر نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ دیگر معاملات میں شہادت نہیں دے سکتیں اور نہ یہ بات قابل فہم ہے کہ قرض کے لین دین کے سلسلہ میں چونکہ شہادت کا نصاب بیان کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا ہر موقعہ پر اس نصاب کی پابندی ضروری ہے۔ یعنی ہر موقعہ پر ایک مرد

کے مقابلہ میں دو عورتیں ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اصول فقہ میں یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ قرآن کا کوئی مطلق حکم قرآن ہی کے کسی دوسرے مقید حکم سے مقید نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ کسی ایک ہی واقعہ میں اگر ایک حکم مطلق ہو اور دوسرا مقید ہو تب بھی مطلق کو مقید نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ مطلق حکم اپنے اطلاق پر قائم رہے گا۔ اس اصول کے ماتحت سوائے قرض کے لین دین کی دستاویز کی شہادت کے باقی تمام معاملات میں عورتوں کو بھی مردوں ہی کی طرح شہادت کا حق ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اصول فقہ کی مشہور کتاب نور الانوار میں جو درسِ نظامی میں شامل ہے اس مسئلہ پر امام شافعیؒ کا قول نقل فرمانے کے بعد لکھا ہے کہ۔

"اور ہمارے (یعنی حنفیہ کے) نزدیک مطلق حکم کو مقید حکم پر محمول نہیں کیا جا سکتا اگرچہ دونوں حکم ایک ہی حادثہ میں صادر ہوئے ہوں۔ کیونکہ دونوں حکموں پر عمل کرنا ممکن ہے۔ دونوں کے درمیان نہ کوئی تضاد ہے نہ کوئی تنافی ہے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق ظہار میں کفارہ کے اندر روزے رکھنے اور غلام کو آزاد کرنے میں اس قید کی پابندی ضروری ہوگی کہ دونوں کفارے ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ادا کئے جائیں۔ لیکن ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا کفارہ ہاتھ لگانے سے پہلے بھی ادا کیا جا سکتا ہے اور بعد میں بھی (کیونکہ پہلے دونوں کفاروں میں مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا کی قید لگی ہوئی ہے۔ اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کے حکم کے ساتھ یہ قید نہیں ہے حالانکہ تینوں کفارے ایک ہی واقعہ

یعنی ظہار کے لئے بیان کئے گئے ہیں) اور جب ایک ہی حادثہ میں بھی مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جا سکتا تو جب دو حکم دو حادثوں کے متعلق صادر ہو رہے ہوں اور ان میں ایک مطلق اور دوسرا مقید ہو تو بطریق اولیٰ مطلق کو مقید نہیں کیا جا سکے گا۔ چنانچہ قتل میں ایک مؤمن غلام کو آزاد کرنا ضروری ہوگا (کیونکہ اس کفارہ میں رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ کی قید لگی ہوئی ہے) اور دوسرے کفاروں (مثلاً ظہار اور یمین وغیرہ کے کفاروں میں) صرف غلام کو آزاد کرنا ضروری ہوگا۔ مؤمن ہو یا کافر ہو۔ الخ"

صہ ۱۶۲ مطبوعہ ایچ۔ ایم سعید کمپنی کراچی)

امام شافعیؒ مطلق حکم کو مقید پر محمول کرتے اور مطلق حکم میں بھی اس قید کا اعتبار فرماتے ہیں جو قرآن نے دوسرے معاملہ میں لگائی ہے۔ لیکن فقہائے حنفیہؒ اسے تسلیم نہیں فرماتے۔ دونوں مکتبہ ہائے فکر کی بحثیں اس مسئلہ میں اصول کی تمام کتب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہمارے نزدیک فقہائے حنفیہؒ کا قول اس باب میں زیادہ اطمینان بخش ہے۔ کیونکہ اس سے قرآن کریم کا کامل اتباع ہوتا ہے کہ قرآن کے مطلق حکم کو مطلق رکھا جائے اور مقید حکم کو مقید۔ اپنی طرف سے اس میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ قرآن کریم کا احترام بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ لہٰذا قرض کے لین دین کے معاملہ میں اس حکم کا اتباع لازمی ہونا چاہیئے کہ اس کے لئے دو مرد گواہ ہوں اور دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں لیکن باقی تمام معاملات میں چونکہ قرآن کریم نے ایسی کوئی تفصیل

نہیں دی ہے اس لئے باقی تمام معاملات میں جیسے دو مردوں کی گواہی پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ دو عورتوں کی گواہی پر بھی فیصلہ کیا جانا چاہیئے۔

اس تمہیدی بحث کے بعد ہمارے فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ میں جو بحثیں فرمائی ہیں اب ہم ان کو بیان کرتے ہیں ان حضرات نے پہلے سے اپنے ذہن میں یہ بات طے فرما لی ہے کہ عورتیں شہادت کے معاملہ میں قابل اعتماد نہیں ہو سکتیں کیونکہ وہ ناقصات العقل والدین ہوتی ہیں اور پھر اس مفروضہ کے ماتحت ہی انہوں نے قرآن کریم کی آیات پر غور فرمایا ہے۔ چنانچہ ان کے اذہان میں یہ سوالات پیدا ہوئے کہ تنہا خواتین کی شہادت معتبر ہے یا نہیں؟ اگر معتبر ہے تو کیا تمام معاملات میں یا صرف بعض میں؟ اور یہ کہ ہر معاملہ میں نصاب شہادت کیا ہے؟ یعنی گواہی دینے والی عورتوں کی تعداد کتنی ہونی چاہیئے؟ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خواتین کی شہادت قابل قبول ہونے کے لئے ان کے ساتھ مرد کا ہونا ضروری ہے تو اس وقت بھی بعینہٖ یہی سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ یہ مشترک شہادت کیا ہر قسم کے مسائل میں فیصلہ کن بنیاد بن سکتی ہے یا صرف بعض معدودے چند مسائل ہی کا فیصلہ اس کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

تنہا عورتوں کی گواہی

امت کے تقریباً تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ ایسے مخصوص نسوانی مسائل کے فیصلہ کے لئے تنہا عورتوں کی شہادت کافی ہے جن کا علم عموماً مردوں کو

نہیں ہوتا۔ امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ۔

اَلْوِلَادُ وَعُیُوْبُ النِّسَاءِ مِمَّا لَمْ اَعْلَمْ مُخَالِفًا لَقِیْتُہٗ اَنَّ شَہَادَۃَ النِّسَاءِ فِیْہِ جَائِزَۃٌ لَا رَجُلٌ مَعَہُنَّ۔

(کتاب الام ص۷/۹ ج)

ترجمہ [جن (اہل علم حضرات) سے میری ملاقات ہوئی ان میں کسی کو اس بات کا مخالف نہیں پایا کہ ولادت کے معاملات اور عورتوں کے (لائق ستر مقامات کے) عیوب کے ضمن میں عورتوں کی شہادت مرد کی شرکت کے بغیر جائز ہوتی ہے]

امام زہریؒ کا بیان ہے کہ۔

مَضَتِ السُّنَّۃُ اَنْ تَجُوْزَ شَہَادَۃُ النِّسَاءِ فِیْمَا لَا یَطَّلِعُ عَلَیْہِ غَیْرُہُنَّ۔

ترجمہ [یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ ایسے تمام معاملات میں تنہا عورتوں کی شہادت جائز ہے جن کی اطلاع سوائے ان کے کسی اور کو نہیں ہوتی۔]

(احکام القرآن جصاص ص۵۹۶-۵۹۸ ج۱)

مخصوص نسوانی مسائل کے علاوہ دیگر مسائلِ حیات میں فقہائے احنافؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور ان کے ہم خیال بعض اور فقہاء نے صرف عورتوں کی شہادت قبول نہیں کی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول بھی اسی کی تائید میں ہے۔ لیکن بعض روایات اس کے خلاف بھی ملتی ہے۔ چار خواتین نے حضرت علیؓ کے سامنے شہادت دی کہ فلاں عورت نے فلاں بچہ کو

پیروں سے روند کر ہلاک کر دیا ہے تو آپ نے ان کی شہادت قبول فرمائی۔ ایک دوسرا واقعہ ہند بنت طلق بیان کرتی ہیں کہ ہم چند عورتیں ایک جگہ تھیں۔ وہیں ایک بچہ کپڑے سے ڈھکا ہوا پڑا تھا۔ ایک عورت نے اُدھر سے گذرتے ہوئے اسے پیروں سے روند ڈالا۔ بچہ کی ماں نے دعویٰ کیا کہ فلاں عورت نے میرے بچہ کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس کی گواہی حضرت علیؓ کے سامنے دس عورتوں نے دی جن میں مَیں بھی شامل تھی تو حضرت علیؓ نے اس عورت کے خلاف دیت (خون بہا) کا فیصلہ فرمادیا۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نکاح، طلاق، حدود اور خون کے مقدمات میں عورت کی شہادت کو قبول نہیں فرماتے تھے لیکن ایک دوسری روایت ہے کہ چار عورتوں نے حضرت عمرؓ کے سامنے شہادت دی کہ فلاں شخص نے نشہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دیدی۔ چنانچہ آپ نے بیوی کو شوہر سے جدا کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات نے عورتوں کی گواہی ان معاملات میں قابل قبول قرار دی ہے جن کا علم عورتوں ہی کو ہو سکتا ہے ان کے نزدیک اسی ضمن میں وہ معاملات بھی آجاتے ہیں جن کا علم صرف عورتوں ہی کو ہو کیونکہ وہاں اس حادثہ کے وقت کوئی مرد موجود ہی نہیں تھا۔ مثلاً شادی بیاہ کے ہنگاموں میں مکانات کے اندر اگر کوئی حادثہ ہو جاتا ہے اور وہاں کوئی مرد اس وقت موجود نہیں ہے تو لامحالہ عورتوں کی شہادت کو قبول کرنا پڑے

گا۔ کیونکہ قبول نہ کرنے میں حقوق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں۔

"اگر خواتین بازاروں اور غسل خانوں میں جمع ہوں اور وہاں کوئی حد کے قابل سانحہ پیش آجائے تو ایسی صورت میں حدود سے متعلق ان کی گواہی قبول کی جائے گی۔ بکر بن محمد نے اپنے والد کے حوالہ سے امام احمد بن حنبلؒ سے اس کی صراحتہً روایت کی ہے۔ ابن صدقہ نے ایک صورت نقل کی ہے کہ اگر ایک شخص اپنے رشتہ داروں کو وصیت کرے اور اپنے غلام کو آزاد کردے لیکن اس وقت سوائے عورتوں کے اور کوئی موجود ہی نہ ہو تو کیا اس طرح کے حقوق میں عورتوں کی گواہی قابل قبول ہوگی؟ امام احمدؒ نے فرمایا۔ ہاں۔ حقوق میں ان کی گواہی قابل قبول ہے۔

(الاختیارات العلمیہ المطبوع مع الفتاویٰ صہ ۲۱۲ اور الطرق الحکمیہ فی السیاستہ الشرعیہ صہ ۱۵۷) مطبعہ السنہ المحمدیہ قاہرہ

عطاء ابن ابی رباحؒ کہتے ہیں کہ اگر آٹھ عورتیں کسی عورت کے زانی ہونے کی شہادت دیں تو میں عورت کو رجم کر دوں گا۔

علامہ ابن حزمؒ تو دو عورتوں کو ایک مرد کی حیثیت دینے کے بعد ہر حال میں اور ہر قسم کے حقوق و معاملات میں خواتین کی شہادت معتبر سمجھتے ہیں۔

قاضی شریحؒ کی بھی غالباً یہی رائے تھی۔ ایک گھر کے سازو سامان کے متعلق ان کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ فریقین میاں بیوی تھے۔ شوہر کا دعویٰ تھا کہ مال و اسباب اس کی ملکیت ہے لیکن چار عورتوں

نے گواہی دی کہ یہ بیوی کا ہے۔ بیوی نے اپنے مہر کی رقم شوہر کے حوالہ کی تو اس کے عوض شوہر نے یہ مال واسباب بیوی کو دیدیا تھا۔ قاضی شریح نے عورتوں کے اس متفقہ بیان کے مطابق بیوی کے حق میں اور شوہر کے خلاف فیصلہ دے دیا۔

اسی قسم کی ایک اور روایت آتی ہے کہ انہوں نے مہر کے ایک مقدمہ میں چار خواتین کی گواہی پر شوہر کے خلاف بیوی کے حق میں فیصلہ دیدیا۔ ایاس ابن معاویہ نے طلاق کے سلسلہ میں دو عورتوں کی گواہی قبول کی ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ انہوں نے صرف حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی شہادت پر ایک مکان کے متعلق قضیہ چکا دیا تھا۔

حدود اور قصاص میں عورت کی شہادت قبول کرنے پر صحابہ کا اجماع

نا مناسب نہ ہوگا اگر اس موقعہ پر میں تاریخ اسلام کے ایک اہم واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا چلوں جس کی بنیاد پر چودہ سو سال سے آج تک امت مسلمہ دو مختلف دھڑوں میں بٹی چلی آرہی ہے۔ مسلمانوں کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ حضرت عثمان ابن عفان ذوالنورین خلیفۂ سوم رضی اللہ عنہ کے خلاف مصر، بصرہ اور کوفہ کے تین ہزار باغیوں نے شورش برپا کی اور خلیفۂ مظلوم کو شہید کر دیا۔ وہ اپنے بالاخانے میں جمعہ کے دن تلاوتِ قرآن کریم میں مصروف تھے۔ جو صحابہ اور جاں نثار خدام مکان کے نچلے حصہ میں آپ کی حفاظت کے لئے موجود

تھے ان سب کو آپ نے واپس کر دیا تھا۔ طبری کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ نے شہادت سے پہلے تمام صحابہؓ کو اپنے اپنے گھروں میں واپس جانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

یا اھل المدینة انی استودعکم اللہ واسئالہ ان یحسن علیکم الخلافة من بعدی .... واقسم علیکم ان ترجعوا فرجعوا (طبری صـ ٤١٦ ج ٣)

ترجمہ [اے اہل مدینہ میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں اور اس سے دعا کرتا ہوں کہ میرے بعد امر خلافت کو تم پر خوبی کے ساتھ قائم رکھے .... اور میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ تم لوٹ جاؤ۔ چنانچہ وہ لوٹ گئے۔]

یہاں تک کہ گھر میں صرف آپؓ اور آپ کی زوجۂ محترمہ حضرت نائلہؓ (امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کی ہمشیرہ) ہی موجود تھے اور بوقت شہادت امام مظلوم سیدنا عثمانؓ ان کی زوجۂ محترمہ سیدہ نائلہؓ کی مدافعت ہی اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ گھر میں سوائے ان محترمہ کے اور کوئی موجود ہی نہ تھا اور پھر دو دن تک لاش کا بے گور و کفن پڑا رہنا اس حقیقت پر مزید روشنی ڈالتا ہے کہ بوقت شہادتِ امام مظلومؓ گھر میں صرف سیدہ نائلہؓ موجود تھیں جنہوں نے مدافعت کرتے ہوئے اپنی انگلیاں کٹوالیں اور بعد از وفاتِ سیدنا ذی النورینؓ گھر میں کوئی موجود نہ تھا جو آپ کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کرتا۔

حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے

کون تھے۔ مکان کی پشت کی طرف پاس کے مکان سے بالا خانہ پر کون پہنچا تھا۔ یہ بیانات کہ محمد ابن ابی بکر چند باغیوں کی معیت میں دیوار پھاند کر سیدنا عثمان رضؓ کے مکان میں داخل ہوا۔ امام مظلوم سیدنا عثمان تلاوت قرآنِ حکیم میں محو و مستغرق تھے۔ یہ مفسد آگے بڑھے اور محمد ابن ابی بکر نے امیر المؤمنین کی ریش مبارک پکڑلی اور اسے زور زور سے کھینچا مگر پیکرِ صبر و رضا امام مظلومؓ نے کسی حمایتی کو آواز دی نہ کوئی واویلا مچایا بلکہ محمد ابن ابی بکر کی طرف دیکھ کر فرمایا ۔

بھتیجے! اگر آج تمہارے والد حضرت صدیق اکبرؓ زندہ ہوتے تو ان کو یہ منظر پسند نہ آتا ۔

(خلفائے راشدین مرتبہ مولانا حاجی معین الدین ندوی ص۱۸۶ اور انسانیت موت کے دروازہ پر ص۹۳)

یہ سن کر محمد ابن ابی بکر پیچھے ہٹا مگر کنانہ ابن بشر نے آگے بڑھ کر امام مظلوم کی پیشانی پر لوہے کی ایک سلاخ سے زبردست ضرب لگائی اور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی اور دوہرے داماد حضرت ذی النورینؓ زمین پر گر پڑے اور عاشق رسول نے گرتے ہوئے فرمایا تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ۔ ابھی آپ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ سودان ابن حمران مرادی نے دوسری ضرب لگائی جس سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ عمرو ابن حمق کو یہ سفاہت ناکافی معلوم ہوئی وہ ظالم آپؓ کے سینہ پر کھڑا ہو گیا اور امام مظلومؓ کے جسم اطہر کو نیزے سے چھیدنے لگا۔ اسی اثناء میں ایک اور شقی القلب

بے رحم نے بڑھ کر تلوار کا وار کیا۔ آپؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہؓ نے اپنے رفیق حیات کو بچانے کے لئے اس بد باطن مفسد کا وار اپنے ہاتھ پر روکا جس سے ان کی تین انگلیاں کٹ کر گر پڑیں لیکن اس تلوار کے وار نے حضرت ذی النورینؓ کی شمع حیات گل کر دی۔

فانا للہ وانا الیہ راجعون

(ابن سعد حصہ اول جزو خامس ص ۲۳۰)

حضرت نائلہؓ کا تنہا بیان

یہ ساری تفصیلات جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کے اندر پیش آئیں کس نے بیان کیں؟ ان کا شاہد کون تھا؟ سوائے ایک حضرت نائلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اس وقوعہ کا دیکھنے والا اور کون تھا؟ اگر کوئی اور بھی تھا تو اس نے مدافعت کر کے اپنی کتنی انگلیاں کٹوائیں؟ سوائے حضرت نائلہؓ کے اور کوئی نہیں تھا۔ لیکن اس کے ردعمل کے طور پر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کیا اقدام فرمایا؟ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اکثر اہل مدینہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا جن میں حضرت اسامہ ابن زید، حضرت زید ابن ثابت، حضرت عبداللہ ابن سلام، حضرت ابو سعید خدری، حضرت نعمان ابن بشیر، حضرت حسان ابن ثابت، حضرت کعب ابن مالک، حضرت رافع ابن خدیج، حضرت محمد ابن مسلمہ، حضرت قدامہ ابن مظعون جیسے جلیل القدر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شامل تھے۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے مجبوراً بیعت فرمائی

مگر اس شرط کے ساتھ کہ قاتلین سیدنا عثمانؓ سے قصاص لیا جائے گا اور جب دو اڑھائی ماہ تک انتظار کرنے کے بعد بھی یہی دیکھا کہ سبائی مفسدین و قاتلین سیدنا عثمانؓ کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں آرہی۔ وہ دھڑلے سے دندناتے پھر رہے ہیں۔ اور بڑے بڑے مناصب پر فائز کئے جارہے ہیں تو ان دونوں بزرگوں کو بھی اپنی بیعت توڑنا پڑی اور انہوں نے امام مظلومؓ کے مطالبۂ قصاص کو مقدم جانا۔

کبارِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ جم غفیر قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کا مطالبہ کر رہا ہے اور یہ مطالبہ اس قدر شدّت اختیار کر جاتا ہے کہ پورا مدینہ ان سبائیوں اور حضرت علیؓ کے خلاف ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ خلیفۂ وقت کو اپنا دارالخلافہ، مدینۃ الرسول کو چھوڑ کر کوفہ کو مقرر کرنا اور وہیں منتقل ہو جانا پڑتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس نازک ترین پوزیشن میں بھی یہ نہیں فرماتے کہ اے رسول اللہ کے صحابیو! کیا تم نہیں جانتے کہ حدود و قصاص میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں ہوتی اور یہاں تو عورتیں بھی نہیں ہیں۔ صرف ایک عورت حضرت نائلہ رضی اللہ عنہا تنہا واقعہ کی چشم دید گواہ ہیں۔ لہٰذا مقدمۂ قتل ثابت نہیں ہوتا۔ صحابۂ کرام کی جماعت کے سامنے دینی معاملات میں جب شریعت کا حکم پیش کیا جاتا تو وہ اس سے سرمو انحراف نہیں کر سکتے تھے۔ ایک طرف تو صحابہ کے جم غفیر کا مطالبۂ قصاص محض ایک عورت کے بیان پر اور دوسری طرف فریق مقابل کی طرف سے کوئی انکار نہیں آتا

بلکہ جواب یہ آتا ہے۔

حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما چند دیگر اصحاب کے ساتھ حضرت علیؓ سے ملے اور کہا کہ ہم نے اقامت حدود کی شرط پر آپ سے بیعت کی ہے اب آپ ان لوگوں سے قصاص لیجیے جو حضرت عثمانؓ کے قتل میں شریک تھے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "بھائیو! جو کچھ آپ جانتے ہیں اس سے میں بھی ناواقف نہیں ہوں مگر ان لوگوں کو کیسے پکڑوں جو اس وقت ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم ان پر۔ کیا آپ حضرات اس کام کی گنجائش کہیں دیکھ رہے ہیں جسے آپ کرنا چاہتے ہیں؟ سب نے کہا نہیں اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا، خدا کی قسم میں بھی وہی خیال رکھتا ہوں جو آپ کا ہے۔ ذرا حالات سکون پر آنے دیجیے تاکہ لوگوں کے حواس برپا ہو جائیں، خیالات کی پراگندگی دور ہو اور حقوق کا حاصل کرنا ممکن ہو جائے۔

(بحوالہ طبری)

نیز یہ بھی دیکھیے۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت مسلم ہو گئی تو حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور دیگر رؤسائے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ان کے پاس گئے اور ان سے حدود قائم کرنے اور قصاص عثمانؓ لینے کا مطالبہ فرمایا۔ موصوف نے یہ عذر فرمایا کہ ان باغیوں کے بہت سے معاون و

مددگار ہیں اور اس وقت انہیں سزا دینا یا قصاص لینا ممکن نہیں ہے۔ اس پر حضرت زبیرؓ نے کوفہ کی اور حضرت طلحہؓ نے بصرے کی گورنری کی درخواست کی تاکہ وہاں سے لشکر لاکر باغیوں کی سرکوبی کی جائے۔ حضرت علیؓ نے جواب میں فرمایا کہ مجھے اس معاملہ میں کچھ مہلت دو تاکہ میں معاملہ پر غور کر لوں۔

(البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۲۸ ج ۷ ذکر بیعۃ علی رضی اللہ عنہ بالخلافۃ)

ملاحظہ فرمائیے کہ ایک طرف صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک جم غفیر قصاص کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف حضرت علیؓ اور ان کے تمام ہمنوا صحابہ اس مطالبہ کو صحیح مان کر عذر یہ پیش کر رہے ہیں کہ ابھی خلافت مستحکم نہیں ہوئی۔ باغیوں کا زور ہے۔ ہم قصاص لے نہیں سکتے۔ جونہی حالات درست ہوں گے اور ہمیں قصاص لینے کی قدرت حاصل ہو جائے گی ہم ضرور قصاص لیں گے۔ لیکن امن و امان قائم ہو جانے کا انتظار فرمائیے۔ یعنی دونوں فریق قصاص میں صرف ایک عورت (حضرت نائلہ رضی اللہ عنہا) کے بیان پر قصاص لینے کو صحیح قرار دے رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ صحابہ کا اجماع حقیقی نہیں تھا کہ قصاص میں صرف ایک عورت کی شہادت قبول کی جانی چاہیئے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اجماع حقیقی یہ ہوتا ہے کہ تمام سربرآوردہ علماء کسی امر کے متعلق قولاً یا عملاً اتفاق کا اظہار کر دیں۔ اگر معاملہ قولی ہو تو بحث و تمحیص کے بعد سب زبان سے اعلان کریں کہ ہم نے اس

بات پر اتفاق کرلیا ہے اور اگر معاملہ عملی ہو تو وہ سب کے سب ایک کام کو ایک ہی طرح شروع کردیں جیسا کہ فقہاء نے اس کی مثال میں مضاربت، مساقاۃ اور مزارعت کو پیش کیا تھا۔ اسی طرح یہ معاملہ بھی عملی تھا اور تمام صحابہ نے اس کے مطابق یکساں عمل کا مظاہرہ فرمایا حتیٰ کہ سب نے ہتھیار سونت لئے اور جنگ میں کود پڑے اور قریب ایک لاکھ صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے (جانبین سے) جام شہادت نوش فرمالیا۔ اس سے بڑھ کر عملی اتفاق کا مظاہرہ کیا ہوگا۔

ہمارے علمائے کرام جو بات بات میں اجماع کی دُہائی دیا کرتے ہیں اور اجماع سکوتی پر ہی جو حقیقی اجماع بھی نہیں ہوتا۔ جس کے سب ائمہ قائل بھی نہیں ہیں طوفان برپا کر دینے کے عادی ہیں۔ حیرت ہے کہ اُنہیں یہ اتنا بڑا اور اتنا اہم اجماع حقیقی نظر نہیں آرہا ہے۔ جس کی بنیاد پر ملت اسلامیہ میں چودہ سو برس سے سر پھٹول ہو رہی ہے اور پوری ملت، شیعہ اور سنی دو فرقوں میں بٹی چلی آرہی ہے۔ اس اجماع حقیقی سے ثابت ہے کہ قصاص اور حدود میں نہ صرف قرآن کریم اور سنت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بلکہ صحابۂ کرام کے اجماع سے بھی عورتوں کی شہادت صحیح ہے۔ نہ صرف عورتوں کی شہادت بلکہ جہاں سوائے ایک عورت کے اور کوئی شاہد ہی نہ ہو، وہاں قرائن کے ساتھ صرف ایک عورت کی تنہا شہادت قبول کرلی جائے گی۔ کیونکہ شہادت قبول نہ کرنے میں ایک حق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے جس کا معاملہ نہایت

اہم ہے ۔ ھٰذا ما رأیتہٗ واللہ اعلم

عورت اور مرد کی مشترکہ شہادت

جن فقہائے کرام نے ہر قسم کے معاملات میں تنہا خواتین کی شہادت کو معتبر سمجھا ہے ان کے نزدیک خواتین اور مردوں کی مشترکہ شہادت کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ وہ اس کو لامحالہ قبول کریں گے۔ یہاں اصل سوال ان فقہائے کرام کے بارے میں ہے جو نسوانی مسائل کے محدود دائرہ کے اندر ہی تنہا خواتین کی شہادت کو معتبر سمجھتے ہیں۔ اس دائرہ سے باہر جب تک خواتین کے ساتھ شہادت میں مرد بھی شریک نہ ہوں، وہ ان کی گواہی پر فیصلہ دینے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں۔ فقہاء کے اس گروہ کے درمیان اس پہلو سے اختلاف ہے کہ کن معاملات میں یہ مشترکہ شہادت قبول کی جائے گی اور کن معاملات میں قبول نہیں کی جائے گی۔

مکحولؒ تابعی کہتے ہیں کہ صرف قرض کے سلسلہ میں عورتوں کی گواہی پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ صرف قرض ہی کے معاملہ میں عورتوں کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔ ربیعہؒ کی رائے یہ ہے کہ عورتوں کی شہادت نکاح، طلاق، حدود اور غلاموں کی آزادی سے متعلق تو قابل اعتبار نہیں ہے البتہ ایسے حقوق اور معاملات جو باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں ان میں عورتوں کی شہادت قبول کی جا سکتی ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ صرف مالی مسائل میں مردوں کے ساتھ

عورتوں کی شہادت پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر پھر مالی مسائل کے تعین میں ان کے درمیان مزید اختلاف ہے۔ تمام فقہائے حنفیہ اور عثمان بتیؒ حدود و قصاص کے علاوہ ہر قسم کے مسائل میں عورت اور مرد کے مشترکہ بیان کو فیصلہ کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں۔ ایک روایت سے امام سفیان ثوریؒ کا بھی ایسا ہی خیال ظاہر ہوتا ہے۔ ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاص میں بھی ان کے نزدیک مردوں اور عورتوں کی مشترکہ شہادت قابل قبول ہے۔ صرف حدود میں وہ مشترکہ شہادت کو قبول کرنے کے حق میں نہیں ہیں طاؤس کہتے ہیں کہ زنا کے علاوہ بقیہ تمام معاملات میں مشترکہ شہادت تسلیم کی جائے گی۔ زنا میں اس لئے قبول نہیں کی جا سکتی کہ اس حالت کا بغور دیکھنا عورتوں کے شایان شان نہیں۔ عطاؒ ابن ابی رباحؒ کی رائے ہے کہ زنا اور دوسرے معاملات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ زنا میں بھی اگر تین مرد اور دو عورتیں گواہی دے دیں تو وہ قبول کر لی جائے گی۔

امام مالکؒ ہوں یا امام شافعیؒ یا فقہائے کرام کا وہ گروہ جو صرف مالی مسائل یا قرض کی حد تک شہادت نسواں کو جائز سمجھتا ہے اس کی رائے اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ عورت کا حافظہ یا اس کا فہم اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ کسی بھی معاملہ میں اس پر اعتماد کیا جا سکے۔ مگر چونکہ بعض معاملات میں اس کی عقل و فہم پر اعتماد کئے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں رہتا اس لئے مجبوراً اس کی شہادت کی بنیاد پر معاملات کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مالکی فقہ کی مشہور

کتاب مدونہ میں لکھا ہے۔

شهادة النساء انما جازت على وجه الضرورة۔

(المدونۃ الکبریٰ صہ ج ۴ ۸۳)

ترجمہ [عورتوں کی گواہی ضرورت کی بنا پر جائز ہوتی ہے۔]

اس مفروضہ تصور کی اساس ایک تو اس بات پر ہے کہ قرآن کریم نے مختلف مسائل، زنا، قذف، طلاق سے رجوع، وصیت اور قرض کے لین دین میں شہادت پر زور دیا ہے اور تاکید فرمائی ہے کہ ان معاملات میں شہادتیں قائم کی جائیں لیکن صرف قرض ہی کے سلسلہ میں عورت کی شہادت کا صراحتہً ذکر فرمایا ہے۔ دوسرے معاملات میں عورتوں کا کوئی نام نہیں لیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرض لین دین کے سلسلہ میں بھی قرآن کریم نے عورتوں کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتیں اس لئے ہونی چاہئیں کہ اگر ایک کو کوئی الجھاؤ پیدا ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ ان دونوں باتوں سے ان بزرگوں نے یہ سمجھا کہ قرض یا اسی نوعیت کے دیگر مسائل کے علاوہ بقیہ معاملات میں عورتوں کی شہادت جائز ہی نہیں اور قرض کی نوعیت کے مسائل میں بھی اس کی شہادت اس لئے قبول کر لی جاتی ہے کہ قدم قدم پر ان معاملات سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ہر وقت مردوں کی شہادت کا فراہم کرنا دشوار ہوتا ہے۔ پھر قرض کے معاملات میں بھی آیت کے الفاظ سے انہوں نے

یہ اصول وضع فرمالیا کہ عورت کی شہادت اسی وقت قابل قبول ہوگی جب اس کے ساتھ مرد بھی شریک ہو۔ کیونکہ عورت کی شہادت بر بنائے ضرورت مشروع ہوئی ہے۔

چنانچہ امام شافعیؒ کا ارشاد ہے۔

فَلَا يَجُوْزُ مِنْ شَهَادَتِهِنَّ شَيْءٌ وَإِنْ كَثُرْنَ إِلَّا وَمَعَهُنَّ رَجُلٌ۔ (کتاب الام صفحہ ۴۳)

ترجمہ [عورتوں کی شہادت سے کوئی چیز جائز نہیں ہو سکتی عورتیں کتنی ہی زیادہ تعداد میں ہوں بجز اس کے کہ ان کے ساتھ کوئی مرد بھی ہو۔]

ہمیں افسوس ہے کہ یہ تینوں باتیں ہماری ناقص سمجھ میں نہیں آئیں۔ پہلی بات اس نے صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ شرعی احکام دونوں اصناف انسانی کے لئے عام ہوتے ہیں۔ کسی حکم کے ذیل میں صراحت کے ساتھ عورت کا ذکر نہ کئے جانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اس میں وہ شامل نہیں ہے۔ قرآن کریم میں بے شمار احکام ہیں جن کے لئے مذکر کے صیغے ہی استعمال فرمائے گئے ہیں تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ عورتیں ان احکام کی مکلف ہی نہیں ہیں؟

دوسری بات کہ قرآن کریم کے الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ عورت کی شہادت بر بنائے ضرورت قبول کی گئی ہے تو یہ بالکل ہی غلط ہے۔ کیونکہ خود اس مسلک کے حاملین تسلیم کرتے ہیں کہ گواہی دینے کے لئے اگر دو مرد بآسانی مل سکتے ہوں لیکن پھر بھی کوئی ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالیتا ہے تو یہ شہادت

قبول کی جائے گی۔ اگر عورتوں کی شہادت محض ضرورۃً جائز فرمائی گئی تھی تو وہ اسی وقت جائز ہونی چاہیئے تھی جب ضرورت ہوتی اور دو مرد گواہ دستیاب ہی نہ ہو سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے محض عملی صورتِ حال سے بحث فرمائی ہے کہ قرض کا لین دین ہو یا اسی نوعیت کے دیگر معاملات ہوں کہ ان سے واسطہ عام طور سے مردوں ہی کو پڑتا ہے۔ اس لئے یہاں قرآن کریم نے اصلاً ان کی شہادت ہی کے احکام بیان فرمائے ہیں۔ عورتوں کو اپنی خانگی مصروفیات کی بناء پر ان معاملات میں شرکت کا بہت کم موقعہ ملتا ہے اس لئے شہادت کا تذکرہ ضمنی طور پر فرما دیا گیا ہے۔

اسی طرح ان حضرات کا یہ استدلال کہ عورت کی شہادت کے قابل قبول ہونے کے لئے کسی نہ کسی مرد کا شریک شہادت ہونا ضروری ہے تسلیم کئے جانے کے لائق نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اس استدلال کو صحیح قرار دیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ شہادت کی جو دو صورتیں بیان کر دی گئی ہیں۔ کسی دعوے کی اثبات کی بس یہی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ مانتے ہیں کہ آیت میں جن دو صورتوں کا ذکر ہے ان سے ہٹ کر اگر کوئی شخص اپنے دعوے پر صرف ایک گواہ پیش کرے اور ساتھ ہی قسم بھی کھائے تو اس کا دعویٰ ثابت ہو جائے گا۔

اور فقہائے حنفیہؒ کے اصول پر قرض لین دین کی آیت سے دوسری مطلق آیات کو مقید کرنا صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا اس آیت کی وجہ

سے یہ کہنا کہ ہر جگہ اسی اصول پر عمل کیا جائے گا اور تنہا عورتوں کی شہادت بغیر مرد کی شرکت کے قبول نہیں کی جا سکتی، محل تأمل ہے۔

ہمارے خیالات کی تائید بعض عملی نظائر سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً متفقہ طور پر عورتوں کے مستور معاملات سے متعلق عورتوں کی شہادت بغیر مرد کی شرکت کے قبول کی جاتی ہے۔

حضرت حذیفہ ابن الیمان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے محض ایک قابلہ (دایہ) کی شہادت پر فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ معاملہ قرض لین دین کا یا مالیات کا بھی نہیں تھا۔

(احکام القرآن للجصاص ص۵۹۷ ج۱)

دور فاروقی و دور علوی کی مثالیں ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔

حدود میں عورتوں کی شہادت

حدود کے بارے میں عورتوں کی شہادت قبول نہ کئے جانے پر بعض حضرات نے اس آیت کریمہ سے استدلال فرمایا ہے جو سورۂ نساء میں آئی ہے کہ۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ۔ (۴/۱۵)

ترجمہ [اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کی مرتکب ہوں، ان پر اپنے میں سے چار گواہ بنا لو۔]

ان کے نزدیک اول تو اس میں مِنْکُمْ جمع مذکر کی ضمیر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گواہ مردوں میں سے ہی ہونے چاہئیں۔

دوسرے یہ کہ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا ... بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فرمایا گیا ہے۔ اگر عورتوں کی شہادت کو بھی جائز قرار دیا جائے تو عدد بڑھ جائے گا۔ کیونکہ ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتیں رکھنی ہوں گی۔ لہٰذا یا تو وہ تین مرد اور دو عورتیں ہوں گی۔ جن کا مجموعہ پانچ ہو جائے گا یا دو مرد چار عورتیں ہوں گی جن کا مجموعہ چھ ہو جائے گا۔ تو عدد اور معدود دونوں میں مخالفت لازم آتی ہے۔

جہاں تک استدلال کے پہلے حصہ کا تعلق ہے اس کا جواب تو ہم گذشتہ صفحات میں بار بار دے چکے ہیں کہ قرآن کریم میں مذکر کے صیغوں سے خطاب کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ ان احکام کے مخاطب صرف مرد ہیں اور عورتیں ان احکام کی مکلف ہی نہیں ہیں۔ جب ایک مشترک جماعت کو خطاب کیا جاتا ہے جس میں مرد بھی ہوں اور عورتیں بھی ہوں تو خطاب مذکر صیغوں سے ہی کیا جاتا ہے۔ آپ ہزاروں جلسوں میں شریک ہو چکے ہوں گے۔ وہاں ہر مقرر۔ جناب صدر اور خواتین و حضرات! کے بعد گھنٹوں خطاب کرتے چلا جاتا ہے اور بلا تکان مذکر کے صیغوں میں ہی خطاب کرتا ہے۔ کبھی کسی کو یہ واہمہ بھی نہیں گذرتا کہ خطاب صرف مردوں کو ہو رہا ہے۔ عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

رہا دوسرا یعنی عدد کی مخالفت کا سوال تو وہ اس لئے ذہن میں الجھن پیدا کر رہا ہے کہ ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ ہر شہادت میں دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہوتی ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے صرف قرض لین دین کے سلسلہ میں یہ قید لگائی تھی۔ ہم نے اسے ہر شہادت

پر چسپاں کر لیا۔ ورنہ اگر مطلق آیات کو اپنے اطلاق پر ہی رکھا جائے جیسا کہ فقہ حنفی کا اصول ہے تو عدد میں کوئی مخالفت لازم نہیں آتی۔ چار گواہ ہونے چاہئیں۔ خواہ مرد ہوں خواہ عورتیں۔ دو مرد اور دو عورتیں۔ اور ایک مرد اور تین عورتیں، تین مرد اور ایک عورت عدد ہر حال میں چار ہی رہتا ہے۔

نیز عدت گزر جانے کے بعد بیوی سے جدید عقد اور اسے رخصت کرتے وقت جو قرآنی حکم ہے۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (۶۵/۲)

ترجمہ [تو جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو خواہ انہیں دستور کے مطابق روک لو یا دستور کے مطابق ان سے جدا ہو جاؤ (لیکن دونوں حالتوں میں) اپنے میں سے دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنا لیا کرو۔]

اس آیت کے متعلق آپ کیا فرمائیں گے۔ یہ حدود و قصاص کا معاملہ تو ہے نہیں اس میں آپ ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کو کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی وہی دونوں چکر موجود ہیں۔ عدد بھی کہ دو عادل گواہ ہوں (ذَوَیْ عَدْلٍ) اور معدود بھی ہے کہ تم میں سے ہوں (مِنْكُمْ)۔ لہٰذا یہاں بھی آپ کے اصول کے مطابق عدد اور معدود کی مخالفت لازم آ رہی ہے۔ لیکن اس میں آپ کو کوئی اشکال پیش نہیں آیا۔

حنفیہؒ کا اصول حنفیہؒ نے ایک اصول یہ بیان کیا ہے کہ حدود و قصاص میں عورت کی شہادت اس لئے کافی نہیں ہے کہ اس کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ اس کی شہادت میں غلطی کا احتمال رہتا ہے اور شریعت حدود و قصاص میں انتہائی قطعی اور یقینی دلائل کا مطالبہ کرتی ہے، دیگر معاملات میں وہ اتنی قطعیت کو ضروری نہیں سمجھتی۔ اس لئے ان دلائل میں کسی قدر شبہ کے باوجود فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

اس اصول کی رو سے حدود و قصاص کے علاوہ بقیہ مسائل کے فیصلے صرف خواتین کی شہادت پر صحیح ہونے چاہئیں۔ لیکن حنفیہؒ محض نسوانی مسائل کے علاوہ کسی بھی مسئلہ میں ان کی شہادت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جب تک کہ ان کے ساتھ گواہی میں کوئی مرد شریک نہ ہو۔ اس اعتراض کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ :-

ان القیاس یقتضی قبول ذالک لکنہ ترک ذالک کیلا یکثر خروجھن

(العنایہ برحاشیہ فتح القدیر صہ ج۶)

ترجمہ [قیاس تو یہی چاہتا ہے کہ تنہا خواتین کی شہادت بھی قبول کی جائے لیکن اس پر عمل اس لئے نہیں کیا جاتا تاکہ گھروں سے باہر عورتوں کی آمد و رفت زیادہ نہ ہونے لگے۔]

غور فرمائیے کہ یہ دلیل کس قدر کمزور ہے۔ ایک شخص چار پختہ سیرت و کردار اور قابل اعتماد خواتین کے سامنے کسی مفلوک الحال اور محتاج عزیز و قریب کے لئے وصیت کرکے مرجاتا ہے۔ کیا شریعت

کے تقاضے اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ یہ وصیت محض اس مصلحت کی بناء پر نافذ نہ ہو کہ ان خواتین کو گھر سے باہر نکلنا نہ پڑے یا اس بات کا کہ اس مصیبت زدہ شخص کو مصیبت سے نجات دلانے کیلئے ان کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی جائے؟ اور اگر ان دو عورتوں کے ساتھ ایک مرد شہادت میں شریک ہو جائے تو شہادت قبول کر لی جائے گی اور پھر عورتوں کو گھر سے باہر نہ نکلنے کی مصلحت کا کوئی خیال نہیں کیا جائے گا؟

اصل سوال حنفیہؒ کے اس دعوے کے بارے میں پیدا ہوتا ہے کہ ایک مرد کے قائم مقام دو عورتوں کو کرنے کے باوجود ان کے بیان میں غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ کیونکہ انسانی تجربات سے اس دعوے کی تائید نہیں ہوتی۔ فرض کیجئے کہ خاص عورتوں کے کسی مجمع میں جھگڑا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں ایک عورت ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس ہلاکت کے اسباب پر انتہائی ثقہ اور عقل و فہم رکھنے والی آٹھ خواتین ایک متفقہ بیان دیتی ہیں۔ کیا عقل اور تجربہ یہی کہتا ہے کہ ان کے اس بیان کا وزن اتنا بھی نہیں ہے جتنا چار عام مردوں کی شہادت کا ہوتا ہے؟ اس سے زیادہ حیرت یہ سوچ کر ہوتی ہے کہ کسی مالی معاہدہ پر تو ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت حنفیہؒ کے ہاں قابل اعتماد ہے۔ لیکن چوری، زنا، قذف، قتل وغیرہ مقدمات میں ایک دو نہیں بیسیوں عورتوں کی گواہی بھی بھروسہ کے لائق نہیں ہے۔ عورت کی ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں یہ انتہائی بدظنی ہے۔ تعجب ہے کہ فقہ حنفی میں یہ بات کیسے جگہ پا گئی۔

اس فقہ کا تو امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ اس کی تعلیمات عقل کو اپیل کرنے والی ہوتی ہیں۔ علامہ ابن حزمؒ نے حقیقت سے کس قدر قریب تر بات ارشاد فرمائی ہے۔

وَبِضَرُورَةِ العقل یدری کل احد انه لا فرق بین امرأة وبین رجل وبین رجلین وبین امرأتین وبین اربعة رجال وبین اربع نسوة فی جواز تعمد الکذب والتواطی علیه وکذلک الغفلة ولو حینا الی هذا لکان النفس اطیب علیٰ شهادة ثمان نسوة منها علیٰ شهادة اربعة رجال۔ (المحلی صـ ۴۰۳ ج ۹)

ترجمہ [ہر شخص یہ بات بداہتۃً جانتا ہے کہ ایک عورت اور ایک مرد اور دو مرد اور دو عورتوں، اور چار مرد اور چار عورتوں کے درمیان اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ عمداً جھوٹ بولیں اور اس پر اتفاق کر لیں۔ یہی حال غفلت کا ہے۔ خواہ تھوڑی سی دیر کے لئے سہی (عورت اور مرد) دونوں اس کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے چار مردوں کی گواہی کے مقابلہ میں آٹھ عورتوں کی گواہی پر یقیناً دل زیادہ اطمینان محسوس کرتا ہے۔]

نیز علامہ ابن القیمؒ لکھتے ہیں۔

انالانسلم ضعف شهادة المرأتین اذا اجتمعتا ولهذا انحکم بشهادتهما مع الرجل وان امکنه ان یاتی برجلین فالرجل والمرأتان اصل لا بدل۔ والمرأة العدل کالرجل فی الصدق والامانة والدیانة الا انها لما خیف علیها السهو والنسیان

فتویت بمثلها وذلك فقد يجعلها اقوی من الرجل الواحد او مثله ولا ريب ان الظن المستفاد من رجل واحد دونهما ودون امثالهما۔

(الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیہ ص۱۵۲-۱۵۷)

ترجمہ [ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ دو عورتوں کی شہادت کمزور ہوتی ہے جبکہ وہ اس پر متفق ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مرد کے ساتھ ان دونوں کی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ کر دیتے ہیں اگرچہ دو مرد گواہوں کا پیش کرنا ممکن ہی کیوں نہ ہو۔ بس ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت خود اصل ہے نہ کہ بدل۔ ایک قابل اعتماد عورت مرد ہی کے مانند ہے۔ سچائی، امانت اور دیانت میں مگر چونکہ اس پر سہو و نسیان کا اندیشہ کیا جاتا ہے اس لئے اس جیسی عورت سے اس کی تقویت کر دی گئی۔ دوسری عورت کی تائید اس کو ایک مرد سے زیادہ قوی بنا دیتی ہے یا کم از کم اس کے برابر کر دیتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک شخص کی گواہی سے جو گمان حاصل ہوتا ہے وہ ان دونوں یا ان جیسی دوسری عورتوں کی گواہی سے حاصل شدہ گمان سے کم ہوتا ہے۔]

حدود میں عورت کی شہادت قبول نہ کئے جانے پر حنفیہؒ نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ سب کمزور ہیں۔ ان کی سب سے بڑی دلیل امام زہریؒ کی وہ روایت ہے جو شیخ الاسلام امام جصاصؒ نے نقل فرمائی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی سنت یہ ہے کہ حدود وقصاص میں عورت کی شہادت

قبول نہ کی جائے۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۵۹۶، ۵۹۸)

خود جصاصؒ نے اس کی کوئی سند پیش نہیں کی البتہ شیخ ابن الہمام نے اس کو ابن ابی شیبہؒ کے حوالہ سے سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ابن ابی شیبہؒ نے یہ روایت حفص ابن غیاث سے لی ہے لیکن محدثین نے اُنہیں مدلّس کہا ہے۔ پھر حفص کو یہ روایت حجاج بن ارطاۃ سے ملی ہے۔ حجاج ابن ارطاۃ نے اسے زہری سے نقل کیا ہے۔ حجاج ابن ارطاۃ خود مدلّس ہیں اور ان کو زہری سے سماع حاصل نہیں۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۱۵-۴۱۸ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۱۳ و تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۹۶-۱۹۸)

ان تفصیلات سے آپ نے دیکھ لیا کہ اسلام ہر معاملے میں شہادتِ نسواں کو جائز سمجھتا ہے۔ ہاں اس کی یہ رائے ضرور ہے کہ جن امور کا تعلق براہِ راست مرد کی عملی زندگی سے ہے اور جو عورت کے دائرۂ کار میں نہیں آتے ان کے متعلق اس کی شہادت میں مرد کی شہادت کے مقابلہ میں سہو و نسیان کا امکان ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی حقیقت تک رسائی میں آدمی کی فکر و فہم کو جتنا دخل ہوتا ہے اتنا ہی اس کی ذہنی ساخت اور عملی سرگرمیوں کو بھی ہوتا ہے۔ ایک واقعہ کسی کے دامن توجہ کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور وہ اس کی تہہ تک پہنچنے اور اس کے مالہٗ و ما علیہ سے واقف ہونے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن دوسرے شخص کے لئے اس میں کوئی کشش اور جاذبیت نہیں ہوتی اور وہ سرسری طور پر اس سے گذر جاتا ہے۔ ایک کاروباری آدمی کا ذہن علمی مسائل

میں اتنی مستعدی سے کام نہیں کرتا جتنا ایک طالب علم کا کرتا ہے۔ بلکہ خود علم کے مختلف شعبوں کا یہ حال ہے کہ ایک شعبہ کے ماہر کو دوسرے شعبہ کی معلومات اخذ کرنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ یہی حال عورت کا ہے کہ اس کا ذہنی سانچہ اور اس کے عمل کی دنیا مرد کے ذہنی سانچے اور عملی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اپنی حدود سے باہر ہونے والے واقعات کا مشاہدہ، در ضبط اتنی عمدگی کے ساتھ نہیں کر سکتی جتنی عمدگی سے ساتھ مرد کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود شریعت نے ان واقعات میں بھی اس کی شہادت قبول کی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت عورت کی ذہنی صلاحیتوں پر ان امور میں بھی اعتماد کرتی ہے جو اس کی افتادِ طبع، عملی سرگرمیوں سے کلی طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں۔

رہ گئے وہ معاملات جن میں وہ شب و روز لگی رہتی ہے اور جو اس کے ذوق و رجحان سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔ ان میں شریعت نے اس کی گواہی کو مرد کی گواہی کی حیثیت دی ہے۔ بلکہ امام شعبیؒ تو فرماتے ہیں کہ

من الشہادات مالا یجوز فیہ الا شہادۃ النساء۔

(الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ ص۱۲۴)

ترجمہ [یعنی بعض شہادتیں ایسی ہیں جہاں سوائے عورت کے اور کسی کی گواہی قبول ہی نہیں۔]

روایت حدیث میں عورت پر اعتماد

امت نے زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق عورت کی روایت حدیث پر کلی اعتماد کیا ہے۔ اگر عورت کا حافظہ اور اس کی فکر و فہم اتنی ہی ناقص تھی تو سب سے پہلے ہمارے علماء کو دین کے اس اہم ترین حصہ میں اس کی روایات پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اگر دین میں عورتوں کی روایات اور مردوں کی روایات میں کوئی فرق نہیں کیا گیا تو دنیوی معاملات میں بطریق اولیٰ ان پر اعتماد کیا جانا چاہیئے۔ ہماری فقہ کا بہت سا حصہ عورتوں ہی کی روایات پر مبنی ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہت سی روایات ایسی ہیں جن میں کوئی ان کا شریک نہیں اور کسی کی جرأت نہیں کہ ان کا انکار کر سکے۔ حضور اکرمؐ کا یہ قول ہمارے علماء کے ہاں مشہور ہے کہ دین کا نصف حصہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے سیکھو۔

غرض یہ کہ جب دینی معاملات سے متعلق احادیث میں عورتوں پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا ہے تو دنیوی معاملات میں کیوں نہیں کیا جا سکتا جب کہ دینی معاملات کو دنیوی معاملات پر بہر حال بڑی فوقیت حاصل ہوتی ہے۔

ان تمام امور پر غور کرنے کے بعد ہماری حتمی رائے ہے کہ عورتوں کی شہادت کو وہی مرتبہ اور وہی اہمیت حاصل ہونی چاہیئے جو مردوں کی شہادت کو حاصل ہوتی ہے۔ البتہ صرف قرض کے لین دین کے معاملات میں جو عورت کے دائرۂ کار میں نہیں آتے اور جن کے متعلق قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ عورتوں کی شہادت کو دو

سے نصف قرار دیا ہے وہاں اس کو نصف کا درجہ دینا ہوگا۔ لیکن دوسرے معاملات میں چونکہ قرآن کریم نے کوئی فرق نہیں کیا اس لئے ہمیں بھی کوئی فرق کرنے کا حق نہیں ہے۔ خصوصاً حدود اور قصاص کے معاملات میں جو بسا اوقات اپنی شناعت اور ہولناکی کی بناء پر اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے کے دل پر نقش کالحجر ہوجاتے ہیں اس لئے ان میں سہو ونسیان کا کوئی ایسا امکان ہی نہیں ہوتا جس کی بناء پر عورتوں کی شہادتوں میں کسی قسم کا شک وشبہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم حدود اور قصاص میں بھی عورتوں کی شہادات کو بعینہٖ وہی وزن دینے کے حق میں ہیں جو مردوں کی شہادات کو حاصل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

طفلانہ استدلال کہا جاتا ہے کہ حق تعالےٰ نے قرآن کریم میں جو ہدایات واحکام دیئے ہیں ان میں عموماً مردوں ہی کو مخاطب کیا ہے اور مذکر ہی کے صیغے استعمال فرمائے ہیں۔ نہ عموماً عورتوں کو مخاطب کیا ہے نہ مؤنث کے صیغے استعمال فرمائے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے بھی عورتوں کو تخاطب کے لائق نہیں سمجھا اور مردوں ہی کو اہمیت دی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے مخاطب انسان ہیں اور ان کے معروف و مالوف انداز ہی میں حق تعالیٰ نے بھی اپنی ہدایات دی ہیں۔ عام اسلوب یہی ہے کہ جب جماعت کو مخاطب کیا جاتا ہے جس میں مرد بھی ہوں اور عورتیں بھی ہوں تو مذکر کے صیغوں ہی میں بات کی جاتی ہے۔ ان محفلوں میں جن میں مرد بھی ہوں اور عورتیں بھی

ہوں۔ ہر مقرر مذکر کے صیغوں ہی میں بات کرتا ہے اور مذکر کے صیغوں ہی میں تخاطب کرتا ہے۔ حالانکہ اس کے مخاطب مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے بھی اسی معروف و مالوف طرز تخاطب کو اختیار کیا ہے۔ اس میں نہ کسی کی افضلیت کا اظہار ہے نہ کسی کی مفضولیت کا۔ جیسے قرآن کریم نے پوری نوع انسانی کو مخاطب کیا ہے۔ یَااَیُّھَا النَّاسُ! یا بَنِیٓ اٰدَمَ! یا یا بَنِیٓ اِسْرَآئِیْلَ! وغیرہ۔ الناس میں مرد بھی داخل ہیں۔ عورتیں بھی داخل ہیں۔ مرد بھی انسان ہیں۔ عورتیں بھی انسان ہیں۔ اولادِ آدم میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔ اولادِ اسرائیل میں، اسرائیلی مرد بھی شامل ہیں۔ اسرائیلی عورتیں بھی شامل ہیں۔

جہاں تک تخاطب کا تعلق ہے یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ جس شخص کا احترام ملحوظ خاطر ہوتا ہے اسے عموماً براہ راست مخاطب نہیں کیا جاتا۔ "آنجناب نے یہ فرمایا تھا"، "اعلیٰ حضرت نے یہ فرمایا تھا"، "آنحضرت نے یہ ارشاد فرمایا ہے"، "آنحضور نے یہ فرمایا ہے" یہ تمام صیغے غائب کے ہیں۔ "آن" فارسی میں ضمیر غائب ہوتی ہے۔ حالانکہ جن حضرات کے لئے آنجناب، اعلیٰ حضرت، آنحضرت، آنحضور کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ متکلم کے سامنے عموماً موجود ہوتے ہیں، مگر محض احتراماً انہیں غائب کے صیغوں سے بیان کیا جاتا ہے۔ اسی طرح عورتوں کو براہِ راست مخاطب نہ کرنا

ان کے احترام کی دلیل ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

جنت میں مردوں کے لئے حوریں

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے جا بجا جنت میں مردوں کے لئے حوروں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ لیکن عورتوں کے لئے حوروں جیسے مردوں کا کوئی ذکر نہیں فرمایا کہ جنت میں نیک عورتوں کو بھی کچھ ملے گا یا نہیں۔ اس سے بھی یہی ترشح ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ نے مردوں ہی کو اہمیت دی ہے۔ عورتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

یہ استدلال اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ لوگوں نے اپنے آپ یہ طے کر لیا ہے کہ حوریں عورتیں ہوں گی جو جنت میں نیک مردوں کو ملیں گی۔ حالانکہ حُوْرٌ کے یہ معنے صحیح نہیں ہیں۔ حُوْرٌ کے بنیادی معنے سفید ہونے کے ہیں۔ چنانچہ اَلْحَوَرُ ایک لکڑی کو کہتے ہیں جو سفید ہوتی ہے۔ اسی لئے اسے اَلْبَيْضَاءُ بھی کہتے ہیں۔ اَلْحَوَارِيَّاتُ شہری عورتوں کو کہتے ہیں جن کا رنگ سفید ہو۔ اَلْحَوَارِيُّوْنَ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو کہتے ہیں جو ان پر ایمان لائے تھے۔ کیونکہ ان کا رنگ سفید تھا یا وہ پیشہ کے اعتبار سے دھوبی تھے جو کپڑوں کو دھو کر سفید کر دیا کرتے تھے۔ اسی مادہ سے حُوْرٌ اسم تفضیل کا جمع کا صیغہ ہے۔ اس کا واحد اَحْوَرُ بھی ہے اور حَوْرَاءُ بھی ہے۔ مذکر و مؤنث اسم تفضیل، دونوں کی جمع فُعْلٌ

کے وزن پر آتی ہے۔ اس لئے حُوْرٌ کے معنے نورانی پیکر والے مرد اور نورانی پیکر والی عورتیں دونوں ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھ لینا کہ حوریں عورتیں ہی ہوتی ہیں غلط ہے۔ (ہمارے ہاں اردو میں حُوْرٌ کو واحد سمجھ لیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی جمع حوریں بولا جاتا ہے۔ حالانکہ عربی میں حُوْرٌ خود جمع کا صیغہ ہے)

جنت کی زندگی کے متعلق جو مرنے کے بعد مستقبل میں ہر صالح اور مومن بندہ کا حصہ ہوگی۔ یہ واضح الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ اس کی کنہہ وحقیقت اور کیفیت و ماہیت اس دنیا میں ہمارے شعور کی سطح سے بہت بالا ہے۔ اسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔

قرآن کریم میں ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ (۳۲/۱۷)

ترجمہ [جو کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک (نعمائے جنت) ان کے اعمال کے بدلے میں لوگوں (کی آنکھوں) سے پوشیدہ رکھی گئی ہے، اسے کوئی شخص نہیں جان سکتا۔]

لہٰذا اس کے متعلق کسی قسم کی خامہ فرسائی یا تخیل آفرینی بیکار اور بے سود ہے۔

اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ

سورۂ بقرہ میں جنت کی زندگی کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ

رِزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (۲/۲۵)

ترجمہ [اے پیغمبر اسلام! اہل ایمان کو جنہوں نے نیک اعمال کئے ہیں بشارت دے دیجئے کہ ان کے لئے آخرت میں باغات ہوں گے جن کے پائیں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ جب انہیں جنتوں کے پھلوں میں سے کچھ کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ کھانا تو ہمیں اس سے پہلے بھی دیا جا چکا ہے (لیکن وہ کھانا انہیں اس سے پہلے نہیں دیا گیا ہوگا۔ بات یہ ہوگی کہ) انہیں صورۃً ملتے جلتے پھل دیئے جائیں گے (لیکن ان کا مزہ مختلف ہوگا) اور وہاں ان کے لئے پاک و صاف جوڑیاں ہوں گی اور وہ ان باغات میں ہمیشہ رہیں گے]

یہی الفاظ سورۂ آل عمران میں بھی آئے ہیں (۳/۱۵) اور سورۂ نساء میں بھی (۴/۵۷) قرآن کریم میں اور بھی کئی جگہ اسی قسم کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم کتاب النکاح (فقہ القرآن جلد اول) میں بتا چکے ہیں اَزْوَاجٌ کے معنے بیویاں نہیں ہیں۔ اس کے معنے "جوڑے" ہیں۔ زَوْجٌ شوہر کو بھی کہتے ہیں اور بیوی کو بھی کہتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم نے اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ سے یہ نہیں بتایا ہے کہ جنت والوں کو (یعنی مردوں کو) پاکیزہ بیویاں ملیں گی بلکہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ جنت والوں کو (مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی) جنت میں پاکیزہ جوڑے ملیں گے۔ مردوں کو پاکیزہ بیویاں اور عورتوں کو پاکیزہ شوہر۔ قرآن کریم نے سورۂ نور میں اس کی مزید وضاحت

فرمادی ہے جہاں فرمایا ہے۔

اَلطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ (۲۴/۲۶)

ترجمہ [پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے ہوتے ہیں۔]

سورۂ نور کا یہ بیان اسی دنیا کے متعلق ہے۔ لیکن جب اس دنیا میں حق تعالیٰ کا منشا یہ معلوم ہوگیا تو آخرت میں بطریق اولیٰ حق تعالیٰ کا منشا یہی ہوگا۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان پاکیزہ جوڑوں کی کیا صورت ہوگی۔ یہ جوڑے کسی جنتی مخلوق سے ترتیب دیئے جائیں گے یا خود دنیوی زندگی میں نیک اور صالح افراد کے اعمال صالحہ کی وجہ سے جو مرد اور عورتیں جنت کے مستحق افراد ثابت ہوں گے۔ انہی سے یہ جوڑے ترتیب دیئے جائیں گے۔ یعنی دنیا میں جو میاں بیوی بن کر رہ چکے تھے وہاں بھی ان کی یہ جوڑیاں علیٰ حالہ باقی رکھی جائیں گی۔ اور انہی لوگوں کو جنت کے نورانی پیکر (حور) کے لقب سے یاد کیا جائے گا۔ بہرحال اُخروی زندگی کی کیفیات کے متعلق ہم اس دنیا میں مرنے سے پہلے کوئی رائے زنی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہاں کے حالات و کیفیات ہماری موجودہ علمی و عقلی سطح سے بہت بلند ہیں۔ ہم اُنہیں سمجھ ہی نہیں سکتے۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ بھی ملاحظہ ہو

گذشتہ تصریحات سے یہ بات اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ قرآن کریم میں انسانیت کی ان دونوں صنفوں (یعنی مردوں اور عورتوں) میں کوئی فرق و امتیاز نہیں رکھا گیا۔ دونوں کو ایک ہی سطح

پر رکھا ہے البتہ دونوں کے دائرہ ہائے کار میں اس نے یکسانیت نہیں رکھی۔ عورتوں کا دائرۂ کار اندرونِ خانہ کے معاملات سے ہے اور مردوں کا دائرۂ کار بیرونِ خانہ اکتسابِ رزق کی جدوجہد اور دیگر ضروریات سے۔ اندرونِ خانہ جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ عورتوں کو زیادہ دی گئی ہیں۔ لہٰذا ان صلاحیتوں میں وہ افضل ہیں اور بیرونِ خانہ جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ مردوں کو زیادہ دی گئی ہیں اور ان میں وہ عورتوں سے افضل ہیں۔ اسی بات کو قرآن کریم نے یوں کہہ کر واضح کر دیا ہے کہ۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۱۷/۲۱)

ترجمہ [دیکھو، ہم نے کس طرح بعض افراد کو دوسرے بعض افراد پر (بعض معاملات میں) فضیلت اور برتری دے رکھی ہے۔]

ایک نکتہ اس سلسلہ میں ایک نکتہ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ نکاح کو قرآن کریم نے مرد و عورت کا باہمی معاہدہ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (۲/۲۳۵، ۲/۲۳۷) یعنی نکاح کا بندھن، یا نکاح کی گرہ اور دوسرے مقام پر مِيْثَاقًا غَلِيْظًا (۴/۲۱) مضبوط عہد و پیمان فرمایا ہے۔ لہٰذا نکاح دو انسانوں کا ایک عہد و میثاق ہے۔ دنیا میں اور بھی ہزاروں عہد و میثاق اور معاہدے ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس معاہدہ کو مذہبی اور دینی تقدس بھی حاصل ہے جبکہ دوسرے معاہدے صرف دنیوی اور معاشی یا سیاسی معاہدے ہوتے ہیں۔ اب فرض کیجئے کہ دو آدمی باہم مل کر کوئی کاروبار کرنے کا معاہدہ کرتے ہیں۔ دونوں مل کر کام کریں

گے۔ اور ہر لحاظ سے دونوں کی کاروباری حیثیت مساوی ہوگی۔ نفع ونقصان، محنت ومشقت میں دونوں شریک برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ لیکن معاہدہ کرتے وقت ایک فریق یہ شرط کرتا ہے کہ دوسرے فریق کو مارکیٹ میں بھاگ دوڑ کرنا ہوگی۔ مال کا پروپیگنڈا کرنا ہوگا۔ خریدار پیدا کرنے ہوں گے اور میں دوکان پر بیٹھ کر خریداروں کو اٹینڈ کروں گا۔ مزید یہ کہ دوسرا فریق مجھے (مثلاً) دس ہزار روپئے مزید نقد ادا کرے گا اور میں اُسے اس رقم کے عوض کچھ نہیں دوں گا۔ اور دونوں فریق اس پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اور معاہدہ کر لیتے ہیں کہ ہم دونوں اس طرح مشترک کاروبار کریں گے۔ یہ دس ہزار روپئے ایک فریق دوسرے فریق سے اس لئے وصول کرتا ہے کہ اس میں تجارت کی سوجھ بوجھ کچھ زیادہ ہے جو دوسرے فریق میں نہیں ہے۔ تو اس شرکت کے معاہدہ میں کون سا فریق برتر ہوا۔ وہ فریق افضل ہوا جو دس ہزار روپئے مزید نقد لے رہا ہے یا وہ افضل اور برتر ہوا جو دس ہزار روپئے دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ فضیلت اور برتری کا وزن اس فریق کا زیادہ ہے جو نقد دس ہزار روپئے وصول کر رہا ہے۔ اور جو شخص دس ہزار روپئے دے رہا ہے وہ تسلیم کر رہا ہے کہ تجارتی معاملات میں وہ دوسرے فریق سے کمتر ہے۔

بعینہٖ یہی صورت نکاح میں ہوتی ہے کہ ایک مرد اور عورت باہمی معاہدہ کرتے ہیں کہ وہ زندگی کی گاڑی کو مل کر کھینچیں گے۔ لیکن عورت یہ شرط رکھتی ہے کہ اس مشترک کاروبار حیات میں مرد

اسے (مثلاً) دس ہزار روپئے مزید نقد ادا کرے (یعنی مہر کی رقم ادا کرے) اور اسکے عوض میں عورت مرد کو کچھ نہیں دیتی۔ تو نکاح کرنے کی صورت میں مرد فریق غالب ہوا یا عورت شریک غالب ہوئی؟ آخر مرد کے پلڑے میں جو دس ہزار روپئے (مہر) کا پاسنگ رکھا جاتا ہے۔ اس کے معنے کیا ہیں؟

یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہ دس ہزار روپئے جو عورت مزید لیتی ہے وہ اس سے جنسی تمتع کا معاوضہ ہے۔ قرآن کریم نے مہر کو جنسی تمتع کا معاوضہ قرار نہیں دیا۔ اس نے یہ فرمایا ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ (۴/۴)

اور عورتوں کو ان کے مہر بطور عطیہ کے بلا بدل دے دو۔

راغب نے کہا ہے کہ اَلنِّحْلَةُ اور اَلنُّحْلَةُ اس عطیہ کو کہتے ہیں جو بغیر کسی قسم کے معاوضہ کے بلا بدل دیا جائے۔ (مفردات) جو مال مرد کی طرف سے عورت کو کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر تحفۃً دیا جائے اسے نِحْلَةٌ کہتے ہیں (تاج العروس) اَلْعَطَآءُ بِلَا عِوَضٍ بغیر کسی عوض کے عطیہ (لطائف اللغۃ) تاج العروس اور ابن فارس نے اَلنَّحْلُ کے یہی معنے لکھے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلنِّحْلَةُ اَلنَّحْلُ ہی سے مشتق ہے۔ یعنی جس طرح شہد کی مکھی بلا کسی معاوضہ کے شہد جیسی مفید اور شیریں چیز عطا کرتی ہے اسی طرح مہر بھی وہ شیریں تحفہ ہے جو عورت کو بطیب خاطر بغیر کسی معاوضہ کے خیال کے دیا جاتا ہے۔ تو مہر قرآن کی رو سے جنسی تمتع کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ تحفہ ہے جو مودّت اور محبت کے اظہار

کے لئے دیا جاتا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم نے متعدد آیات میں مہر کو اُجُوْرَھُنَّ (عورتوں کے مہر) کے لفظ سے بھی تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ آیت نمبر (۴/۲۴ اور ۴/۲۵) میں ۔ فَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ فَرِیْضَۃً (اُنہیں ان کے مہر بطور فریضہ کے ادا کرو) اور وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (اُنہیں ان کے مہر دستور کے مطابق ادا کرو) فرمایا ہے۔ نیز آیت نمبر (۵/۵) میں اِذَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ (بشرطیکہ تم اُنہیں ان کے مہر ادا کر دو) اور (۶۰/۱۰) میں بھی اِذَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ (بشرطیکہ تم اُنہیں ان کے مہر ادا کر دو) فرمایا ہے اور اَجْرٌ کام کے بدلے، اُجرت، کرایہ اور معاوضہ ہی کو کہتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مہر معاوضہ نہیں ہے بلکہ بلا معاوضہ ایک تحفہ ہے صحیح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اَجْرٌ کے بنیادی معنے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کے ہیں۔ مزدور کی مزدوری اور اجرت کو بھی اَجْرٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے اس کی مشقت کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ اس کی چٹخنے والی ہڈیاں جڑ جاتی ہیں۔ اسی طرح عورت اپنا گھر بار اور اپنے اعزہ کو چھوڑ کر دوسرے گھر، اور دوسرے لوگوں کے ساتھ گذارہ کرنے کے لئے جاتی ہے تو اس سے جو کچھ دل شکستگی اور آزردگی پیدا ہوتی ہے اس کی تلافی اس مہر کے تحفہ سے ہو جاتی ہے اس لئے اس کو اَجْرٌ کہہ دیا گیا ہے مگر اس سے معاوضہ کا جو تصوّر پیدا ہوتا تھا اس کی نفی قرآن کریم نے اسے صَدُقَۃٌ اور نِحْلَۃً کہہ کر خود ہی فرما دی ہے۔ کہ وہ تحفہ ہے۔ ہدیہ ہے اور بلا معاوضہ

تحفہ ہے۔ لہٰذا اجرؔ کے لفظ سے معاوضہ کا تصوّر کر لینا صحیح نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم کے الفاظ کا مفہوم تمام آیات کو سامنے رکھ کر ہی متعین کیا جا سکتا ہے۔ ایسا مفہوم قرآن کا مفہوم نہیں ہو سکتا جس سے قرآن کریم کی آیات میں تضاد اور تخالف پیدا ہو جائے۔ ورنہ نکاح اور زنا میں کیا فرق کیا جائے گا۔ بازاری عورتوں سے بھی تو معاوضہ ادا کر کے جنسی تمتع کیا جاتا ہے۔ اس میں اور شرعی نکاح میں کیا فرق رہا؟

کہا جاتا ہے کہ مرد اگر عورت کو مہر کی رقم ادا کرتا ہے تو عورت بھی تو جہیز لاتی ہے اور جہیز عام طور پر مہر کی رقم سے زیادہ ہی ہوتا ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ جہیز قطعاً غیر اسلامی چیز ہے۔ نہ قرآن کریم نے جہیز کا کہیں حکم دیا ہے نہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس کی طرف کوئی اشارہ فرمایا ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ جہیز کے لئے عربی زبان میں کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اگر یہ سمجھا جائے کہ عربوں میں جہیز کا کوئی رواج ہی نہیں تھا تو غلط نہیں ہوگا۔ جہیز کے مسئلہ پر ہم حقوق الزوجین کے باب میں بحث کریں گے۔

ان تمام تفاصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ قرآن کریم نے مردوں اور عورتوں کی کسی صنف کو دوسری صنف پر ترجیح نہیں دی۔ اور اس نے کسی صنف کو دوسری صنف پر برتری اور فضیلت عطا نہیں فرمائی۔ وہ دونوں کو شریک مساوی (EQUAL PARTNER) کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ واضح رہے کہ ہم مرد اور عورت کی ہر حیثیت سے مساوات کے مدعی نہیں ہیں۔ اور

نہ ہم اس کے مدعی ہیں کہ قرآن کریم نے دونوں کی مساوات ثابت کی ہے۔ ہمارے کہنے کا حاصل صرف یہ ہے کہ قرآن کریم نے اگر دونوں کی مساوات کا کوئی دعویٰ نہیں کیا تو اس نے دونوں صنفوں کی عدم مساوات کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ اس نے کسی کی فضیلت اور برتری کا کوئی فتویٰ نہیں دیا۔ اس نے یہ بتایا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی صلاحیتوں میں فرق ہے جو مردوں کی صلاحیتیں ہیں ان میں مرد برتر ہیں اور جو عورتوں کی صلاحیتیں ہیں۔ ان میں عورتیں برتر ہیں۔ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔

هٰذا ما ادایته و الله اعلم وعلمه اتم واحکم

اس اصولی بحث کے بعد ہم عورتوں کی دوسری اہم حیثیتوں سے بحث کرتے ہیں جو ہمارے طبقۂ علماء میں اہم موضوع بنی ہوئی ہیں۔ وباللہ التوفیق

(عورت کی تعلیم و تربیت)

جزیرۃ العرب اسلام سے پہلے وحشت وجہالت کا گہوارہ تھا۔ علم وفن کا ان کے ہاں کوئی بھی چرچا نہیں تھا۔ پورے مکہ معظمہ میں جو عرب کا مقدس شہر تھا اور بڑی تجارتی منڈی تھا صرف گنتی کے آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہ گنتی کے آدمی بھی مرد ہی تھے۔ تاریخ میں ہمیں کسی عورت کا نام نہیں ملتا جو لکھنا پڑھنا جانتی ہو۔ اسلام نے سب سے پہلے عربوں کو علم حاصل کرنے پر زور دیا

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں علم اور لکھنے پڑھنے کی ترغیب دی گئی تھی۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ (۹۶: ۱-۵)

ترجمہ [اے پیغمبر اسلام! اپنے اس پروردگار کا نام لے کر پڑھ۔ جس نے پوری کائنات کو پیدا کیا۔ جس نے انسان کو مضغہ، خون سے پیدا کیا۔ پڑھ، اور تیرا پروردگار بڑی عزتوں کا مالک ہے جس نے قلم سے لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اور انسان کو ان باتوں کی تعلیم دی جو وہ جانتا ہی نہ تھا]

ان آیات میں خطاب بظاہر اگرچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن درحقیقت یہ خطاب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے پوری اُمتِ مسلمہ کو ہے جس میں مرد بھی داخل ہیں اور عورتیں بھی۔ خود حضور اکرم کا اہم ترین فریضہ یہی قرار دیا گیا کہ۔

یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

ترجمہ [آپ لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔]

اسی تعلیم و ہدایت کا نتیجہ تھا کہ چند سالوں میں پورا عرب علم و فن کا گہوارہ بن گیا۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ مبذول فرمائی چنانچہ ابو داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتامیٰ میں ہے۔

من عال ثلاث بنات فادبهن و زوجهن واحسن الیهن فله الجنة۔

ترجمہ [جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی ان کو ادب اور سلیقہ سکھایا۔ ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کے لئے جنت ہے۔]

نیز بخاری کتاب العلم باب تعلیم الرجل امتہ و اہلہ میں ہے۔

ثلاثة لهم اجران۔ رجل كانت عنده امة فادبها واحسن تاديبها وعلمها فاحسن تعليمها ثم اعتقها فتزوجها۔

ترجمہ [تین آدمی ایسے ہیں جنہیں دہرا اجر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس کے پاس کوئی کنیز ہو تو وہ اسے ادب اور سلیقہ سکھائے اور بہتر طریقہ پر ادب اور سلیقہ سکھائے۔ اسے علم سکھائے اور اس کی تعلیم بہتر طریقہ سے کرے۔ پھر اسے آزاد کر کے خود ہی اس سے نکاح کر لے۔]

حضرت مالک ابن الحویرثؓ کا بیان ہے کہ ہم چند نوجوان حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں اصول دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ ہم بیس دن آپ کی خدمت میں رہے۔ پھر ہم نے واپس لوٹنے کا ارادہ کیا تو آپ نے ہمیں ارشاد فرمایا۔

ارجعوا الی اھلیکم فاقیموا فیھم وعلموھم ومروھم۔ (بخاری کتاب الاذان باب الاذان للمسافرین الخ)

ترجمہ [جاؤ، اپنے بیوی بچوں کے پاس واپس جاؤ، ان میں رہو، انہیں تعلیم دو، اور انہیں علم پر عمل کرنے کا حکم کرو۔]

سورۂ تحریم میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ط (۶۶/۶)

ترجمہ [اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اپنے نفسوں کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔]

ظاہر ہے کہ جس طرح اپنے نفسوں کو جہنم کے عذاب سے بچانا اس علم و واقفیت پر منحصر ہے کہ آدمی کو معلوم ہو کہ کونسی چیزیں آدمی کو جہنم کا ایندھن بناتی ہیں تاکہ وہ خود کو ان سے محفوظ رکھ سکے۔ ایسے ہی گھر والوں یعنی بیوی بچوں کو جہنم کا ایندھن بننے سے بچانا اس پر منحصر ہے کہ آدمی ان کو صحیح تعلیم و تربیت دے اور انہیں اوامر و نواہی سے آگاہ کرے تاکہ وہ خود کو جہنم کا ایندھن بننے سے بچا سکیں یہ آیت کریمہ اس بات پر نص صریح ہے کہ آدمی پر اپنے بیوی بچوں کو تعلیم و تربیت دینا فریضۂ الٰہی ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اس حکم کے مطابق مسلمانوں کو اس کی برابر تاکید فرماتے رہتے تھے چنانچہ سنن دارمی میں کتاب فضائل القرآن، باب فضائل اول سورۃ البقرہ و آیۃ الکرسی میں ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ان اللہ ختم سورۃ البقرۃ بآیتین اعطیتہما من کنزہ الذی تحت العرش فتعلموھن وعلموھن نسائکم۔

ترجمہ [یقیناً حق تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کو دو ایسی آیتوں سے ختم فرمایا ہے جو مجھے حق تعالیٰ کے اس خزانے سے عطا ہوئی ہیں جو عرش کے نیچے ہے۔ لہٰذا تم خود بھی اُنہیں سیکھو، اور اپنی بیویوں کو بھی سکھاؤ۔]

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے بھی ترغیب سے کام لیا کہ عورتیں بھی لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ چنانچہ ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الرقی اور مسند احمد ص۳۷۲/۶ میں شفاءؓ بنت عبداللہ کی یہ روایت ملتی ہے کہ ایک دن حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس بیٹھی ہوئی تھی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمانے لگے۔

آلا تعلمین ھذہٖ رقیۃ النملۃ کما علمتھا الکتابۃ۔

ترجمہ [تم انہیں یعنی حفصہؓ کو مرض نملہ کا علاج کیوں نہیں سکھا دیتی جیسا کہ تم نے اُنہیں لکھنا سکھا دیا ہے۔]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت شفاءؓ بنت عبداللہ فن کتابت جانتی تھیں اور انہوں نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھی یہ فن اچھی طرح سکھا دیا تھا۔ چنانچہ ازواج مطہرات میں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ خصوصی امتیاز حاصل تھا کہ وہ بہت اچھا لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا قرآن مجید جس کا لقب الاُمّ تھا حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی کی تحویل میں دیا گیا تھا اور وہ اُنہی کی تحویل میں رہا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق حضرت عمر فاروق حضرت عثمان

ذوالنورین رضی اللہ عنہم کو جب بھی اس کی نقول تیار کرانے کی ضرورت پڑی انہوں نے حضرت حفصہؓ ہی سے قرآن کریم کا یہ نسخہ منگوایا اور نقل کر کے اُنہی کو واپس فرمادیا۔

بہر حال اسلام نے عورتوں کی تعلیم و تربیت پر بڑا زور دیا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت پر کوئی قدغن عائد نہیں کی چنانچہ اسلام میں خواتین نے برابر علمی خدمات انجام دی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شاگرد خاص حضرت عروۃ ابن الزبیرؓ حضرت عائشہؓ کے وسعت علم کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

ما رأیت احدا من الناس اعلم بالقرآن ولا بفریضۃ ولا بحلال وحرام ولا بشعر ولا بحدیث العرب ولا النسب من عائشۃؓ۔ (تذکرۃ الحفاظ صـ۲۷ ج۱)

ترجمہ [میں نے حضرت عائشہؓ سے زیادہ، قرآن، فرائض، حلال و حرام، شعر و ادب، اہل عرب کی تاریخ اور ان کے حسب و نسب کو جاننے والا کسی آدمی کو نہیں دیکھا۔]

عروۃ ابن الزبیرؓ خود بڑے ادیب اور شعراء عرب کے اشعار پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے اس بارے میں ان کی تعریف و توصیف کی تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کے مقابلہ میں میری واقفیت کچھ حقیقت نہیں رکھتی وہ تو بات بات میں عرب شعراء کے اشعار سے استدلال کیا کرتی تھیں۔

(الاصابہ فی تمییز الصحابہ صـ۳۶۰ ج۴)

موسیٰ ابن طلحہ فرماتے ہیں کہ۔

ما رأیت احداً افصح من عائشةؓ۔

(ترمذی۔ ابواب المناقب و مستدرک صہ ۱۱/۴ ج)

لوگوں کو حضرت عائشہؓ کی شعر و ادب سے زیادہ ان کی طبی معلومات پر حیرت ہوتی تھی۔ ابن ابی ملیکہؒ نے آپ سے کہا کہ آپ کی شاعری پر ہمیں تعجب نہیں ہوتا کیونکہ آپ ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی ہیں جن کی فصاحت و بلاغت مسلّم ہے۔ لیکن آپ نے طب کہاں سے سیکھ لی۔ جواب دیا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو جب کچھ تکلیف ہوتی تو اطراف ملک سے آنے والے وفود اس کا علاج بتلاتے اور میں اسے یاد رکھتی تھی۔ (مستدرک حاکم صہ ۱۱/۴ ج)

آپ کی حساب دانی کا یہ عالم تھا کہ اکابر صحابہ آپ سے میراث کے مسائل دریافت فرمایا کرتے تھے۔ (ایضاً)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے تلامذہ میں ایک خاتون عمرہ بنت عبدالرحمٰن بھی ہیں ان کے تذکرہ میں ابن عماد حنبلیؒ فرماتے ہیں۔

الفقیھة الفاضلة عمرة بنت عبد الرحمٰن الانصاریة نشأت فی حجر عائشة فاکثرت الروایة عنها وھی العدل الضابطة لما یؤخذ عنها۔ (شذرات الذہب صہ ۱۱۴ ج)

ترجمہ [فقیہہ فضیلت مآب عمرة بنت عبدالرحمٰن انصاریہ جنہوں نے حضرت عائشہؓ کی گود میں پرورش پائی اور ان سے بکثرت روایات کیں۔ قابل اعتماد، ضبط و حافظہ کی مالک اور ایسی ہیں کہ ان کے اجتہادات و روایات مقبول ہیں۔]

انہی کے متعلق ابن حبان فرماتے ہیں۔

کانت من اعلم الناس بحدیث عائشۃؓ۔

(تہذیب التہذیب ص۴۲۹ ج۱۲)

ترجمہ [حضرت عائشہؓ کی روایات کو سب سے زیادہ جاننے والی تھیں]

مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ میں سے فقیہہ قاسم ابن محمدؒ نے ایک دن زہریؒ سے فرمایا کہ۔

" میں تمہارے اندر علم کی تشنگی محسوس کرتا ہوں کیا میں تمہیں علم سے بھرے ہوئے ایک برتن کی نشان دہی نہ کروں؟ زہریؒ نے عرض کیا، ہاں ضرور۔ کہا، جاؤ، عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی مجلس کو کبھی ترک نہ کرنا، کیونکہ وہ حضرت عائشہؓ کی پروردہ ہیں اسلئے ان کے علوم کی سب سے بڑی امین ہیں "

امام زہریؒ کہتے ہیں کہ میں حسب مشورہ حضرت عمرہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ واقعی علم کا ایک نہ ختم ہونے والا سمندر ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ص۱۰۶ ج۱)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔

کانت ام سلمۃ موصوفۃ بالجمال البارع والعقل البالغ والرأی الصائب۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابہ ص۴۵۹ ج۴)

ترجمہ [حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا انتہائی حسن وجمال کے ساتھ ساتھ پختہ عقل اور درستی رائے سے بھی متصف تھیں]

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی حضرت زینبؓ

بقول حافظ ابن عبد البر۔

کانت من افقہ اھل زمانھا۔ (الاستیعاب فی اسماء الاصحاب)

ترجمہ [وہ اپنے زمانے کے بڑے فقہاء میں سے تھیں۔]

ابورافع صائغ فرماتے ہیں کہ۔

کنت اذا ذکرت امرأۃ فقیھۃ بالمدینۃ ذکرت

زینب بنت ابی سلمۃ۔ (الاصابہ فی تمییز الصحابہ صہ ۳۱۷ ج ۴)

ترجمہ [میں جب بھی مدینہ منورہ میں کسی فقیہہ عورت کا ذکر کرتا ہوں تو مجھے فوراً زینب بنت ابی سلمہؓ یاد آجاتی ہیں۔]

حضرت ام سلمہؓ کی ایک کنیز ام الحسن تھیں ان کی صلاحیتوں کا یہ عالم تھا کہ وہ باقاعدہ وعظ و تبلیغ فرمایا کرتی تھیں۔

(طبقات ابن سعد صہ ۳۵ ج ۸)

ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے متعلق امام نوویؒ کا قول ہے۔

کانت عاقلۃ من عقلاء النساء۔ (تہذیب الاسماء والصفات ط ۳۴۹ ج ۲)

ترجمہ [وہ غیر معمولی صاحب عقل و دانش خواتین میں سے تھیں۔]

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی بیوی ام درداء رضی اللہ عنہا کے علم و فضل کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ امام بخاریؒ نے ان کے عمل سے اپنی کتاب صحیح بخاری میں استدلال فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

کانت تجلس فی صلاتھا جلسۃ الرجل وکانت فقیھۃ۔

(بخاری کتاب الاذان باب سنۃ الجلوس فی التشہد)

ترجمہ [حضرت ام درداءؓ تشہد میں اسی طرح بیٹھا کرتی تھیں جیسے مرد

بیٹھتے ہیں اور وہ فقیہہ تھیں۔ (لہٰذا ان کا عمل قابل حجت ہے)
ان کے متعلق علامہ ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے۔

کانت من فضلاء النساء و عقلائهن و ذوات الرأي منهن مع العبادة والنسك۔

(الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرہ ام الدرداء)

ترجمہ [عقل و فضیلت اور رائے و تدبیر رکھنے والی عورتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بڑی عبادت گذار اور تقویٰ شعار خاتون تھیں۔]

امام نوویؒ نے ان کے فقہہ و فہم پر سب کا اتفاق نقل کیا ہے۔

واتفقوا على وصفها بالفقه والعقل والفهم والجلالة۔ (تہذیب الاسماء والصفات صـ۳۶۰ ج۲)

ترجمہ [لوگوں نے ان کے فقہ، عقل، فہم اور بزرگی پر اتفاق کیا ہے]

فاطمہ بنت قیسؓ کے تفقہہ اور علم کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک فقہی مسئلہ میں وہ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے عرصہ تک بحث کرتی رہیں لیکن وہ دونوں ان کی رائے کو تبدیل نہ فرما سکے اور امت کے بہت سے آئمہ نے ان ہی کی رائے کو ترجیح دی۔ امام نوویؒ نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ۔

کانت من المهاجرات الاول ذات عقل وافر و کمال۔ (تہذیب الاسماء والصفات صـ۳۵۳ ج۲)

ترجمہ [وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے ابتدائی دور میں ہجرت کی تھی وہ زبردست عقل و کمال کی مالک تھیں۔]

حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ بڑے اونچے درجہ کی صحابیہ تھیں جن کی بزرگی کا ذکر حافظ ابن حجرؒ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

ومناقبها كثيرة شهيرة (تہذیب التہذیب ص ۴۷۲ ج ۱۲)

ترجمہ [ان کے فضائل ومناقب بہت زیادہ اور کافی مشہور ہیں۔]

امام نوویؒ ان کے متعلق شہادت دیتے ہیں۔

كانت من فاضلات الصحابيات۔

(تہذیب الاسماء والصفات ص ۳۶۳ ج ۲)

ترجمہ [علم وفضل رکھنے والی صحابیات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔]

اسی قسم کی شہادت امام نوویؒ نے ام عطیہؓ کے بارہ میں بھی دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

وهي من فاضلات الصحابيات والغازيات معهن مع رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

(تہذیب الاسماء والصفات ص ۳۶۴ ج ۲)

ترجمہ [ان کا شمار فضیلت وبزرگی رکھنے والی اور حضور اکرم کے ساتھ جہاد کرنے والی صحابیات میں ہوتا ہے۔]

ام عطیہؓ کی شاگرد حفصہ بنت سیرین بھی ہیں جو بارہ سال کی عمر ہی میں قرآنی علوم میں مہارت حاصل کر چکی تھیں۔ (یہ بصرہ کی رہنے والی ہیں۔) (تہذیب التہذیب ص ۴۱۰ ج ۱۲)

بصرہ ہی کے ایک مشہور قاضی اور فقیہ ایاس ابن معاویہؒ ان کے متعلق فرماتے ہیں۔

ما ادركت احدا افضله على حفصة۔ (ایضاً ص ۴۰۹ ج ۱۲)

ترجمہ [میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں پایا جسے میں حفصہؓ پر فضیلت دے سکوں۔]

تابعین میں امام سعید ابن المسیبؒ نے اپنی لڑکی کا عقد اپنے ہی ایک شاگرد سے کرا دیا تھا۔ شادی کے دوسرے دن وہ حلقہ درس میں شریک ہونے کی تیاری کرنے لگے تو صاحبزادی نے کہا۔

اجلس اعلمك علم سعيد۔ (المدخل لابن الحاج ص ۲۱۵ ج ۱)

ترجمہ [تشریف رکھئے، سعید ابن المسیبؒ جو آپ کو تعلیم دیتے ہیں میں اس کی تعلیم آپ کو یہیں دیدوں۔]

اسی طرح امام مالکؒ کی صاحبزادی کے علم وفضل کا یہ حال تھا کہ طالب علم اگر مؤطا پڑھتے ہوئے کہیں کوئی لغزش کرتے تو وہ اپنے کمرہ کے اندر سے دروازہ کھٹکھٹاتیں، امام موصوفؒ کو ان کے حافظہ پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ پڑھنے والے سے کہتے۔

ارجع فالغلط معك (ایضاً)

ترجمہ [دہراؤ تم غلطی کر رہے ہو۔]

غرض کہاں تک بیان کیا جائے حضرات صحابہ اور تابعین کے دور میں بے شمار خواتین گزری ہیں جن سے مسلمانوں کی بڑی تعداد نے تحصیل علم فرمائی۔ صحابہ میں حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ام سلمہ، حضرت صفیہ، حضرت ام سلیم کے نام سر فہرست ہیں۔ ان سے بڑے بڑے صحابہ کرام نے علمی استفادہ فرمایا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے تو حضرت عمرو ابن العاص، حضرت ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ ابن الزبیر، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ ابن عمر،

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم جیسے اکابرین صحابہ نے کسب فیض کیا ہے۔

عورتوں کی تحصیل علم پر کسی قسم کی کوئی قدغن عائد نہیں کی جا سکتی۔ آٹھویں صدی کے مشہور مالکی عالم علامہ ابن الحاج کا ارشاد ہے کہ۔

لو طلبت المرأۃ حقها فی امر دینها من زوجها و رفعته الی الحاکم و طالبته بالتعلیم لامر دینها لان ذالك لها اما بنفسه او بواسطة اذنه لها فی الخروج الی ذالك لوجب علی الحاکم جبره علی ذالك کما یجبره علی حقوقها الدنیویة اذا ان حقوق الدین آکد و اولیٰ۔

(المدخل لابن الحاج ص۲۷۷ ج۲)

ترجمہ [اگر عورت دین کے معاملہ میں اپنا حق شوہر سے طلب کرے اور حاکم کے پاس اس کے لئے مرافعہ کر دے اور اپنی دینی تعلیم کا اس سے مطالبہ کرے کیونکہ اس کا یہ حق ہے کہ یا تو شوہر خود اس کو تعلیم دے (اگر وہ اس کا اہل ہو) یا اس کو گھر سے باہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے۔ تو حاکم پر ضروری ہے کہ وہ شوہر کو اس مطالبہ کی تکمیل پر مجبور کرے جس طرح وہ دنیوی حقوق کے سلسلہ میں کرتا ہے۔ کیونکہ دینی حقوق زیادہ مؤکد اور زیادہ اہم ہیں۔]

امام فخرالدین حسن ابن منصور حنفی المتوفی ۲۹۵ھ نے باوجود شدت پسندی کے اپنے مشہور فتاویٰ میں اس مسئلہ پر یہ بحث فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

اذا ارادت المرأة ان تخرج الى مجلس العلم بغیر اذن الزوج لم یکن لها ذلك فان وقعت لها نازلة فسألت زوجها وهو عالم فاخبرها بذلك لیس لها ان تخرج بغیر اذنه۔ وان کان الزوج جاهلا وسأل عالما عن ذلك فکذلك وان امتنع الزوج عن السؤال کان لها ان تخرج بغیر اذنه لان طلب العلم فیما یحتاج الیه فرض علی کل مسلم ومسلمة فیقدم علی حق الزوج وان لم یقع لها نازلة وارادت ان تخرج الی مجلس العلم لتعلم مسائل الصلوٰة والوضوء فان کان الزوج یحفظ تلك المسائل ویذکر لها ذلك لیس لها ان تخرج بغیر اذنه فان کان الزوج لا یحفظ المسائل فالاولیٰ له ان یاذن لها بالخروج فان لم یاذن فلا شیٔ علیه۔

(فتاویٰ قاضی خاں المطبوعہ علیٰ فتاویٰ عالمگیریہ ص۲۴۳ ج۱)

ترجمہ: اگر عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کسی علمی مجلس میں شریک ہونا چاہے تو اس کو اس کا حق نہیں ہے۔ لیکن جب کوئی مسئلہ اسے پیش آجائے تو وہ اپنے شوہر سے دریافت کرے گی۔ اب اگر شوہر عالم ہو اور وہ خود ہی اس مسئلہ کو حل کر دے یا جاہل ہو اور وہ دوسروں سے تحقیق کر کے اسے بتادے تو اسے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں جانا چاہیئے۔ لیکن اگر شوہر تحقیق کر کے اس کو نہ بتلائے تو وہ بلا اجازت بھی کسی علمی مجلس میں جاکر دریافت کر سکتی ہے کیونکہ طلب علم ہر مسلمان مرد اور عورت دونوں پر فرض

ہے جبکہ وہ اس کے محتاج ہوں۔ اس لئے ایسی حالت میں طلب علم کو شوہر کے حق پر مقدم رکھا جائے گا۔ اگر عورت کو کوئی متعین مسئلہ تو در پیش نہ ہو البتہ وہ صلوٰۃ و وضو وغیرہ کے مسائل سیکھنے کے لئے کسی علمی مجلس میں شریک ہونا چاہے۔ اگر شوہر ان مسائل کو جانتا ہو اور وہ اسے سکھا بھی رہا ہو تو اسے گھر سے نہ نکلنا چاہئیے جب تک شوہر اس کی اجازت نہ دے لیکن اگر شوہر کو ان مسائل کا علم نہیں ہے تو بہتر یہ ہے کہ وہ اسے علمی مجلسوں میں شرکت کی اجازت دے دے اور کوئی مصلحت مانع ہو تو شوہر کو اس کا بھی حق ہے کہ وہ اسے باہر جانے کی اجازت نہ دے اور اس سے شوہر پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔]

فقہاء کی تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بیوی کو حصول علم سے روک سکے اور گھر سے باہر جانے کی اجازت نہ دے البتہ ہمارے فقہاء نے جو یہ قید لگائی ہے کہ وہ ایسا علم ہونا چاہیئے جس کا تعلق دین سے ہو اور اس کے فرائض و واجبات سے ہو جس کی بیوی کو ضرورت لاحق ہو اور شوہر خود اس مسئلہ کو حل نہ کر سکے یا کسی دوسرے عالم سے پوچھ کر اسے نہ بتا سکے یہ ہمارے فقہاء کرام نے ایک ایسی قید لگا دی ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴) اور طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ میں ہر مفید علم شامل ہے۔ کسی خاص علم کے ساتھ اسے مخصوص کر لینا زیادتی ہے۔ لیکن ہر مسلمان کو جو علم بھی وہ طلب کرے اس سے رضائے الٰہی اور خدمتِ اسلام و

مسلمین کی نیت ہونی چاہیئے۔ محض دولت کمانے، شہرت حاصل کرنے کے لئے اگر کوئی شخص کوئی دینی علم بھی حاصل کرے تو وہ بھی بجائے ثواب کے وبال کا باعث ہو جاتا ہے۔ اور رضائے الٰہی نیز خدمتِ اسلام و مسلمین کی نیت سے کوئی دُنیوی علم بھی حاصل کیا جائے تو وہ عبادت بن جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بار بار مَلَكُوتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں غور و فکر کی تاکید فرمائی گئی ہے جو خالص سائنس ہے لیکن حکم الٰہی کے ماتحت ان پر بھی غور و فکر کرنا اطاعت الٰہی کے ضمن میں آ جاتا ہے۔ لہٰذا دینی علوم اور دُنیوی علوم کی تقسیم و تمیز بے معنی ہے۔ انسانی نیت ہی فیصلہ کن ہو سکتی ہے کہ کونسے علم کا حصول دُنیوی کہا جائے اور کون سے علم کا حصول دینی کہا جائے۔ واللہ اعلم

(اجتماعی عبادات میں عورتوں کی شرکت)

قرآن کریم کی رو سے تمام عبادات اجتماعی حیثیت سے ادا کی جانی چاہئیں۔ صلوٰۃ۔ زکوٰۃ۔ حج وغیرہ تمام عبادتیں اجتماعی طور پر ہی ادا کی جاتی ہیں۔ صلوٰۃ کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝

(۲/۴۳)

ترجمہ [اور صلوٰۃ کو قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ مل کر رکوع کرو۔]

اس آیت کریمہ سے باجماعت صلوٰۃ ادا کرنے کی تاکید نکلتی ہے۔

اسی طرح ارشاد ہے۔

یَا مَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ○

(۳/۴۳)

ترجمہ [اے مریم تو اپنے رب کی فرمانبردار بن اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے ساتھ مل کر عبادت کر۔]

زکوٰۃ کے متعلق بھی ہم کتاب الزکوٰۃ جلد اول میں بتا چکے ہیں کہ انفرادی طور پر ہر شخص کا اپنی اپنی زکوٰۃ ادا کرنا قطعاً غیر اسلامی ہے۔ زکوٰۃ کو افراد سے وصول کرنا اور پھر اسے مستحقین میں تقسیم کرنا حکومت کا فریضہ ہے۔ حکومت کے ذریعہ سے جب اس کا انتظام ہو گا تو وہ اجتماعی طور پر ہی ہو گا۔ اسی لئے حضور اکرم کو بحیثیت سربراہ ریاست اس کے وصول کرنے کا حکم دیا گیا خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (۹/۱۰۳) حج تو ہے ہی ایک اجتماعی عبادت جو مخصوص ایام میں تمام مسلمان، مرد اور عورتیں اجتماعی طور پر ادا کرتے ہیں۔ ان تمام احکام کے مخاطب مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی ہیں۔ ایسا تو نہیں ہے کہ صلوٰۃ کی اقامت صرف مردوں کا فریضہ ہو اور عورتوں پر اقامت صلوٰۃ فرض نہ ہو یا زکوٰۃ صرف مردوں پر فرض ہوتی ہو اور عورتیں اس سے مستثنیٰ ہوں، حج صرف مردوں پر فرض ہوتا ہو اور عورتوں کو اس سے چھٹی دیدی گئی ہو۔ قرآن کریم نے ان عبادات کی ادائیگی کا طریقہ مقرر کر دیا ہے اس کے مخاطب مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی ہیں۔ لہٰذا کسی فریضہ سے عورتوں

کو الگ کر لینا منشائے قرآنی کے خلاف ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بے معنی تو نہیں ہے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے نقل فرمایا ہے کہ۔

اذا استأذنت احدکم امرأته الی المسجد فلا یمنعها۔

اور

لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ۔

(بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ [جب تم میں سے کسی سے اس کی بیوی مسجد جانے کی اجازت طلب کرے تو وہ اسے منع نہ کرے

اور

اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں جانے سے منع نہ کرو۔]

روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے جب یہ روایت بیان فرمائی تو ان کے ایک صاحبزادے بلالؓ کے منہ سے نکل گیا کہ بخدا ہم انہیں مسجدوں میں جانے سے ضرور روکیں گے۔ دوسرے بیٹے نے کہا کہ پھر تو عورتیں اس اجازت کو ایک بہانہ بنا لیں گی۔ تو حضرت ابن عمرؓ اس پر سخت ناراض ہوئے اور بیٹوں کو بہت سخت و سست کہا اور فرمایا کہ میں تمہیں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم سنا رہا ہوں۔ تم یہ کیسے کہتے ہو کہ ہم انہیں ضرور منع کریں گے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کو اتنا ناراض ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ

علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا تھا کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں ہم کنواری جوان لڑکیوں اور حیض آنے والی عورتوں سب کو عیدگاہ میں لے جائیں۔ جن عورتوں کو ایام آ رہے ہوں وہ صلوٰۃ عید سے الگ رہیں لیکن خوشی میں اور اجتماعی دعاؤں میں شریک رہیں اور تکبیرات کہتی رہیں۔ حضرت ام عطیہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے رسول اللہ! ہم میں سے بعض عورتوں کے پاس اوڑھنے کے لئے چادر نہیں ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ ایسی عورتوں کو ان کی بہنیں اپنی چادر اڑھا لیں۔ (صحاح ستہ)

عبداللہ ابن رواحہؓ کی ہمشیرہ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نطاق باندھنے والی (جوان عورت) پر عیدین کے لئے عیدگاہ تک جانا واجب ہے۔

(مسند احمد، موصلی، طبرانی کبیر)

بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ام عطیہؓ نے عرض کیا کہ وہ عورتیں بھی عیدگاہ میں حاضر ہوں جو ماہواری ایام سے ہوں تو آپ نے فرمایا "ہاں کیا ایام والی عورتیں عرفات کے میدان میں اور فلاں فلاں موقعوں پر حاضری نہیں دیتیں؟"

(بخاری کتاب العیدین۔ باب اذا لم یکن للمرأۃ جلباب)

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی عبادات کی مجالس اور علمی محافل میں خواتین بڑے ذوق و شوق کے ساتھ خاصی تعداد میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ حضرت خولہؓ بنت قیس الجہنیہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی آواز مبارک کی بلندی کا ذکر کرتے ہوئے

فرماتی ہیں۔

کنت اسمع خطبۃ رسول اللّٰہ یوم الجمعۃ وانا فی مؤخر النساء۔ (طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۲)

ترجمہ [جمعہ کے دن میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا خطبہ اچھی طرح سن لیتی تھی حالانکہ میں عورتوں کی صف میں سب سے اخیر میں ہوا کرتی تھی۔]

نیز حارثہ ابن النعمان کی ایک صاحبزادی فرماتی ہیں۔

ما حفظت قٓ الا من فی رسول اللّٰہ یخطب بھا کل جمعۃ۔

(صحیح مسلم کتاب الجمعہ۔ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ۔ باب الرجل یخطب علی قوس)

ترجمہ [میں نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان ہی سے سن کر سورۂ قٓ یاد کی تھی جسے آپ ہر جمعہ کے خطبہ میں پڑھا کرتے تھے۔]

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی خواتین کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رہتا تھا چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ۔

فظن انہ لم یسمع النساء فوعظھن وامرھن بالصدقۃ۔

(بخاری کتاب العلم باب عظۃ الامام النساء وتعلیمھن)

ترجمہ [حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ شاید آپ عورتوں کو اپنی بات نہیں سنا سکے تو آپ (عورتوں کے قریب تشریف لے گئے) اور انہیں نصیحت فرمائی اور انہیں صدقہ وخیرات کا حکم دیا۔]

ابن جریج نے عطاء تابعی سے دریافت کیا۔

اتری حقا علی الامام ذٰلک ویذکرھن۔

ترجمہ [کیا آپ کے خیال میں امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ عورتوں کو بھی وعظ و نصیحت کرے۔]

تو انہوں نے جواب دیا۔

انه لحق علیهم و مالهم لا یفعلونه۔

(بخاری کتاب العیدین باب موعظة الامام النساء یوم العید)

ترجمہ [بلاشبہ یہ ان کے لئے ضروری ہے، وہ کیوں ایسا نہیں کرتے؟]

اسلام نے عورتوں میں جو علمی ذوق و شوق پیدا کر دیا تھا اس کی تسکین جمعہ اور عیدین کے خطبات سے نہیں ہو سکتی تھی اس لئے گاہے گاہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم عورتوں کے خصوصی اجتماعات کو بھی خطاب فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ۔

قال النساء للنبی غلبنا علیك الرجال فاجعل لنا یوما من نفسك فوعدهن یوما لقیهن فیه فوعظهن وامرهن۔

(بخاری۔ کتاب العلم۔ باب ہل یجعل للنساء یوما علی حدة)

ترجمہ [عورتوں نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کے دربار میں ہمیشہ مردوں کا اژدحام رہتا ہے (اس وجہ سے ہم استفادہ نہیں کر پاتیں) لہٰذا آپ ہمارے لئے ایک مخصوص دن مقرر فرما دیجیئے۔ چنانچہ آپ ایک دن متعین فرما کر ان کے اجتماع میں تشریف لے گئے اور وعظ و نصیحت فرمائی اور انہیں احکام عطا فرمائے۔]

اسی نوعیت کا ایک واقعہ حضرت حذیفہؓ کی بہن نے نقل فرمایا ہے کہ۔

خطبنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فقال یا معشر النساء اما لکن فی الفضۃ ما تحلین ۔ اما انہ لیس منکن امرأۃ تحلی ذھبا تظھرہ الا عذبت بہ ۔ (مسند احمد ص ۳۵۷ ج ۶)

ترجمہ [حضورؐ نے ہمیں خطاب کر کے خطبہ میں ارشاد فرمایا۔ اے جماعتِ خواتین تمہیں چاندی کے زیورات میں رغبت کیوں نہیں ہے کہ انہیں استعمال نہیں کرتیں۔ سن لو۔ تم میں سے جو عورت بھی سونے کے زیورات پہن کر نمود و نمائش کرتی پھرے گی اسے عذاب ہی دیا جائے گا۔]

ان تمام روایات سے ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کی تعلیم و تربیت کا کس قدر اہتمام تھا۔ یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تو اللہ کے رسول تھے آپؐ کا فریضہ تھا کہ تمام لوگوں کو احکام الہٰی کی تبلیغ فرمائیں۔ لہٰذا جس طرح آپ مردوں کو احکام الہٰی کی تبلیغ فرمایا کرتے تھے عورتوں کو بھی تبلیغ فرمایا کرتے تھے۔ لیکن آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ جمعہ اور عیدین کے اجتماعات محض عبادات نہیں ہیں بلکہ تعلیم و تربیت کا بڑا موثر ذریعہ ہیں حضرت عطاء ابن ابی رباح کا ارشاد ہم نقل کر چکے ہیں کہ ہر امام کے لئے اس کا اتباع ضروری ہے۔

الغرض۔ ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی عبادات میں عورتوں کی شرکت کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا ہے۔ بعض تابعین اور بعد کے فقہاء نے فتنہ کے خوف سے

عورتوں کے اجتماعی عبادات میں شرکت کو ممنوع قرار دے دیا ہے لیکن ان کی نظر سے وہ حکمت غالباً اوجھل ہو گئی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نظر میں تھی۔ مساجد اور اجتماعی عبادت گاہیں ابتدائے عہد اسلام میں صرف عبادت ہی کی جگہ نہیں تھیں بلکہ وہ درس گاہیں اور تربیت گاہیں بھی تھیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی شرکت کو محض عبادت ہی کے لئے نہیں بلکہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بھی ان کی شرکت کو ضروری قرار دیا تھا۔ ہمارے علماء نے فتنہ سے حفاظت کے خیال سے ان کی تعلیم و تربیت کے دروازہ کو بھی بند کر دیا۔ جس سے طبقۂ نسواں کو بہت نقصان پہنچا۔ وہ فتنہ سے تو پتہ نہیں محفوظ ہوئیں یا نہیں ہوئیں لیکن علم و بصیرت سے یکسر محروم ہو گئیں۔ ہم نے "پتہ نہیں" اس لئے کہا ہے کہ تجربہ اس بات پہ شاہد ہے کہ جو عورتیں نیک سیرت ہوتی ہیں وہ اجتماعی عبادات میں شرکت کے سبب سے بے راہ نہیں ہو جاتیں اور جو عورتیں بد سیرت ہوتی ہیں وہ ہزار پردوں میں بھی گل کھلانے سے نہیں چوکتیں۔ لہٰذا ہمارے نزدیک ہمارے علماء کرام کی یہ تشدید کچھ فائدہ مند ہونے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہوئی۔

(عورت میدان عمل میں)

گذشتہ صفحات میں ہم نے بتایا ہے کہ اسلام نے اکتسابِ رزق

کی ذمہ داری مرد کے کاندھوں پر ڈالی ہے اور گھر کا اندرونی انتظام وانصرام، بچوں کی پرورش، ان کی غور و پرداخت وغیرہ عورتوں کے سپرد کی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتوں کے لئے اکتساب رزق کی جدوجہد کرنا ناجائز ہے۔ وہ صرف گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر بیٹھ جائیں اور اگر حق تعالیٰ نے انہیں بھی اکتساب رزق کی صلاحیت عطا فرمائی ہے تو وہ اس سے کام نہیں لے سکتیں یا کاروبارِ حیات میں عملی حصہ لینا ان کے لئے شجر ممنوعہ ہے۔

سورۂ نساء میں ہے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ○ (۴/۳۲)

ترجمہ [اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر (صلاحیتوں میں) جو برتری دے رکھی ہے ان کے متعلق تمنائیں نہ کیا کرو (کہ کاش مجھ میں بھی فلاں صلاحیت ہوتی) مرد جو کچھ کمائیں اس میں ان کا حصہ ہے اور عورتیں جو کچھ کمائیں اس میں ان کا حصہ ہے۔ اور (کوشش کرکے) اللہ سے اس کے فضل کے طلبگار رہو۔ یقیناً اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔]

اس آیت کریمہ میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ مرد بھی اکتساب رزق کریں اور عورتیں بھی اکتساب رزق کریں، مرد جو کمائیں وہ انہی کا ہے اور عورتیں جو کمائیں وہ انہی کا ہے۔ اور سب کو یہ حکم

ہے کہ دونوں ہی کوشش کریں اور اللہ سے اس کے فضل (سر و سامان رزق) کے طلبگار رہیں۔ بہر حال اکتسابِ رزق عورت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ لیکن وہ اکتساب رزق کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ لیکن مردوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کے لئے انہیں مجبور کریں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ جو کچھ وہ کمائیں گی وہ ان کے شوہر کی ملکیت نہیں ہو گا بلکہ وہ خود انہی کی ملکیت ہو گا۔ وہ اسے جہاں چاہیں خرچ کریں اور جسے چاہیں دیدیں۔

علامہ شبلی نعمانی حضرت زینب بنت جحش ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے حالات میں لکھتے ہیں کہ۔

نہایت قانع اور فیاض طبع تھیں۔ خود اپنے دست و بازو سے معاش پیدا کرتی تھیں اور اس کو خدا کی (اللہ کی) راہ میں لٹا دیتی تھیں۔ (سیرت النبی ص ۴۱۵ ج ۲) مطبوعہ نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد)

علامہ حسین عبد اللہ باسلامہ فرماتے ہیں کہ۔

وکانت زینب امرأة صناع الیدین فکانت تدبغ و تخرز وتتصدق بہ فی سبیل اللہ۔ (حیاۃ سید العرب ص ۲۴۳ ج ۴)

ترجمہ [اور حضرت زینب (رضی اللہ عنہا) ایک ایسی خاتون تھیں جو اپنے ہاتھوں سے چیزیں بناتی تھیں (صناع تھیں) چنانچہ چمڑا رنگ لیتی تھیں۔ چمڑہ میں پیوند لگا لیتی تھیں اور چمڑے کو سی لیتی تھیں اور جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا کرتی تھیں۔]

یہ تو خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کاشانۂ نبوی میں ایک معزز و محترم ام المؤمنین کا حال تھا۔ ان کے علاوہ دیگر صحابیات

بھی کسب معاش کرتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت جابر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری خالہ کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی (طلاق کے بعد عام حالات کے تحت ان کو اپنی عدت اُسی گھر میں پوری کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن عدت کے دوران ہی انہیں اپنے کچھ کھجور کے درخت کاٹنے اور فروخت کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور) انہوں نے گھر سے نکلنے کا ارادہ کیا تو ایک صاحب نے انہیں سختی سے منع کر دیا کہ اس مدت میں گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے تو وہ استفسارِ حال کے لئے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے جواب دیا کہ۔

اخرجی فجذی نخلک لعلک ان تصدقی منہ او تفعلی خیرا۔

(ابوداؤد۔ کتاب الطلاق باب فی المبتوتۃ تخرج بالنہار ورواہ مسلم وابن ماجۃ ایضاً)

ترجمہ [کھیت میں جاؤ اور اپنے کھجور کے درخت کاٹ لو (اور فروخت کر لو) اس رقم سے بہت ممکن ہے کہ تم صدقہ وخیرات کر دیا اور کوئی بھلائی کا کام کر سکو۔]

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ کی خالہ کو اپنے درخت کاٹنے، انہیں فروخت کرنے کی اجازت دی اور ساتھ ہی صدقہ وخیرات کرنے اور بھلائی کے کاموں میں حاصل شدہ رقم کو صرف کرنے کی ترغیب بھی دی۔

سہل ابن سعدؓ ایک اور خاتون کا ذکر کرتے ہیں جن کی اپنی کھیتی تھی اور وہ پانی کی نالیوں کے اطراف چقندر کی کاشت

کیا کرتی تھیں۔ جمعہ کے دن سہل ابن سعدؓ اور بعض دیگر صحابہ ان سے ملاقات کے لیئے جاتے تو وہ چقندر اور آٹے سے تیار کرکے حلوہ انہیں کھلایا کرتی تھیں۔ (بخاری، کتاب الجمعۃ باب قول اللہ عزوجل فاذا قضیت الصلوٰۃ الآیۃ)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اپنے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے میرا نکاح ہو چکا تھا۔ لیکن ان کے پاس ایک پانی لادنے والے اونٹ اور ایک گھوڑے کے سوا نہ تو کسی قسم کا اور کوئی مال تھا، نہ خادم نہ اور کوئی چیز (ابتداء ہجرت کا واقعہ ہے) میں خود ہی ان کے گھوڑے کو چارہ دیتی، پانی پلاتی اور اس کا ڈول بھرتی۔ گھر کا کام کاج بھی خود ہی کرتی تھی۔ مجھے خود ہی آٹا گوندھنا اور روٹی پکانا پڑتی تھی۔ پاس پڑوس میں کچھ مخلص انصار عورتیں اکثر میری روٹی پکا دیا کرتی تھیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے میرے مکان سے دو میل دور ایک زمین عطا فرمادی تھی تاکہ وہ اس میں کاشت کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ میں اس زمین سے کھجور کی گٹھلیاں جمع کرکے لایا کرتی تھی۔ ایک دن میں اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیوں کی ٹوکری رکھے ہوئے آرہی تھی۔ راستہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوگئی۔ آپ نے مجھے آواز دی تاکہ اپنی سواری پر مجھے بٹھادیں۔ لیکن چونکہ آپ کے ساتھ انصار کے دوسرے آدمی بھی تھے اس لئے مجھے مردوں کے ساتھ چلنے میں شرم محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی حضرت زبیرؓ یاد آگئے کہ وہ انتہائی غیور

انسان ہیں۔ اسے پسند نہیں کریں گے۔ چنانچہ میں پس و پیش کرنے لگی تو حضورؐ نے بھانپ لیا اور آگے بڑھ گئے۔

(بخاری۔ کتاب النکاح، باب الغیرۃ)

ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ کاروبار حیات میں عورتوں کے لئے عملی جدوجہد کرنے میں کوئی قانونی رکاوٹ یا پابندی نہیں ہے۔ عورتیں صدر اول میں ان میں حصہ لیتی رہی ہیں اور آج بھی حصہ لے سکتی ہیں۔

(عورت میدان وغا میں)

صرف کاروبار حیات ہی میں نہیں بلکہ مسلمانوں کی مسلح جدوجہد میں بھی عورتوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ وہ اس میں حصہ نہ لے سکیں۔ البتہ ان کے لئے عام حالات میں مسلح جدوجہد میں حصہ لینا ضروری نہیں ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی سیرت النبی میں رقم طراز ہیں۔

اس غزوہ (یعنی غزوۂ خیبر) میں چند خواتین بھی خود اپنی خوشی سے ساتھ ہو لی تھیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپؐ نے ان کو بلا بھیجا اور ان کے بلا اجازت آنے پر غضب کے لہجہ میں فرمایا کہ تم کس کے ساتھ آئیں اور کس کے حکم سے آئیں۔ بولیں کہ یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) ہم اس لئے آئے ہیں کہ چرخہ کات کر کچھ پیدا کریں گے اور اس کام میں مدد دیں گے۔ ہمارے

پاس زخمیوں کے لئے دوائیں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ہم تیر اٹھا اٹھا کر لائیں گے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فتح کے بعد جب مال غنیمت تقسیم کیا تو ان کا بھی حصہ لگایا۔ لیکن یہ حصہ کیا تھا؟ زر وجواہر نہیں تھے۔ مال واسباب نہ تھا۔ درہم ودینار نہ تھے بلکہ صرف کھجوریں تھیں۔ تمام مجاہدین کو یہی ملا تھا اور ان پردہ نشینوں نے بھی یہی پایا تھا۔

اس واقعہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ناراضگی کے ساتھ خواتین سے دریافت فرمانا کہ "تم کس کے ساتھ آئیں اور کس کے حکم سے آئیں؟" اس لئے نہیں تھا کہ ان کے لئے جنگ میں حصہ لینا ممنوع تھا بلکہ اس لئے تھا کہ وہ بغیر اطلاع اور بغیر اجازت کے آگئی تھیں جو فوجی نظم وضبط اور ڈسپلن کے خلاف تھا۔ کہ کمانڈر کو معلوم بھی نہ ہو کہ عورتیں بھی ساتھ ہیں اور عورتیں فوج کے ساتھ لگ لیں۔

یہ واقعہ ابوداؤد (باب المرأة والعبد یحذماں من القیمۃ) میں مذکور ہے۔ حدیث اور سیرت کی تمام کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر غزوات میں مستورات ساتھ رہتی تھیں جو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں، جنگ احد میں حضرت عائشہؓ کا مشک میں پانی بھر بھر کر لانا اور زخمیوں کو پلانا اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ لیکن یہ امر کہ عورتیں میدان جنگ سے تیر اٹھا اٹھا کر بھی لاتی اور مجاہدین کو دیتی تھیں۔ صرف ابوداؤد نے ذکر کیا ہے لیکن سند صحیح اور متصل سے ذکر کیا ہے۔ اس لئے شک کی گنجائش نہیں۔ یوں

بھی عرب کی مستورات سے کم سے کم یہی توقع کی جا سکتی ہے۔"
(سیرت النبی صفحہ ۴۸۲-۴۸۳ ج ۱ مطبوعہ مطبعہ معارف شہر اعظم گڑھ طبع چہارم)

صحیح بخاری میں ہے کہ جنگ احد میں جب کافی مسلمان زخمی ہو گئے تو دوسری مسلم خواتین کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی اپنی پیٹھ پر مشکیں اٹھا اٹھا کر لاتیں اور زخمی لوگوں کے منہ میں پانی ڈالتی تھیں۔ جب مشکیں خالی ہو جاتیں تو پھر جا کر انہیں بھر لاتیں۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی و باب مناقب ابی طلحۃ و کتاب الجہاد و صحیح مسلم کتاب الجہاد باب غزوۃ النساء مع الرجال عن انس رضی)

نیز بخاری ہی میں ہے کہ جنگ احد کے موقعہ پر حضرت فاطمہ رضی بھی میدان جنگ میں پہنچ گئیں۔ اس جنگ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک زخمی ہو گیا تھا۔ حضرت فاطمہ رضی نے زخم کو دھویا لیکن جب پانی ڈالنے سے خون بند نہیں ہوا بلکہ اور بڑھ گیا تو حضرت فاطمہ رضی نے چٹائی کا ایک ٹکڑا جلا کر اس کی راکھ کو زخم میں بھر دیا۔ راکھ بھرنے کے بعد خون نکلنا بند ہو گیا۔
(صحیح بخاری کتاب المغازی باب غسل المرأۃ اباہا الدم و کتاب الجہاد باب المجن و باب لبس البیضۃ۔ و صحیح مسلم کتاب الجہاد و غزوۂ اُحد عن سہل رضی)

نیز بخاری و مسلم ہی میں ہے۔
حضرت ام سلیم رض جنگ احد میں شریک تھیں وہ اپنی پیٹھ پر

مشکیں اُٹھا اُٹھا کر لاتی تھیں اور زخمی لوگوں کے منہ میں ڈالتی تھیں۔

(صحیح بخاری کتاب المغازی والواب المناقب۔ مناقب ابی طلحہ وصحیح مسلم کتاب الجہاد باب غزوۃ النساء مع الرجال)

نیز یہ کہ۔

جنگ حنین میں اسلامی لشکر کے ساتھ حضرت ام سلیمؓ بھی ایک خنجر لے کر میدان میں پہنچ گئیں ان کے شوہر ابو طلحہؓ نے انہیں دیکھا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول یہ ام سلیمؓ بھی آگئیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلیمؓ سے پوچھا۔ یہ خنجر کیسا ہے؟ حضرت ام سلیمؓ نے عرض کیا اگر کوئی مشرک میرے قریب آئے گا تو اس خنجر سے اس کا پیٹ چاک کردوں گی یہ سن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسکرائے۔

(صحیح مسلم کتاب الجہاد باب غزوۃ النساء مع الرجال عن انسؓ)

نیز یہ بھی کہ۔

حضرت ربیّع (بنت معوذ) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتی تھیں۔ لوگوں کو پانی پلاتی تھیں۔ ان کی خدمت کرتی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور زخمیوں اور مقتولین کو مدینہ منتقل کرتی تھیں۔

(صحیح بخاری کتاب الجہاد باب مداواۃ النساء الجرحیٰ و باب ردّ النساء الجرحیٰ والقتلیٰ)

نیز صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اکثر ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا کے ہاں جایا کرتے تھے۔

(حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی رضاعی خالہ تھیں) جب آپ ان کے ہاں جاتے تو وہ آپ کو کھانا کھلاتیں۔ ایک دن رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں گئے۔ حسب معمول کھانا کھا کر آپ سو گئے۔ جب آپ بیدار ہوئے تو مسکرا رہے تھے۔ حضرت ام حرامؓ نے پوچھا۔ اے اللہ کے رسولؐ! "آپ کیوں مسکرا رہے ہیں؟" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" میری امت کے کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے پیش کئے گئے۔ گویا وہ تخت نشین بادشاہ ہیں۔ یہ میری امت کا پہلا لشکر ہے جو سمندر میں جہاد کرے گا۔ ان کے لئے جنت واجب ہو گئی" حضرت ام حرامؓ نے عرض کیا" اے اللہ کے رسولؐ! اللہ سے دعاء کیجئے کہ مجھے ان لوگوں میں شامل کر دے" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعاء فرمائی اور پھر سو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ پھر مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے۔ حضرت ام حرامؓ نے پھر وجہ پوچھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" میری امت کے کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے پیش کئے گئے۔ گویا وہ تخت نشین بادشاہ ہیں۔ یہ میری امت کا پہلا لشکر ہے جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا۔ ان سب کی مغفرت ہو گئی" حضرت ام حرامؓ نے پھر دعاء کی درخواست کی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" تم پہلے لشکر میں ہو" اس واقعہ کے بعد حضرت ام حرامؓ نے عبادۃ ابن الصامت سے نکاح کیا اور ان کے ہمراہ حضرت معاویہؓ کی کمان میں سمندر کے جہاد میں شریک ہوئیں۔ واپسی میں وہ اپنی سواری سے گر پڑیں اور ان کا

انتقال ہو گیا۔

(صحیح بخاری ۔کتاب الجہاد۔ باب الدعاء بالجہاد، وباب فضل من یصرع وباب غزوۃ المرأۃ فی البحر وباب رکوب البحر وباب ماقیل فی قتال الروم وصحیح مسلم کتاب الامارۃ باب فضل الغزو فی البحر)

غور فرمائیے، جہاد اور وہ بھی سمندر پار کرکے، زندگی کا سب سے زیادہ صبر آزما اور ایثار و قربانی کا طالب عمل، اس میں ایک عورت کی شرکت کی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم دعاء فرمار ہے ہیں۔ اور وہ دعاء قبول بھی ہوتی ہے۔ حالانکہ جہاد اس پر فرض بھی نہیں ہے۔ اس سے اسلام کے مزاج اور رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ عورت اجتماعی سرگرمیوں سے بالکل ہی کنارہ کش رہے اور اپنے دائرہ سے باہر کبھی کوئی کام انجام نہ دے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کامیاب سماجی جدوجہد جن صفات کا تقاضا کرتی ہے۔ مثلاً جفاکشی، سادگی اور استقلال وغیرہ فطری طور پر عورت کے اندر ان کی کمی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ صفات پیدا ہی اس وقت ہوتی ہیں جب انسان کو مخالف قوتوں سے تصادم اور کشمکش کرنی پڑے لیکن چونکہ عورت عائلی زندگی سے تعلق کی بناء پر کشمکش سے دور رہتی ہے۔ اس لئے مشکل ہی سے اس کے اندر یہ صفات پیدا ہو پاتی ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس گھر کی پرسکون زندگی اس کے اندر آسانی سے تکلف و تصنع، عیش وراحت نازک طبعی اور غیر مستقل مزاجی جیسی خصوصیات کو ابھارتی ہے۔

اسلام نے کوشش کی ہے کہ یہ مذموم عادات اس کے اندر راہ نہ پانے پائیں اور وہ اس قابل ہو سکے کہ زندگی کے شدائد کا استقلال کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ اسی غرض سے شریعت نے اسے پُرمشقت اور سادہ زندگی کی تعلیم بھی دی ہے۔

اسلامی تاریخ نے ایسی بے شمار خواتین کے بہادرانہ کارناموں کو اپنے اوراق میں محفوظ رکھا ہے جو ہماری تاریخ کا ایک زریں باب ہیں اور جن پر مسلمان خواتین بجا طور پر فخر کر سکتی ہیں۔

ایک انصاری خاتون حضرت ام عمارہؓ کا نام نامی ہمیشہ یادگار رہے گا جنہوں نے جنگ احد میں مردوں کی سی شجاعت بے باکی اور ثبات قدمی کا مظاہرہ فرمایا۔ سعد بن ربیع کی صاحبزادی ام سعد نے ان سے اس کارنامہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ وہ صبح سویرے ہی مجاہدین کی خدمت کے لئے میدان کارزار میں پہنچ گئی تھیں۔ ابتدا میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا لیکن بعد میں جب فتح و نصرت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو ان میں افراتفری اور انتشار پھیل گیا۔ اس وقت میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ کر آپ کی مدافعت میں تیر اور تلوار چلانے لگی۔ یہاں تک کہ دشمن کی ضرب مجھ پر آن پڑی۔ ام سعد کہتی ہیں کہ میں نے ان کے کندھے پر بہت ہی گہرے زخم کا نشان دیکھا اور پوچھا "کس نے آپ پر اتنا سخت حملہ کیا تھا؟" انہوں نے جواب دیا۔ ابن قمہ نے۔ خدا اسے غارت کرے۔ جب مسلمان اپنی صفیں ٹوٹنے کی وجہ سے حضورؐ کے پاس سے منتشر ہو گئے تو وہ چلاتا ہوا آیا۔ بتاؤ، محمد

(صلے اللہ علیہ وسلم) کہاں ہے؟ اگر وہ اس جنگ میں بچ گیا تو میری ہلاکت اور موت ہے۔" یہ سن کر میں اور مصعب ابن عمیرؓ اور چند دوسرے اصحابؓ نے جو آپ کے ساتھ جمے ہوئے تھے اس کا سامنا کیا۔ اس مقابلہ میں اس نے مجھ پر وار کیا جس کا نشان تم دیکھ رہی ہو۔ میں نے بھی تلوار سے کئی ایک حملے اس پر کئے۔ لیکن وہ دشمنِ خدا دو زرہیں پہنے ہوئے تھا۔

(سیرت ابن ہشام صفحہ ۲۹-۳۰/۳ و طبقات ابن سعد صفحہ ۳۰۱/۸)

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں انہوں نے جس ہمت اور پامردی کا ثبوت دیا تھا اس کی شہادت خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دی تھی۔

ما التفتُّ یمینا ولا شمالا الا و انا اراها تقاتل دونی۔

ترجمہ [دائیں بائیں جس طرف بھی میں رخ کرتا تھا ام عمارہؓ کو میں اپنی مدافعت میں لڑتے دیکھتا تھا۔]

ان کے صاحبزادے کو ایک شخص نے گھائل کر دیا۔ جب اس کا ادھر سے گذر ہوا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ام عمارہؓ کو بتایا۔" یہ ہے وہ شخص جس نے تمہارے بیٹے کو زخمی کیا ہے۔" یہ سنتے ہی وہ اس پر ٹوٹ پڑیں اور اتنی زور سے تلوار چلائی کہ وہ وہیں گر پڑا۔ حضورؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔" ام عمارہؓ! تم نے اپنے بیٹے کا بدلہ لے لیا۔" خود کہتی ہیں کہ اس کے بعد ہم اس پر مسلسل تیر برسانے لگے یہاں تک کہ اس کو ختم کر کے چھوڑا۔ یہ دیکھ کر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" خدا کا شکر ہے کہ

اس نے تمہیں اس پر غلبہ عطا کیا اور تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی اور تمہارے لڑکے کا بدلہ تمہیں دکھادیا۔"

ایک واقعہ بیان کرتی ہیں کہ ایک شہسوار آگے بڑھتے ہوئے آیا اور مجھ پر وار کیا۔ میں نے ڈھال پر اس کو روک کر ناکام بنادیا۔ جب وہ پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگا تو میں نے اس کے گھوڑے پر حملہ کرکے اس کے پاؤں کاٹ دیئے، وہ پشت کے بل گر پڑا۔ حضورؐ اسے ملاحظہ فرما رہے تھے۔ آپ نے میرے لڑکے کو آواز دی "ام عمارہؓ کے بیٹے! جاؤ اپنی ماں کی مدد کرو" چنانچہ وہ دوڑا ہوا آیا اور اس کی مدد سے میں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس دن ان کی ثابت قدمی اور استقلال کو دیکھ کر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

لمقام نسیبۃ بنت کعب الیوم خیر من مقام فلان وفلان۔

ترجمہ [آج نسیبہ بنت کعب (ام عمارہؓ) کی ثابت قدمی اور استقلال فلاں اور فلاں سے بھی بہتر ہے۔]

احد کے علاوہ انہوں نے خیبر، حنین اور یمامہ کی جنگ میں بھی شرکت فرمائی تھی۔ یمامہ کی جنگ میں لڑتے لڑتے ان کا ایک ہاتھ شہید ہوگیا۔ اس کے علاوہ تلواروں اور نیزوں کے بارہ زخم ان کے بدن پر دیکھے گئے۔

(ان تمام تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۳۰۱ تا ۳۰۴ یمامہ کی شرکت کا ذکر ابن عبدالبر نے بھی الاستیعاب میں کیا ہے۔)

رومیوں سے مسلمانوں کی جنگ میں حضرت عکرمہؓ ابن ابی جہل

کی بیوی ام حکیمؓ بھی شریک تھیں۔ اجنادین کی لڑائی میں حضرت عکرمہؓ شہید ہو گئے۔ عدت گزارنے کے بعد مرج صفر نامی ایک مقام پر ان کا نکاح حضرت خالد ابن سعیدؓ سے ہو گیا۔ نکاح کے دوسرے دن خالد ابن سعیدؓ نے ولیمہ کی دعوت کی۔ ابھی لوگ ولیمہ کا کھانا کھا ہی رہے تھے کہ رومیوں نے صف بندی شروع کر دی۔ جب گھمسان کا رن پڑا تو ام حکیمؓ جن پر اب تک عروسی کے آثار نمایاں تھے اپنے خیمے کا ایک ڈنڈا لے کر میدان میں کود پڑیں اور دشمن کے سات افراد کو اس دن موت کے گھاٹ اتار دیا۔

(الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرۃ ام حکیمؓ)

اسماء بنت یزیدؓ کے ہاتھ سے جنگ یرموک میں نو رومیوں کو موت کا پیالہ پینا پڑا۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابہ صفحہ ۲۲۵)

ایک انصاری خاتون ام حارثؓ کی ثابت قدمی ملاحظہ ہو کہ جنگ حنین میں اسلامی فوج کے قدم میدان سے اکھڑ چکے ہیں۔ لیکن یہ چند با ہمت نفوس کے ساتھ پہاڑ کی طرح اپنے مقام پر جمی ہوئی ہیں۔ (الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرہ ام حارثؓ)

غزوۂ خندق میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو ایک قلعہ میں رکھ چھوڑا تھا تاکہ وہ محفوظ رہ سکیں۔ لیکن اس کے باوجود یہود تاک لگائے مسلسل قلعہ کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ چنانچہ ایک یہودی موقعہ پا کر قلعہ پر چڑھ ہی گیا۔ حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ قلعہ کے اندر موجود تھیں۔ وہ آگے بڑھیں اور اس بدباطن کا سر قلم کر کے نیچے جہاں اس کے دوسرے ساتھی موجود

تھے، پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر وہ بالکل حیران وششدر رہ گئے اور کہنے لگے کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اتنا غافل نہیں کہ عورتوں کو بے یارومددگار چھوڑ دے۔ قلعہ میں یقیناً کوئی شجاع اور جری دستہ موجود ہے جو ہمارے ارادے کو ناکام بنا سکتا ہے۔

(مستدرک حاکم صفحہ ۵۰-۵۱ جلد ۴)

ان تمام واقعات سے ظاہر ہے کہ عورتیں میدان جنگ میں بھی شریک ہو سکتی ہیں۔ اسلام نے اس سلسلہ میں ان پر کوئی پابندی عائد نہیں فرمائی۔ (اس موضوع پر مفصل گفتگو آگے آرہی ہے۔

(عورت سربراہِ خانہ)

ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ اسلام نے اندرون خانہ انتظام والنصرام کا فریضہ عورت کے سپرد کیا ہے اور بیرون خانہ اکتساب رزق کی جدوجہد کا فریضہ مردوں کے ذمہ رکھا ہے۔ چنانچہ بچوں کی پرورش، ان کی غورو پرداخت، ان کو دودھ پلانا، عورت ہی کی ذمہ داری ہے۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ (۲/۲۳۳)

ترجمہ [اور مائیں ہی اپنے بچوں کو دودھ پلائیں۔]

دودھ پلانا سب سے پہلی پرورش کی منزل ہے۔ اس کے بعد کی منزلیں بھی عورت ہی کی ذمہ داری ہے جبتک بچہ اس قابل نہ ہو جائے

کہ وہ اپنے کام خود کر سکے۔ (حضانت کا باب دیکھیئے) قرآن کریم نے عورتوں کو گھروں کی محافظ و نگراں قرار دیا ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (۴/۳۴)

ترجمہ [تو نیک اور صالح عورتیں فرمانِ الٰہی کو ماننے والی اور (شوہر کی) پسِ پشت حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں اللہ کی حفاظت سے۔]

اصل حفاظت تو اللہ تعالے ہی کی ہے۔ لیکن گھر کی محافظ و نگراں ظاہری طور پر عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ کیونکہ مرد، اپنی اکتسابِ رزق کی جدوجہد کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ہر وقت گھروں میں نہیں رہتے۔ مردوں کی غیر حاضری میں گھر کے ساز و سامان اور اولاد کی نگرانی اور حفاظت عورتوں ہی کی ذمہ داری ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے کہ۔

والمرأة راعية على اهل بيت زوجها وولده وهي مسئولة عنهم۔

(بخاری کتاب الاحکام باب قول اللہ تعالیٰ اطیعوا اللہ الخ وابوداؤد کتاب الخراج والفیٔ والامارۃ باب مایلزم الامام من حق الرعیۃ)

ترجمہ [اور عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کی اولاد کی نگراں ہے اور ان کے متعلق اسی سے باز پرس ہونی ہے (کہ اس نے کہاں تک ان کے حقوق کا خیال رکھا تھا)] اس کا فرض ہے کہ ان کے حقوق اور مفادات کی نگہداشت کرے اور ان کو راہِ راست پر چلائے، اور غلط روی سے باز رکھے اور ان کے نفع و ضرر اور سود و زیاں کی اس طرح نگرانی کرے جس طرح ایک چرواہا جنگل میں بھیڑوں کی

کرتا ہے (دَاعِیَۃٌ۔ دَاعِیٌ کا مؤنث ہے۔ داعی کے اصل معنی چرواہے ہی کے ہوتے ہیں) عورت کا فرض یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اس دولت اور ساز و سامان کی بھی محافظ اور امین ہے جو شوہر نے اس کے تصرف میں دیا ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صالح بیوی کی یہ صفت بیان فرمائی ہے۔

وان غاب عنها نصحته فی نفسها و ماله۔

(ابن ماجہ، ابواب النکاح۔ باب فضل النساء)

ترجمہ [اگر شوہر نگاہوں سے اوجھل ہو تو اپنے نفس (عصمت و عفت) اور اس کے مال کے معاملہ میں اس کے ساتھ خیر خواہی کرتی ہے۔]

عورت کے یہ فرائض، فکر و عمل کی آزادی کا جس حد تک مطالبہ کرتے ہیں، شریعت نے اس حد تک اس کو اپنی صوابدید کے مطابق کام کرنے کی آزادی بھی دی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت ہندؓ بنت عتبہ نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے اپنے شوہر حضرت ابوسفیانؓ کی (جو حضورؐ کے خسر بھی تھے) شکایت کی کہ وہ روپیہ پیسہ کے معاملہ میں ہاتھ روکے رہتے ہیں اور میرے اور میری اولاد کے تمام اخراجات پورے نہیں کرتے۔ اپنی ضروریات کی تکمیل کی سوائے اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ میں ان کے علم و اطلاع کے بغیر ہی ان کا مال لے لیا کروں حضورؐ نے فرمایا، دستور کے مطابق تم اپنی اور اپنی اولاد کے حسب ضرورت ان کی دولت صرف کر سکتی ہو۔

(بخاری کتاب النفقات، باب اذا لم ینفق الرجل فللمرأۃ ان یاخذ بغیر علمہ بقدر ما یکتفیہا و ولدہا بالمعروف ومسلم، کتاب الاقضیۃ

باب قضیۃ ہند)

ایک خاص حد کے اندر اس کو شوہر کے مال سے صدقہ وخیرات کا بھی حق ہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ۔

اذا انفقت المرأۃ من بیت زوجھا غیر مفسدۃ کان لھا اجرما انفقت وللزوج اجرما اکتسب۔

(بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ مسلم کتاب الزکوٰۃ۔ ابو داؤد۔ کتاب الزکوٰۃ، باب المرأۃ تتصدق من بیت زوجہا واللفظ لہ)

ترجمہ [جب عورت اپنے شوہر کے گھر سے خرچ کرتی ہے، غلط طریقہ پہ نہیں (بلکہ جائز حدود میں) تو اس کو اس خرچ کا اجر ملتا ہے اور شوہر کو اس کے کمانے کا اجر ملتا ہے۔]

خانگی زندگی میں عورت کی صلاحیتوں پر شریعت کے اعتماد کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ اس کو اولاد کے سن شعور کو پہنچنے تک ان کی پرورش اور نگہداشت کے لئے مردوں سے زیادہ اہل اور موزوں سمجھتی ہے۔

ایک صحابی نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی۔ اس بیوی سے ان کا ایک بچہ بھی تھا اور وہ اس بچہ کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن بچہ کی ماں نے حضورؐ سے اس کے خلاف شکایت کی تو آپ نے فرمایا۔

انت احق بہ مالم تنکحی۔

(ابو داؤد کتاب الطلاق۔ باب من احق بالولد۔ ومستدرک حاکم ج۲ ص۲۰۷)

ترجمہ [تو اس کی زیادہ حق دار ہے جب تک تو دوسرا نکاح نہ کرلے۔]

اس حدیث کی شرح میں علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں۔

فیہ دلیل علیٰ ان الام اولیٰ بالولد من الاب مالم یحصل مانع من ذالک کالنکاح وھو مجمع علیٰ ذالک۔ (نیل الاوطار ص۱۳۹ ج۷)

ترجمہ [اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ ماں، باپ سے زیادہ بچہ کی حقدار ہے جبتک کہ کوئی حقیقی رکاوٹ نہ پیدا ہوجائے مثلاً ماں دوسرا نکاح کرلے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر سب کا اجماع ہے۔]

علامہ بدرالدین کاشانیؒ فرماتے ہیں۔

الاصل فیھا النساء لانھن اشفق وارفق واھدی الی تربیۃ الصغار۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ص۴۱ ج۴)

ترجمہ [حضانت کا اصلاً حق عورتوں ہی کو حاصل ہے۔ کیونکہ وہ مردوں کے مقابلہ میں زیادہ شفیق اور زیادہ مہربان ہوتی ہیں۔ اور کم سِنوں کی تربیت کا سلیقہ اور صلاحیت ان میں زیادہ ہوتی ہے]

(عورت کی رائے اور مشورہ)

عورت بھی انسان ہے بلکہ انسان کا نصف لطیف ہے۔ وہ اسلامی معاشرہ سے نہ الگ ہے نہ الگ رہ سکتی ہے۔ معاشرہ کا مفاد اس کا اپنا مفاد اور معاشرہ کا نقصان اس کا اپنا نقصان ہے۔ وہ معاشرہ کو خیر کی بنیادوں پر قائم رکھنے میں مدد دے سکتی ہے تو لازماً شر کی راہ پر لئے جانے کی مخالفت اور مزاحمت بھی کرسکتی ہے بھلائیوں کا خیر مقدم کرسکتی ہے تو برائیوں پر احتجاج کرنا بھی اس کا حق ہے۔ وہ خاموش تماشائی نہیں بن سکتی کہ مرد جو چاہیں کرتے

رہیں اور وہ اُف تک نہ کرے۔ یہ اس کا فطری حق ہے کہ وہ معاشرہ کی بھلائی اور برائی میں اپنی رائے دے، یہ حق اجتماعی زندگی نے اس کو عطا کیا ہے اور شریعت اس کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے۔ وہ زندگی کے مختلف معاملات میں خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی اس کو اپنے جذبات و احساسات۔ رائے اور خیال، پسند اور ناپسند کے اظہار کی اجازت عطا کرتی ہے۔ یہ اظہار اپنے حدود کے اندر زبان و بیان، تحریر و انشاء غرض جس ذریعہ سے بھی ہو شریعت اس پر کوئی قدغن نہیں لگاتی۔

قرآن کریم کا عام اصول ہدایت ہے کہ۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ان کے تمام معاملات مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے طے ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی شامل ہیں۔ اور دونوں ہی اس ہدایت کے مخاطب ہیں۔

اسی طرح ارشاد ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ..... (پ ۹)

اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں وہ نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بُری باتوں سے روکتے ہیں۔

اس ارشادِ الٰہی کی رو سے بھی مسلمان مرد و عورت سب کا یہ فریضہ ہے کہ وہ معاشرہ کی انفرادی و اجتماعی بھلائی کے لئے تمام اقدامات کریں۔

جہاں تک اس کے ذاتی مسائل کا تعلق ہے، مثلاً نکاح، خلع وغیرہ تو ان کے متعلق قرآن نے صاف اور واضح الفاظ میں تبلادیا ہے کہ کوئی شخص اس پر اپنا فیصلہ ٹھوپ نہیں سکتا جو بھی اقدام کیا جائے گا اس کی رضا اور خوشی کے بعد کیا جائے گا۔

(ملاحظہ ہو فقہ القرآن جلد اول و دوم)

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے۔

لا تنکح الایم حتی تستأمر ولا تنکح البکر حتی تستاذن۔

(بخاری۔ کتاب النکاح، باب لاینکح الاب وغیرہ البکر والثیب الابرضاہا)

ترجمہ [شادی شدہ عورت کا نکاح (بیوگی یا طلاق کے بعد) اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک اس سے مشورہ نہ لیا جائے اور دوشیزہ کا نکاح بھی اس کی اجازت کے بغیر نہیں کیا جا سکتا]

ایک دوسری روایت میں ہے۔

لا تنکحوا الیتامیٰ حتی تستامروھن۔

(دارقطنی۔ کتاب النکاح ص۳۸۵)

ترجمہ [یتیم لڑکیوں کا نکاح ان کی رائے اور مشورہ لئے بغیر نہ کرو]

یتامیٰ کا لفظ اس حدیث میں بہت ہی قابل لحاظ ہے۔ شفیق و مہربان اور خیرخواہ باپ کے نہ ہونے کی صورت میں بہت ممکن ہے کہ کوئی ظالم سرپرست بے آسرا لڑکی کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بنالے اور شریعت نے اسے اپنے متعلق فیصلہ کرنے کا جو حق دیا ہے اس سے محروم کر دے۔ اس لئے خصوصی طور پر اس سے رائے اور مشورہ کی ہدایت فرمائی گئی ہے تاکہ ہر حال میں عورت اپنی مرضی کی آپ

مالک رہے۔ چنانچہ جب کبھی اس کی مرضی کے خلاف کوئی اقدام کیا گیا تو حضورؐ نے اسے بدل کر رکھ دیا۔ ایک صاحب نے اپنی لڑکی کا نکاح ایک مالدار شخص سے کر دیا لیکن لڑکی اسے پسند نہیں کر رہی تھی اس نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

ان ابی زوجنی ابن اخیہ لیرفع بی خسیستہ۔

ترجمہ [میرے والد نے میری شادی اپنے دولتمند بھتیجے سے کر دی ہے تاکہ میرے ذریعہ سے اپنی کشائش کا سامان مہیا کر سکے]

آپؐ نے فرمایا کہ اگر تجھے یہ عقد پسند نہیں ہے تو تو آزاد ہے۔ اس نے کہا۔

قد اجزت ما صنع ابی ولکن اردت ان تعلم النساء ان لیس للآباء من الامر شیئ۔

(مسند احمد ج ۶ ص ۱۳۶، ابن ماجہ ابواب النکاح باب من زوج ابنتہ وھی کارھۃ)

ترجمہ [میرے والد نے جو اقدام کر لیا ہے اب میں اسے بحال کرتی ہوں۔ میں تو یہ چاہتی تھی کہ عورتوں کو معلوم تو ہو جائے کہ ان کے مرضی کے خلاف باپوں کو کسی بات کا اختیار نہیں ہے۔]

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا ایک کنیز تھیں جن کا نکاح حضرت مغیثؓ نامی ایک غلام سے ہوا تھا۔ ایک عرصہ کے بعد بریرہؓ آزاد ہو گئیں تو انہوں نے مغیثؓ کے نکاح میں رہنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اصولِ شریعت کے ماتحت ایک آزاد عورت کا غلام کے عقد میں رہنا عورت کی مرضی پر موقوف ہے۔ لیکن مغیثؓ بریرہؓ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان کی محبت کا یہ عالم

تھا کہ بریرۃؓ کے اس فیصلہ کے بعد زار و قطار روتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے دیوانہ وار دوڑتے پھرتے تھے۔ رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ منظر دیکھا تو آپ تڑپ اٹھے اور بریرۃؓ سے فرمایا۔

یا بریرۃ اتقی اللہ فانہ زوجك وابو ولدك۔

ترجمہ [اے بریرۃؓ! اللہ کا خوف کرو وہ تیرا شوہر ہے اور تیرے بچہ کا باپ ہے۔]

بریرۃؓ نے دریافت کیا۔

اتامرنی بذالك یارسول اللہ!

ترجمہ [اے اللہ کے رسول! کیا آپ مجھے اس کی بیوی بنے رہنے کا حکم دے رہے ہیں؟]

آپؐ نے جواب دیا۔

لا انما انا شافع۔

ترجمہ [نہیں۔ میں اس کا حکم کیسے دے سکتا ہوں۔ میں تو تم سے صرف سفارش کر رہا ہوں۔]

حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا۔

فلا حاجۃ لی فیہ۔

ترجمہ [تو مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔]

(بخاری۔ کتاب الطلاق۔ باب شفاعۃ النبی فی زوج بریرۃ و ابوداؤد کتاب الطلاق باب فی مملوکۃ تعتق)

غور فرمائیے کہ اسلامی حکومت میں ایک لونڈی بھی اچھی طرح

سمجھتی تھی کہ میرے اپنے حقوق کیا ہیں اور پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم اور سفارش میں کیا فرق ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اسے کس قدر مکمل یقین تھا کہ وہ صحیح طریقہ پر اپنے حق کے لئے جو سعی کرے گی قانون اس کو ناکام نہیں ہونے دیگا۔

ان معاملات کا تعلق تو اس کی اپنی شخصیت سے ہے۔ اس سے بھی آگے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے۔

اٰمروا النساء فی بناتھن۔ (ابوداؤد۔ کتاب النکاح، باب الاستئمار)

ترجمہ [عورتوں سے ان کی لڑکیوں کے بارے میں مشورہ لیا کرو۔]

یہ حدیث بتاتی ہے کہ زندگی کے جن شعبوں سے متعلق وہ تجربات رکھتی ہے اور ان کے نفع و نقصان سے بہتر طور پر واقف ہیں ان کے سلسلہ میں ان کے افکار و خیالات خصوصی توجہ اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جن کو نظر انداز کر دینا ہمارے لئے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان کے معاملات میں ان کی رائے اور مشورہ سے فائدہ اُٹھانے میں پیش قدمی کرنی چاہیئے۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک عام اسوہ اور طریق عمل حضرت امام حسن بصریؒ یہ بتلاتے ہیں کہ۔

کان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یستشیر حتی المرأۃ فتشیر علیہ بالتی یاخذ بہ۔ (عیون الاخبار لابن قتیبہ ص ۲۷/۱)

ترجمہ [نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم مشورہ فرمایا کرتے تھے حتیٰ کہ عورت سے بھی مشورہ لیا کرتے تھے اور عورت آپ کو ایسا مشورہ دیتی تھی جسے آپ اختیار فرما لیا کرتے تھے۔]

کیونکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

ترجمہ [اور اے پیغمبر اسلام! آپ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ لیا کیجئے۔]

یہ اسوہ زندگی کے کسی ایک یا چند پہلوؤں کے ساتھ مخصوص نہیں تھا۔ بلکہ اس کا تعلق ہر نوعیت کے مسائل اور تمام پہلوؤں سے تھا۔ اس کا ثبوت ہمیں تاریخ کے صفحات میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

صلح حدیبیہ اور حضرت ام سلمہؓ

حدیبیہ کی مشہور صلح، قریش اور مسلمانوں کے درمیان میں جن شرائط پہ ہوئی تھی ابتداءً مسلمانوں کی اکثریت ان سے ناخوش تھی۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مسلمان اس سال عمرہ کئے بغیر واپس چلے جائیں گے اور اس شرط کی بنا پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حدیبیہ ہی کے مقام پر قربانیاں دے کر احرام کھول دینے کا حکم دیا۔ لیکن صحابہ کے جذبات اس موقعہ پر اتنے برافروختہ تھے کہ اس حکم کی تعمیل میں صحابہ نے ناز سے کام لیا۔ آپ کو اس کا صدمہ ہوا اور آپ نے ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اس کا اظہار فرمایا۔ انہوں نے صحابہ کی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے انتہائی دانشمندانہ مشورہ دیا کہ آپ صحابہ سے کچھ نہ فرمائیں بلکہ خود آگے بڑھ کر عمل شروع کر دیجیے۔ چنانچہ آپ نے خود

قربانی دے کر احرام کھول دیا تو تمام صحابہ نے آپ کو دیکھ کر فوراً پیروی شروع کر دی۔

(بخاری کتاب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب)

اس طرح حضرت ام سلمہؓ کی درست اور صائب رائے نے آن کی آن میں اس نازک صورت کو ختم کر دیا۔

جنازہ کی شکل اور حضرت اسماءؓ

جنازہ کی موجودہ شکل کا مسلمانوں میں رواج نہیں تھا۔ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے حبشہ میں نصاریٰ کے ہاں جو رواج دیکھا تھا، انہوں نے اسی کا مشورہ دیا اور وہ قبول فرما لیا گیا۔ (طبقات ابن سعد ص ۲۰۹ ج ۸)

حضرت عمرؓ اور خواتین

صحابہ اور خلفائے راشدین بھی اسی طرز عمل پر عامل تھے۔ چنانچہ ابن سیرینؒ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق نقل فرماتے ہیں کہ۔

ان کان عمر لیستشیر فی الامر حتی ان کان لیستشیر المرأۃ فربما ابصر فی قولھا شیئا یستحسنہ فیاخذ بہ۔

(السنن الکبریٰ بیہقی ص ۱۱۳ ج ۱۰)

ترجمہ [عمر رضی اللہ عنہ پیش آمدہ مسائل میں (اصحاب الرائے لوگوں سے) برابر مشورہ کیا کرتے تھے۔ حتی کہ (ان مسائل میں سمجھ بوجھ رکھنے والی) کوئی عورت ہوتی تو آپ اس سے بھی مشورہ لیتے تھے اور بسا اوقات اس کی رائے میں خیر و خوبی کا کوئی پہلو دیکھتے یا کوئی مستحسن چیز پاتے تو اسے قبول فرما لیا کرتے]

شفار بنت عبداللہ کے تذکرہ میں علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں۔

اسلمت الشفاء قبل الهجرة فهي من المهاجرات وبايعت النبيؐ وكانت من عقلاء النساء وفضلائهن فكان عمر يقدمها في الرأي ويرضاها ويفضلها۔

(الاستیعاب تذکرہ شفار بنت عبداللہ)

ترجمہ [شفار ہجرت سے پہلے ہی اسلام لا چکی تھیں۔ وہ مہاجر عورتوں میں سے تھیں۔ انہوں نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے بیعت بھی کی تھی۔ عقل و فہم اور فضیلت رکھنے والی عورتوں میں سے تھیں حضرت عمرؓ ان کی رائے اور مشورہ میں پیش دستی فرماتے اور ان کے مشوروں کو پسند کیا کرتے تھے اور انہیں اور ان کے مشوروں کو دوسروں پر فضیلت دیا کرتے تھے]

تنقید واحتساب

صرف رائے اور مشورہ ہی نہیں بلکہ عورتیں حکومت کے معاملات پر تنقید اور حاکموں کا احتساب بھی کرتی تھیں۔ دورِ فاروقی کا وہ واقعہ مشہور ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے مہر کی مقدار پر بندش عائد کرنی چاہی تو ایک خاتون نے احتجاج کیا کہ آپ کو اس کا کوئی حق نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی مرضی کے مطابق مہر لینے کا حق عطا کیا ہے۔ (الفاروق)

اسی طرح بنو امیہ کے آغاز خلافت کا ذکر ہے کہ سیاسی چپقلش کی بنا پر حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے حامیوں

میں جو ایک تناؤ پیدا ہو گیا تھا اس کے زیر اثر کوفہ کے ایک حضرت صاحب حجر بن عدی شیعان معاویہؓ پر برملا تنقید فرماتے اور اس میں غلو کر جاتے حضرت معاویہؓ کے گورنروں نے ان کی زبان بندی کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس حجر ابن عدی ـــــــ کے ہم خیال اور مؤیدین میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا جس کی وجہ سے امن وامان کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا۔ حضرت معاویہؓ کو صورت حال کی رپورٹ کی گئی۔ انہوں نے حضرت حجر اور ان کے بعض ساتھیوں کی گرفتاری کے احکام دیدیئے اور جب یہ گرفتار ہو کر حضرت معاویہؓ کے سامنے پیش ہوئے تو حضرت معاویہؓ نے چاہا کہ وہ بنو امیہ کے گورنروں اور خود ان پر لعن وطعن کا سلسلہ بند کر دیں۔ کیونکہ اس سے حکومتِ وقت کے خلاف عوام کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں اور امن وامان کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ مگر حضرت حجر ابن عدی ـــــــ بھی شدت جذبات سے مغلوب ہو گئے تھے۔ بالآخر حضرت معاویہؓ نے ان سب کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر دیا کیونکہ وہ حکومتِ وقت کے خلاف منافرت پھیلانے اور بغاوت پر لوگوں کو ابھارنے کا موجب بن رہے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فوراً عبدالرحمٰن ابن حارث کو حضرت معاویہؓ کے پاس روانہ کیا کہ وہ ایسا کوئی اقدام نہ کریں لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی حجر اور ان کے سات ہمنوا قتل کیئے جا چکے تھے۔ اس پر حضرت

عائشہؓ سخت ناراض ہوئیں اور حضرت معاویہؓ سے سختی سے باز پرس کی عبدالملک بن نوفل راوی ہیں کہ وہ یہاں تک فرماتی تھیں کہ

لولا انا لم نغیر شیئاً الا اٰلت بنا الامور الی اشد مما کنا فیہ لغیرنا قتل حجر۔ (تاریخ الامم والملوک طبری صفحہ ۱۵۶ ج ۶)

ترجمہ [کسی معاملہ کو ہمارے تبدیل کرنے سے، موجودہ حالات سے زیادہ سخت حالات کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم حجر کے قتل کے فیصلہ کو ضرور تبدیل کرا کے چھوڑتے۔]

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

لولا یغلبنا سفھائنا لکان لی ولمعاویۃ فی قتل حجر شان۔ (النہایہ صفحہ ۵۵ ج ۸)

ترجمہ [اگر بداندیشوں اور بیوقوفوں کے غلبہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو حجر کے قتل کے سلسلہ میں میرا اور معاویہ کا معاملہ کچھ اور ہی ہوتا۔]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دور علیؓ و معاویہؓ اور بعد کے دور میں جس طرح اکابر صحابہ فتنہؑ و فساد کے خدشہ سے بعض غیر شرعی امور کو انجام پاتے ہوئے دیکھنے کے باوجود انہیں انگیز کر گئے، اسی طرح حضرت عائشہؓ نے بھی اس معاملہ میں بربنائے مصلحت سکوت اختیار فرمالیا ورنہ وہ یقیناً کوئی سخت قدم اٹھا سکتی تھیں۔

حج کے زمانہ میں حضرت معاویہؓ نے حضرت عائشہؓ سے ملاقات کی۔ چونکہ حضرت معاویہؓ کو حضرت عائشہؓ کی ناخوشگواری کا علم تھا۔ لہٰذا وہ حضرت عائشہؓ کو راضی کرنے کے لئے حاضر

ہوئے تو حضرت عائشہؓ نے جس تہدید آمیز انداز میں ان سے گفتگو فرمائی تھی اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا۔

یا معاویۃ قتلت حجرا واصحابہ وفعلت الذی فعلت اما خشیت ان اخبأ لک رجلا یقتلک۔

(البدایہ والنہایہ صفحہ ۵۵ ج ۸)

ترجمہ [اے معاویہ! تم نے حجر بن وائلؓ اور ان کے اصحاب کو قتل کر دیا اور وہ سب کچھ کر لیا جو کرنا چاہا۔ (اب تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟) کیا تمہیں اس بات کا خوف نہیں ہوا کہ میں بھی کسی شخص کو پوشیدہ طور پر تمہارے قتل پر لگا سکتی ہوں۔ [1]]

اللہ اکبر! ملاحظہ فرمائیے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ احتساب جو خلیفۂ وقت کے منہ پر ان کی طرف سے صادر ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی نظر ملکی حالات پر کس قدر گہری ہوتی تھی اور وہ خلفائے وقت کو بروقت صحیح مشورے بھی دیتی تھیں اور غلط اقدامات پر ان سے بازپرس بھی فرماتی تھیں۔

جس زمانہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کی تیاری فرما رہی تھیں، انہی

---

[1] بعض فقیہان شہر کی اس حالت پر بڑا ترس آتا ہے کہ اس قسم کی روایات پر وہ خوب بغلیں بجاتے ہیں۔ لیکن جب یہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف تنقید و احتساب کا فرض انجام دیتی ہیں تو وہ ہونٹ کاٹ کر رہ جاتے ہیں۔

دنوں وہ اپنی ایک تقریر میں فرماتی ہیں۔

کان الناس یتجنون علی عثمان و یزرون علی عمالہ .... فیستشیرونا فیما یخبروننا عنھم فننظر فی ذالک فنجدہ بریئا تقیا وفیا ونجدھم فجرۃ غدرۃ یحاولون غیر ما یظھرون (تاریخ کامل ص۹۰ ج۳ و طبری ص۱۷۵ ج۵)

ترجمہ [حضرت عثمانؓ پر لوگ بے بنیاد الزامات لگاتے اور ان کے عمال کی عیب گیریاں کرتے تھے اور ہمارے پاس مدینہ منورہ میں ان گورنروں کے متعلق جو کچھ وہ ہمیں بتاتے اس سلسلہ میں ہم سے مشورہ کرتے۔ ہم غور کرتے اور دیکھتے تو حضرت عثمانؓ کو ان الزامات سے بری، تقویٰ شعار اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے والے پاتے اور ان شکایت کرنے والوں ہی کو فاسق وفاجر، دھوکے باز جھوٹا اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے تھے اس کے برعکس ریشہ دوانیاں کرتا ہوا دیکھتے۔]

ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہؓ (جو مسلم خواتین کے لئے ایک مثالی نمونہ ہیں) حکومت اور اس کے ذمہ داروں کے اعمال کا دقتِ نظر سے مطالعہ فرماتی رہتی تھیں کہ کون سے امور و معاملات حدود عدل و انصاف کے اندر انجام پا رہے ہیں اور کہاں ان حدود سے تجاوز ہو رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام کے معاملات و مسائل سے حضرت عائشہؓ کا بہت گہرا اور قریبی رابطہ تھا اور لوگ اہم سیاسی مسائل تک میں ان کی طرف رجوع کرتے ان سے مشورہ کرتے تھے اور آپؓ

ان کو سلجھانے کی کوشش فرماتی تھیں۔

حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کسے خلیفہ بنایا جائے؟ اس بنیادی سوال کو لے کر حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے علاوہ، بصرہ کی مشہور شخصیت اور اپنے قبیلہ کے سردار حضرت احنف بن قیس حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب حضرت احنف نے حضرت عائشہؓ و طلحہؓ و زبیرؓ تینوں حضرات کی رائے حضرت علیؓ کے حق میں پائی تو انہوں نے مدینہ منورہ جا کر حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (تاریخ الامم والملوک طبری صفحہ ۱۹۷ جلد ۸)

ان تمام روایات سے ثابت ہے کہ اسلام نے عورت کی رائے اور مشورہ کو ہر طرح اہمیت دی ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے بھی پیش آمدہ مسائل میں عورتوں سے مشورہ لیا، اسے قبول کیا اور اس کے مطابق عمل کیا ہے۔ عام صحابہ بھی ضرورت کے مسائل میں حتی کہ سیاسی مسائل تک میں عورتوں سے مشورہ فرمایا کرتے تھے اور ان سے مشورہ فرما کر اس پر عمل بھی فرماتے تھے۔ لہٰذا یہ جو بعض جاہلوں میں مشہور ہے کہ عورتوں سے مشورہ تو کرنا چاہیئے مگر عمل ہمیشہ ان کے مشورہ کے خلاف کرنا چاہیئے۔ کیونکہ صحیح بات وہی ہوتی ہے جس کے برعکس عورتیں مشورہ دیں۔ شاوروھن و خالفوھن (ان سے مشورہ کرو اور ان کے مشورہ کے خلاف عمل کرو) یہ ایک ایسا جاہلانہ اصول ہے جس کی تائید اسلام نہیں کرتا۔

(عورت اور ذمہ داری کے مناصب)

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ بعض صلاحیتیں ایسی ہیں جو صرف مردوں میں بافراط پائی جاتی ہیں اور بعض صلاحیتیں ایسی ہیں جو بافراط صرف عورتوں میں پائی جاتی ہیں۔ جن صلاحیتوں سے مردوں کو وافر حصہ ملا ہے ان میں مرد برتر ہیں اور جن صلاحیتوں سے عورتوں کو وافر حصہ ملا ہے اُن میں عورتوں کو برتری حاصل ہے۔ لیکن اکثر صلاحیتیں مشترک ہیں۔ وہ مردوں کو بھی ملی ہیں اور عورتوں کو بھی۔ ان میں کسی کی دوسرے پر برتری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سورۂ احزاب میں ملاحظہ فرمائیے کہ کس طرح دونوں کا تذکرہ ساتھ ساتھ اور مساویانہ حیثیت سے فرمایا گیا ہے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّائِمِيْنَ وَالصّٰئِمٰتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ($\frac{۳۵}{۳۳}$)

ترجمہ: اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ الٰہی کی اطاعت سے اپنی ذات کی تکمیل کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی پوری

پوری صلاحیت ہے (اَلْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ) اگر مرد اسلامی معاشرہ اور امت مسلمہ کے رکن بن سکتے ہیں جو اللہ کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین کامل رکھتے ہوئے امن عالم کے امین بن سکیں تو عورتیں بھی اس معاشرہ کا رکن بن سکتی ہیں (اَلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ) اگر صنف قوی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد اور قوت کو اس طرح سنبھال کر رکھے کہ اس کا استعمال صرف قانون الٰہی کے مطابق ہو سکے تو اس کی صلاحیت صنف لطیف میں بھی ہے (وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ) اگر صنفِ رجال اپنے ایمان کے دعوے کو اپنے عمل سے سچ کر دکھا سکتے ہیں تو صنف نسا بھی اس کی اہل ہے (وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ) اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ثابت قدم رہ سکتی ہیں (اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ) اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں وہ شاخ ثمردار کی طرح قانون الٰہی کی اطاعت میں سرنگوں ہوتے جائیں تو اس خصوصیت کی حامل عورتیں بھی ہوتی ہیں (اَلْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ) اگر مردوں میں ایثار و قربانی کا مادہ ہوتا ہے تو عورتوں میں مردوں سے زیادہ اس خصوصیت کی نمود ہوتی ہے (اَلْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ) اگر صنف قوی کو اپنی طبیعت پر اتنا کنٹرول ہو سکتا ہے کہ جہاں انہیں روک دیا جائے وہ فوراً رک جائیں تو عورتیں بھی اس خصوصیت میں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں (وَالصّٰٓئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ) اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کا پابند رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی اس

ضمن میں مردوں سے کچھ آگے ہی ہیں (وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ) اگر مردوں میں یہ قدرت پائی جاتی ہے کہ وہ ہر وقت قانون الٰہی کو پیش نظر رکھیں اور کبھی اسے نظر انداز نہ ہونے دیں تو یہ قدرت عورتوں میں بھی ہے (وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لئے مغفرت اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔]

جب یہ صلاحیتیں دونوں صنفوں میں موجود ہیں اور یہ تمام صلاحیتیں انکے ذمہ دار فرد ہونے کا ثبوت ہیں تو دونوں کی ذمہ داریاں بھی مساوی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام قوانین الٰہی کا نفاذ جیسا مردوں پر ہوتا ہے۔ عورتوں پر بھی ہوتا ہے۔ جو فرائض وواجبات حق تعالیٰ نے مردوں پر فرض کئے ہیں بعینہ وہی فرائض وواجبات عورتوں کے لئے بھی مقرر ہیں۔ فرائض وواجبات میں بنیادی چیزیں پانچ ہیں اور وہ دونوں پر فرض ہیں۔ ان کو ادا کرنا دونوں کی ذمہ داری ہے۔ صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج اور ایمان باللہ اور شہادت انبیاء و ملائکہ و کتب الٰہی اور اقرار آخرت یعنی بعث بعد الموت جیسا کہ مردوں کے لئے ضروری ہے ویسا ہی عورتوں کیلئے بھی ضروری ہے۔ حدود و تعزیرات جیسی مردوں کے لئے ہیں اسیطرح عورتوں کے لئے بھی ہیں۔ ایسا تو نہیں ہے کہ زنا، سرقہ، تہمت مردوں کے لئے تو جرم ہو اور عورتوں کے لئے معاف ہو، یا مردوں کو سخت سزا دی جاتی ہو اور عورتوں کو ہلکی سزا دی جاتی ہو۔ دونوں برابر کے ذمہ دار اور برابر کے جواب دِہ ہیں۔ لہٰذا جب ذمہ داری اور جواب دہی برابر ہے تو ذمہ دارانہ عہدوں اور منصبوں کی اہلیت بھی یقیناً دونوں میں مساوی ہونا چاہیئے۔ الغرض بالعموم

(جتنا فائدہ اٹھانے کا حق ہوتا ہے اتنا ہی تاوان بھرنے کا بھی حق ہو جاتا ہے۔)

وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (۳۷/۳۹)

ترجمہ [تمہیں وہی بدلہ (اجزو سزا) دیا جاتا ہے جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔]

اور

هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (۲۷/۹۰)

ترجمہ [کیا تمہیں اپنے اعمال کے سوا بھی کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے۔]

جیسا اپنا کرنا ہے ویسا ہی اس کا بدلہ (REWARD) ہے۔

لہٰذا اگر ذمہ داریوں میں دونوں برابر ہیں تو ان ذمہ داریوں کا جو کچھ صلہ اور بدلہ ہو سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ دونوں اس میں بھی برابر ہوں۔ لہٰذا اگر ذمہ داری کے مناصب مردوں کو مل سکتے ہیں تو عورتوں کو بھی مل سکتے ہیں۔ البتہ جیسا کہ مردوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان میں اس ذمہ داری کے منصب کی اہلیت بھی ہو، علم، عمل، قدرت، امانت و دیانت وغیرہ ایسے ہی عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (۴/۵۸)

ترجمہ [اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ (اس کی امانتیں) انہی کے حوالے کرو جو ان کے اہل ہوں۔]

نااہل مردوں کو بھی اللہ کی امانتیں سپرد نہیں کی جا سکتیں اور نااہل عورتوں کو بھی یہ امانتیں حوالے نہیں کی جا سکتیں۔ سب سے

بڑی شرط اہلیت ہے۔ مرد ہونا یا عورت ہونا نہ کوئی اہلیت کا سرٹیفکیٹ ہے اور نہ نااہلیت کا پروانہ جس میں بھی صلاحیت ہو اور وہ اس کے تقاضوں کو بحسن وخوبی ادا کر سکتا ہو وہ ان ذمہ دارانہ مناصب کو حاصل کر سکتا ہے۔ یہ مناصب اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہیں۔ دیانت داری کے ساتھ ہی ان امانتوں کو کسی کے حوالہ کرنا چاہیئے اور دیانت داری کے ساتھ ہی ان منصب داروں کو اس کی ذمہ داریاں ادا کرنی چاہئیں۔

امامتِ صغریٰ عورتیں نماز باجماعت ادا کر سکتی ہیں اس میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن اگر عورتیں اپنی جماعت مردوں سے الگ قائم کریں تو کیا عورت عورتوں کی امامت کر سکتی ہے؟ امام شافعیؒ اور دیگر فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے۔ امام مالکؒ نے اس سے منع کیا ہے۔ لیکن احادیث سے ثابت ہے کہ عورتوں کی جماعتیں ہوتی تھیں اور عورت ہی ان کی امامت بھی کرتی تھی۔ البتہ امام عورت مردوں کے امام کی طرح آگے نہیں کھڑی ہوتی تھی بلکہ صف کے درمیان میں کھڑی ہوتی تھی۔ (بدایۃ المجتہد صفحہ ۱۲۵ ج ۱)

حضرت ریطہ حنفیہ کی روایت ہے کہ۔

"حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرض صلوٰۃ میں ہماری امامت کی اور عورتوں کی صف کے درمیان میں کھڑی ہوئیں۔

(دار قطنی ص ۱۵۵ باب صلوٰۃ النساء جماعۃ وموقف امامہن

بیہقی صفحہ ۱۳۱ ج ۳ والمحلی ابن حزم صفحہ ۱۲۶ ج ۳)

نیز تمیمہ بنت سلمہ کی روایت ہے کہ۔

"ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مغرب کی فرض صلوٰۃ میں امامت فرمائی اور ان کے درمیان میں کھڑی ہوئیں اور جہری قرأت فرمائی۔" (المحلّٰی لابن حزم صـــ۱۲۶ج۳)

عطاء بن ابی رباح سے روایت ہے کہ۔

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اذان بھی دیتی تھیں۔ اقامت بھی کہتی تھیں اور امامت بھی کرتی تھیں اور عورتوں کے درمیان میں کھڑی ہوا کرتی تھیں۔ (مستدرک صـــ۲۰۴ج۱)

سعدہ بنت قسامہ رضی اللہ عنہا کے متعلق منقول ہے کہ وہ عورتوں کی امامت کیا کرتی تھیں اور درمیان میں کھڑی ہوا کرتی تھیں۔ (الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرہ سعدہ بنت قسامہؓ)

"حضرت عائشہؓ کے متعلق مروی ہے کہ وہ رمضان میں نفل صلوٰۃ (صلوٰۃ تراویح) میں امامت فرمایا کرتی تھیں اور صف کے درمیان کھڑی ہوا کرتی تھیں۔

(کتاب الآثار للامام ابی یوسف صـــ۴۱ حدیث نمبر۲۱۲)

خیرہؒ بیان کرتی ہیں کہ۔

"حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا رمضان میں عورتوں کی امامت فرمایا کرتی تھیں اور عورتوں کے ساتھ صف میں کھڑی ہوا کرتی تھیں۔" (المحلّٰی صـــ۱۲۷ج۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ۔

"عورت، عورتوں کی امامت کرسکتی ہے اور وہ ان کے درمیان

میں کھڑی ہو۔"

امام ابن حزم کی رائے اور فیصلہ ہے کہ۔

"نفل صلوٰۃ میں عورت، عورتوں کی امامت کر سکتی ہے اور وہ ان کے درمیان میں کھڑی ہو۔"

نظامِ صلوٰۃ حقیقت میں تنظیم امت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے اسی لئے امامتِ صلوٰۃ کو امامت صغریٰ کہا جاتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی خلافت کا سوال سامنے آیا تو مہاجرین نے حضرت ابوبکرؓ کا نام پیش کیا اور اس منصب کیلئے آپ کی اہلیت کی دلیل یہی دی تھی کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ ہی کو امامتِ صلوٰۃ کے لئے بڑھایا تھا۔ اس دلیل کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ شریعت، خواتین کو اپنے انفرادی واجتماعی مسائل کے حل کے لئے اپنی الگ تنظیمیں قائم کرنے سے نہیں روکتی اس طرح کی تنظیموں کو مختلف قسم کے معاشرتی امور انجام دینے کی آزادی دی جانی چاہیئے۔ وہ خواتین کی تعلیم و تربیت اور ان کی فلاح و بہبود کے مختلف دوسرے کام بھی کر سکتی ہے۔ بلکہ خواتین کو اپنی عدالتیں قائم کرنے اور قضاء و نفاذ قوانین کے حقوق دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

مردوں کی امامت

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آیا عورت مردوں کی امامت بھی کر سکتی ہے یا نہیں؟

جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ عورت مردوں کی امامت نہیں کر سکتی۔ البتہ امام ابوثور اور طبری دونوں اس کے قائل ہیں کہ عورت

مردوں کی بھی امامت کر سکتی ہے۔ جمہور کی دلیل یہ ہے کہ اگر عورت کے لئے مردوں کی امامت جائز ہوتی تو صدرِ اول میں ایسا ضرور ہوتا اور وہ نقل ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ایسا منقول نہیں ہے۔ نیز صلوٰۃ باجماعت میں عورتوں کی صف مردوں سے آگے نہیں ہوتی بلکہ مردوں سے پیچھے ہوتی ہے۔ لہٰذا عورت کو مردوں سے مقدم یعنی ان کا امام نہیں ہونا چاہیئے۔

امام ابو ثورؒ اور طبریؒ کی دلیل غالباً یہ ہے کہ قرآن و سنت سے اس کی صراحتہً ممانعت ثابت نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ عموماً اس پر عمل نہیں ہوا کہ عورتیں مسلمان مردوں کی امام بنی ہوں۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عورت کی امامت خلاف اولیٰ ہے۔ ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ صدرِ اول میں کوئی ایسا واقعہ نقل نہیں ہوا کہ کسی عورت نے مردوں کی امامت کی ہو جبکہ ابوداؤد میں حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق وارد ہوا ہے کہ۔

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ان سے ملاقات کرنے ان کے گھر پر جایا کرتے تھے اور آپ نے ان کے لئے ایک مؤذن مقرر فرمایا تھا جو ان کے لئے اذان دیا کرتا تھا اور ان کو آپ نے حکم دے رکھا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کیا کریں۔

(ابوداؤد۔ کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ النساء)

علامہ ابن رشد قرطبیؒ نے امام ابو ثور اور طبری کے مسلک پر اسی حدیث سے استدلال فرمایا ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۴۶)

فقہاء کرام کی ایک خاصی بڑی جماعت نے نابالغ بچہ کی امامت اور فاسق و فاجر آدمی کی امامت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ ایک متقی اور پرہیز گار عورت نابالغ بچہ اور فاسق و فاجر آدمی سے تو بہر حال مقدم ہے۔ اگر ان دونوں کی امامت صحیح ہو سکتی ہے تو محض ایک عورت کی امامت پر اعتراض کرنا ناقابل فہم ہے۔

البتہ چونکہ عموماً خاندان کا سربراہ مرد ہی ہوتا ہے۔ عورت نہیں ہوتی لیکن اگر اس قابل کوئی مرد موجود ہی نہ ہو۔ شوہر مر گیا ہو، یا شوہر دیوانہ اور سفیہ ہو تو گھر کی سربراہ کے ساتھ ساتھ خاندان کی سربراہ بھی عورت بن سکتی ہے اسی طرح عام حالات میں امامت مرد ہی کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی مرد اس قابل نہ ہو تو محض مرد ہونے کی وجہ سے ایک قابل اور اہل عورت پر اس کو ترجیح نہ دی جانی چاہیئے۔

یہ ہے امام ابو ثورؒ اور طبری کے دلائل کا خلاصہ۔

زنانہ مسجدیں عورتوں کو اپنی مسجدیں بنانے، اپنا امام اور مؤذن مقرر کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ ایسے تمام ادارے جہاں صرف عورتیں کام کرتی ہوں مثلاً زنانہ اسکول، زنانہ کالج، زنانہ یونیورسٹیاں، زنانہ فیکٹریاں، ان میں عورتوں کو اپنے میں سے کسی اہل اور قابل عورت کو اپنا امام مقرر کر کے باقاعدہ جماعت کے ساتھ صلوٰۃ ادا کرنی چاہیئے۔ جیسا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے انتظام فرما دیا تھا۔ انہوں

نے اپنی ایک مسجد بھی بنالی تھی جہاں وہ امامت کیا کرتی تھیں۔

ہمارے فقہاء کے نزدیک عورتوں پر جمعہ اور عیدین کی نماز واجب نہیں ہے۔ لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد مبارک میں عورتوں کو عیدگاہ میں حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔ (بخاری کتاب العیدین باب اذا لم یکن للمرأۃ جلباب)

عورتیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جمعہ کی نماز میں بھی حاضر ہوا کرتی تھیں۔ حضرت خولہ بنت قیس جہنیہ رضی اللہ عنہا حضور کی بلند آواز کا بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں۔

کنت اسمع خطبۃ رسول اللہ یوم الجمعۃ و انا فی مؤخر النساء۔ (طبقات ابن سعد صـ۲۱۷ ج ۸)

ترجمہ [میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا خطبہ اچھی طرح سنتی تھی حالانکہ میں عورتوں کی صفوں میں سب سے آخر میں ہوتی تھی]

اس سے نہ صرف خولہ بنت قیس رضؓ کی شرکت جمعہ معلوم ہوتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں کثیر تعداد میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ ان کی صفیں ہوتی تھیں جن کی آخری صف میں یہ خود ہوا کرتی تھیں۔

حضرت حارثہ رضؓ ابن نعمان کی ایک صاحبزادی بیان فرماتی ہیں۔

ما حفظت قٓ الا من فی رسول اللہ یخطب بھا کل جمعۃ۔

(مسلم کتاب الجمعہ، ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب الرجل یخطب علی قوس)

ترجمہ [میں نے سورۃ قٓ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر ہی یاد کی کیونکہ آپ ہر جمعہ میں خطبہ میں اسے پڑھا کرتے،

تھے]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحبزادی جمعہ میں مسلسل حاضر ہوتی تھیں کہ قرآن کریم کی سورۃ قٓ جو پانچ صفحات کی سورت ہے اور جس میں پوری پنتالیس ۴۵ آیتیں ہیں خطبہ میں سن سن کر انہیں یاد ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی سورت ایک دو مرتبہ سن کر تو یاد ہونے سے رہی۔

قرآن کریم سے عیدین کی صلوٰۃ کا تو صراحت سے ثبوت نہیں ہے لیکن صلوٰۃ الجمعہ کا ذکر صراحت کے ساتھ آیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ (۶۲/۹)

ترجمہ[اے پیروانِ دعوت ایمانی! جب جمعہ کے دن صلوٰۃ کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر (یعنی صلوٰۃ) کی طرف لپکو اور کاروبار کو (یعنی خرید و فروخت کو) چھوڑ دو۔]

اس آیت کریمہ میں تمام مؤمنین کو خطاب ہے۔ جس کے مرد بھی مخاطب ہیں اور عورتیں بھی۔ لہٰذا قرآن کی اس آیت سے تو واضح طور پر عورتوں پر بھی جمعہ کی فرضیت ثابت ہو رہی ہے۔ ورنہ ماننا پڑے گا کہ جب یا یھا الذین اٰمنوا سے خطاب کیا جائے تو اس کے مخاطب صرف مرد ہی ہوا کرتے ہیں۔ عورتیں نہیں ہوا کرتیں۔ اس طرح تو عورتوں کو قرآن شریف کے بے شمار احکام سے چھٹی مل جائے گی۔ قرآن کریم مردوں اور عورتوں دونوں کو خطاب کرتا ہے اور جب مشترک مجمع کو خطاب کیا جاتا ہے تو مذکر

کے صیغے ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایسا ہی یہاں بھی ہے۔ لہٰذا عورتوں پر صلوٰۃ الجمعہ فرض کفایہ ہے اور انہیں جمعہ پڑھنا چاہیئے۔ خواہ مردوں کے ساتھ ان کی جامع مسجدوں میں یا اپنی جداگانہ قائم کردہ مسجدوں میں کسی عورت کی امامت میں۔ عیدین کی صلوٰۃ کے متعلق بھی یہی صورت ہے۔ (المیزان الکبریٰ للشعرانی)

جہاد

ہمارے فقہاء نے عورتوں کو جہاد سے بھی مستثنیٰ کر رکھا ہے اور ان کا ارشاد ہے کہ جنگ میں عورتوں کو شریک نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن قرآن کریم میں جہاد سے متعلق جس قدر آیات ہیں سب میں خطاب تمام مسلمانوں کو فرمایا گیا ہے مسلمان مرد بھی ہوتے ہیں، عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رض کے عہد میں جنگوں میں عورتیں برابر شریک ہوتی رہی ہیں۔ تفصیلات اپنے مقام پر گذر چکی ہیں۔ اگر جہاد اور قتال کی تمام آیات میں عورتیں داخل نہیں ہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا وہ مسلمان نہیں ہیں کہ عام خطاب میں ان کو شامل نہ کیا جائے۔ البتہ ہر مسلمان پر اس کی استطاعت کے مطابق جہاد میں حصہ لینا ہوگا۔ بلاشبہ عورتیں اگر اس کی صلاحیت نہ رکھتی ہوں کہ وہ میدانِ جنگ میں شمشیر زنی کر سکیں تو وہ اپنے مناسب حال دیگر خدمات تو انجام دے سکتی ہیں۔ مثلاً مجاہدین کے لئے کھانا پکانا، زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، زخمیوں کو میدانِ جنگ سے محفوظ مقامات پر منتقل کرنا، انہیں پانی پلانا، سامان رسد پہنچانا، ان کے حوصلے بلند کرنا، انہیں گولہ بارود سپلائی کرنا وغیرہ وغیرہ۔

اور اگر انہیں فنون حرب کی تربیت دی جا چکی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ عملی جنگ میں انہیں حصہ لینے سے روکا جائے۔ لیکن صدیوں سے چونکہ مسلمان عورت کو فنون حرب سے قطعًا نا آشنا بنا دیا گیا ہے۔ لہٰذا موجودہ حالات میں اگر عورت عملی جنگ میں حصہ لینے کی اہل نہیں رہی تو اس میں قصور عورت کا نہیں بلکہ مردوں کا ہے جنہوں نے اُسے بالکل ناکارہ بنا دیا ہے۔ ان حالات میں یہ کوشش ضرور ہونی چاہیئے کہ اس صورت حال کو تبدیل کیا جاسکے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں خواتین اسلام نے عملی جنگ میں بھی حصہ لیا ہے جو تاریخ وسیر کی کتابوں میں آج بھی محفوظ ہے۔ یہاں ہم صرف ایک واقعہ نقل کرنے پر اکتفا کریں گے۔ ابن ہشام اور ابن سعد دونوں نے بیان کیا ہے کہ۔

ایک انصاری صحابیہ ام عمارہ رضی اللہ عنہا نے جنگ احد میں مردوں کی سی ثبات قدمی اور بے باکی کا مظاہرہ کیا۔ سعد بن ربیع کی صاحبزادی ام سعد نے ان سے اس کارنامہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ میں صبح سویرے ہی مجاہدین کی خدمت کے لئے میدانِ کارزار میں پہنچ گئی تھی۔ ابتداء میں مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا۔ لیکن بعد میں جب فتح ونصرت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو ان میں افراتفری اور انتشار پھیل گیا۔ اُس وقت میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ کر آپ کی مدافعت میں تیر اور تلوار چلانے لگی۔ یہاں تک کہ دشمن کی

ضرب مجھ پر آن پڑی۔ ام سعد کہتی ہیں کہ میں نے ان کے کندھے پر بہت ہی گہرے زخم کا نشان دیکھا اور پوچھا، کس نے آپ پر اتنا سخت حملہ کیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا "ابن قمیۂ نے۔ خدا اسے غارت کرے" جب مسلمان شکست کھا کر حضورؐ کے پاس سے بھاگ کھڑے ہوئے تو یہ چلاتا ہوا آیا۔ "بتاؤ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہے؟ اگر وہ اس جنگ میں بچ گیا تو میری نجات نہیں۔ یہ میری ہلاکت اور موت ہے" یہ سن کر میں اور مصعب ابن عمیرؓ اور چند دوسرے اصحابؓ نے جو آپؐ کے ساتھ جمے ہوئے تھے اس کا سامنا کیا۔ اس مقابلہ میں اس نے مجھ پر وار کر دیا جس کا نشان تم دیکھ رہی ہو۔ میں نے بھی تلوار سے کئی حملے اس پر کئے۔ لیکن وہ دشمنِ خدا دُو دُو زرہیں پہنے ہوئے تھا۔

(سیرت ابن ہشام صفحہ ۲۹-۳۰ ج ۳ وطبقات ابن سعد صفحہ ۳۰۱ ج ۸)

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں انہوں نے جس ہمت و پامردی کا ثبوت دیا اس کی شہادت خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دی ہے۔

ما التفت یمینا ولا شمالا الا وانا اراھا تقاتل دونی

ترجمہ [دائیں بائیں جدھر بھی میں رخ کرتا تھا، ام عمارہؓ کو اپنی مدافعت میں لڑتا دیکھتا تھا۔]

ان کے صاحبزادہ کو ایک شخص نے گھائل کر دیا جب اس کا اُدھر سے گذر ہوا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ام عمارہ! یہ ہے تمہارے بیٹے کو زخمی کرنے والا"

یہ سنتے ہی وہ اس پر ٹوٹ پڑیں اور اتنے زور سے تلوار چلائی کہ وہ وہیں گر پڑا اور ڈھیر ہو گیا۔ حضورؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"امّ عمارہ! تم نے اپنے بیٹے کا بدلہ لے لیا"

خود کہتی ہیں کہ اس کے بعد ہم اس پر مسلسل تیر برسانے لگے یہاں تک کہ اس کو ختم کر کے چھوڑا۔ یہ دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو اس پر غلبہ عطا کیا اور تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی اور تمہارے لڑکے کا بدلہ تم کو دکھایا"

ایک اور واقعہ بیان کرتی ہیں کہ ایک شہسوار آگے بڑھتے ہوئے آیا اور مجھ پر وار کیا میں نے ڈھال پر اس پر روک کرنا کام بنا دیا۔ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگا تو میں نے اس کے گھوڑے پر حملہ کر کے اس کے پیر کاٹ دیئے اور وہ پشت کے بل گر پڑا۔ حضور اس کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔ آپ نے میرے لڑکے کو آواز دی۔

"امّ عمارہ کے بیٹے! جاؤ اپنی ماں کی مدد کرو"

چنانچہ وہ دوڑا ہوا آیا اور اس کی مدد سے میں نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس دن ان کی استقامت اور ثابت قدمی کو دیکھ کر حضور نے فرمایا۔

لمقام نسيبة بنت كعب اليوم خير من مقام فلان وفلان۔

ترجمہ [آج نسیبہ بنت کعب (امّ عمارہؓ) کی ثابت قدمی اور استقلال فلاں فلاں سے بھی بہتر رہا۔]

ذرا اس جرأت و ہمت کو دیکھئے کہ بدن پر نیزے اور شمشیر کے ایک دو نہیں۔ بارہ ۱۲ زخم آچکے ہیں اور ابن قمئہ نے جو وار کیا تھا وہ اتنا گہرا تھا کہ اس کے بھرنے میں پورا ایک سال لگ گیا۔ لیکن اس کے باوجود حضورؐ نے احد کے فوراً بعد ہی مشرکین کے تعاقب اور مقابلہ کے لئے حمراء الاسد نامی مقام کی طرف چلنے کا حکم دیا تو ام عمارہؓ کمربستہ ہو گئیں۔ لیکن کافی خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ اس قدر کمزور ہو چکی تھیں کہ چل نہیں سکیں اور مجبوراً مدینہ منورہ کی طرف لوٹ گئیں۔ حضورؐ حمراء الاسد سے واپس ہوئے تو قبل اس کے کہ گھر تشریف لے جاتے ان کی مزاج پرسی کرائی، جب خیریت معلوم ہوئی تو آپؐ نہایت ہی مسرور ہوئے۔

احد کے علاوہ انہوں نے خیبر، حنین اور یمامہ کی جنگ میں بھی شرکت کی تھی۔ یمامہ کی جنگ میں لڑتے لڑتے ان کا ہاتھ شہید ہو گیا اور اس کے علاوہ نیزے اور تلوار کے پھر بارہ ۱۲ زخم ان پر دیکھے گئے۔ (ان تمام تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ج ۸ صفحہ ۳۰۱ تا ۳۰۴۔ یمامہ میں شرکت کا ذکر ابن عبدالبر نے بھی استیعاب میں کیا ہے)

اسلامی تاریخ میں ایسی نامور خواتین کے بے شمار نام موجود ہیں جن کو گنانے اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالنے بیٹھوں تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن میں نہ تاریخ کی کتاب لکھ رہا ہوں نہ سیر کی۔ بلکہ فقہ القرآن لکھ رہا ہوں یعنی وہ مسائل فقہیہ مرتب کر رہا ہوں جو قرآن کریم سے مستنبط ہوتے ہیں اس لئے

میں اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے نہیں لکھ سکتا۔

ایک اہم سوال لیکن یہاں ایک اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے عہد اولین میں یہ نامور خواتین کیسے پیدا ہو گئیں۔ کیا انہیں گھروں کی چار دیواری میں بند رکھنے اور انہیں لوگوں کی نگاہوں سے چھپائے رکھنے کے باوجود یہ فنون حرب کا کمال حاصل ہو گیا تھا۔ انہیں میدان حرب و ضرب کا یہ تجربہ کہ وہ بڑے بڑے سورماؤں سے نبرد آزما ہوئیں اور انہیں برسر میدان پچھاڑ دیا یونہی اتفاقی طور پر حاصل ہو گیا تھا۔ کہ وہ ساری عمر تو گھروں میں بند رہیں اور کوئی موقعہ پڑنے پر میدان میں آگئیں اور اپنے یہ جوہر دکھا گئیں۔ اگر یونہی یہ معرکۃ الآرا کارنامے اتفاقی طور پر ہی ان سے سرزد ہو گئے تو آج کم از کم پاکستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں میں ایک دو خواتین کے نام ہی پیش کر دیجئے جو ام عمارہ رضی اللہ عنہ کے عشر عشیر کوئی معمولی کارنامہ انجام دے سکیں۔ میدان جنگ میں شمشیر زنی اور نیزہ بازی تو بڑی بات ہے، یہاں تو یہ حال ہے کہ تلوار ہاتھ میں اٹھانے یا بندوق لے کر چلنے سے ان کی کلائیوں میں موچ آجاتی ہے۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ آج پوری قوم میں ام عمارہ رضی اللہ عنہا یا ام حرام رضی اللہ عنہا جیسی خواتین کیوں پیدا نہیں ہوتیں۔ اس کے جواب میں ہر شخص اپنے اپنے خیال کے مطابق جو کچھ کہیگا سو کہیگا لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس کی ساری ذمہ داری ان

مفکرین و فلاسفہ یا علماء و فقہاء پر عائد ہوتی ہیں جنہوں نے شہنشاہیت کے زیر اثر عورت کو محض تفریح طبع کا ایک کھلونا اور عمائدین ملت کی حرم سراؤں کی زینت و آرائش بنا کر انہیں عملی جدوجہد سے بالکل بیگانہ اور عضو معطل بنا کر رکھ دیا ہے اور اپنے ان خیالات کو مذہبی تقدس کا جامہ پہنا کر پوری ملت پر مسلط کر دیا ہے۔ اگر آج کوئی شخص اس کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو اس پر مغربیت کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔

یاد رکھئے اسلامی ملت کی نشأۃ ثانیہ کا خواب اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا جب تک قوم کے نونہالوں کے لئے آپ ام عمارہ اور ام حرام رضی اللہ عنہا جیسی خواتین کی آغوش تربیت مہیا نہیں کریں گے۔ زینتِ خانہ بننے والی ناکارہ اور بے عمل خواتین کی گود میں جو نسل پروان چڑھے گی اس سے آپ خالد ابن ولیدؓ، عمروؓ ابن العاص، سعدؓ ابن ابی وقاص، ابو عبیدہؓ ابن الجراح، عکرمہؓ ابن ابی جہل، یزیدؓ ابن ابی سفیانؓ، محمد بن قاسمؒ، طارق ابن زیادؒ، موسیٰ بن نصیر اور قتیبہ بن مسلم باہلی جیسے جنرل اور کمانڈر پیدا نہیں کر سکتے ہماری قوم کاش جلد از جلد اس حقیقت کو سمجھ لے۔ وہ جس قدر جلد اس حقیقت کو سمجھ لے اتنا ہی اچھا ہے۔

مشترک محفلوں میں شرکت

عورتیں ایسی مشترک محفلوں میں شریک ہو سکتی ہیں جن میں مرد بھی موجود ہوں۔ لیکن شرط یہی ہے کہ وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں اور اپنے کپڑوں کے اوپر ایک جلباب (لمبی چادر) اوڑھ کر

شریک ہوں۔

صحیح بخاری میں سہل ؓ ابن سعد سے روایت ہے کہ جب حضرت ابو اُسید ساعدی ؓ نے شادی کی تو انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی دعوت کی تو ان کی بیوی ام اسید ؓ ہی نے کھانا تیار بھی کیا اور اُسے سب کے سامنے پیش بھی کیا تھا۔ رات سے اُنہوں نے کھجوریں پتھر کے پیالوں میں بھگو دی تھیں۔ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کھانے سے فارغ ہو گئے تو ان کی بیوی نے ان کھجوروں کو ہاتھ سے ملا اور حضور ؐ کو اسے پلایا۔ یہ ان کی طرف سے حضور ؐ کے لئے خصوصی تحفہ تھا۔ (بخاری صـــ ۷۷۸/ج ۲)

اس حدیث پر امام بخاری نے باب بھی یہی باندھا ہے۔

قیام المرأۃ علی الرجال فی العرس وخدمتھم بالنفس۔

ترجمہ [یعنی عورت کا مردوں کے لئے شادی کے موقعہ پر خود ہی کھڑے ہو کر اپنی ذات سے ان کی خدمت کرنا یعنی کھانا وغیرہ خود ہی پیش کرنا]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں جب کچھ مہمان آئے اور انہوں نے ان کے سامنے کھانا رکھا تو اس محفل میں حضرت سارہ رضی اللہ عنہا (زوجہ مطہرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام) بے تکلف آکر شریک محفل ہو گئی تھیں۔ قرآن کریم نے سورۃ الذاریات میں اس کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ط قَالَ سَلٰمٌ ج قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ط قَالُوْا لَا تَخَفْ ط وَ

بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ○ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ○ قَالُوْا كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ○ (۵۱ / ۲۴-۳۰)

ترجمہ [اے پیغمبر اسلام! تمہیں ابراہیم کے معزز مہمانوں کی بات پہنچی ہے؟ جب ان کے پاس مکان میں آئے تو انہوں نے سلام کیا۔ ابراہیم نے بھی سلام کا جواب دیا (اور دل میں سوچا) کچھ اجنبی سے آدمی ہیں (مسافر ہوں گے) وہ چپکے سے گھر میں گئے اور ایک موٹا تازہ (بھنا ہوا) بچھڑا لاکر سامنے رکھدیا۔ فرمایا، کیا تم کھانا نہیں کھاتے؟ (اور دل میں) ان سے کچھ اندیشہ محسوس کیا (کہیں دشمن کے آدمی نہ ہوں کسی برے ارادہ سے نہ آئے ہوں) انہوں نے کہا گھبرائیے نہیں۔ اور انہیں ایک صاحب علم لڑکے کی بشارت دی تو ان کی بیوی چلاتی ہوئی سامنے آگئیں اور انہوں نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگیں (مجھ بڑھیا بانجھ کے (لڑکا ہوگا) انہوں نے کہا، تمہارے پروردگار کا کہنا یہی ہے۔ یقیناً وہ حکمت اور علم والا ہے]

اس کے بعد حضرت کے دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان نہیں فرشتے ہیں مگر اس وقت تک حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہؓ ان کو آدمی ہی سمجھ رہے تھے اور اس محفل میں حضرت سارہؓ بے تکلف چلی آئی تھیں۔ قرآن کریم نے حضرت ابراہیم اور حضرت سارہؓ کے اس واقعہ کو بغیر کسی نکیر کے نقل کیا ہے اور گذشتہ امتوں کے واقعات اگر قرآن بغیر کسی نکیر کے نقل کرے تو وہ ہمارے لئے حجت ہوتے ہیں۔

والد محترم شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی احکام القرآن میں لکھتے

ہیں کہ :-

انبیاء سابقین کی شریعت ہمارے لئے بھی شریعت ہے (تا آنکہ اس کا منسوخ ہونا ثابت نہ ہو جائے) یا نہیں ؟ اس میں فقہائے کرام کے پانچ قول ہیں۔ ابن العربیؒ نے سب کو بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ صحیح قول یہی ہے کہ انبیائے سابقین کی شریعت کی پیروی ہم پر بھی لازم ہے بشرطیکہ اس شریعت کو ان سے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے نقل فرمایا ہو (یا اسے حق تعالےٰ نے بغیر کسی نکیر کے نقل کر دیا ہو)۔۔۔۔۔۔۔ اور یہی مذہب سادات حنفیہؒ کا ہے (اللہ ان کی سعی کو مشکور فرمائے)۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۲۲ مطبوعہ آرٹ پریس کراچی)

مردوں کے مجمع کو خطاب پارلیمنٹ اور اسمبلی میں، نیز مردانہ جلسوں کو عورت خطاب بھی کر سکتی ہے۔ لیکن اسی شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کرے اور بڑی چادر (جلباب) سے اپنے پورے جسم کو سوائے چہرے اور ہاتھوں کے پوری طرح ڈھکے ہو۔ سورہ نمل میں حضرت بلقیس (ملکہ سبا) کے واقعہ کو قرآن کریم نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط انہیں ملا تو انہوں نے اہل دربار کے سامنے تقریر فرمائی تھی جس کے چند الفاظ قرآن کریم نے بیان کر دیئے ہیں۔

قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَؤُا أَفْتُونِي فِي أَمْرِي ۚ مَا كُنتُ قَاطِعَةً أَمْرًا حَتَّىٰ تَشْهَدُونِ ۝ قَالُوا نَحْنُ أُولُو قُوَّةٍ وَأُولُو بَأْسٍ شَدِيدٍ وَالْأَمْرُ إِلَيْكِ فَانظُرِي مَاذَا تَأْمُرِينَ ۝ قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۚ

وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ○ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ○ (۲۷ / ۳۲-۳۵)

ترجمہ [ملکہ سبا نے کہا۔ اے اہل دربار مجھے مشورہ دو میرے اس کام میں۔ میں جب تک تم سب موجود نہ ہو خود کسی بات کا قطعی فیصلہ نہیں کیا کرتی۔ سب نے کہا ہم بڑے طاقتور اور بڑے سخت جنگ جو ہیں۔ باقی سب اختیار آپ کو ہے۔ لہٰذا آپ غور کر لیں آپ کیا حکم دیتی ہیں۔ بلقیس نے کہا کہ بادشاہ جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے برباد کر دیا کرتے ہیں اور آبادی کے معززین کو ذلیل و رسوا کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کا کردار یہی ہوا کرتا ہے۔ میں ان کی طرف کچھ تحائف بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لاتے ہیں۔]

قرآن کریم نے بلقیس رضی اللہ عنہا کے اس خطاب کو جو انہوں نے اپنے اہل دربار کے سامنے کی تھی بغیر کسی نکیر کے نقل کیا ہے۔ اور سلیمان علیہ السلام نے بھی ان کی کسی بات کی تغلیط نہیں فرمائی۔ اس اصول کے ماتحت کہ پچھلی امتوں کے حالات کو اگر قرآن کریم بغیر کسی نکیر کے نقل کرے تو وہ ہمارے لئے بھی حجت ہوتے ہیں۔ حضرت بلقیس کی مجلس دربار یقیناً اس وقت کی پارلیمنٹ یا اسمبلی کے قائم مقام تھی۔ لہٰذا اس کو مردوں کے مجمع کو خطاب کرنے کے جواز کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں جنگ جمل کے موقعہ پر ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خطابات تاریخ و سیر کی تمام کتابوں میں نقل کئے گئے ہیں جن میں انہوں نے اپنے موقف کی توضیح فرمائی اور اسے دینی ضرورت

قرار دیا اور لوگوں کو اپنی امداد اور تائید کے لئے تیار کیا تھا۔ خود ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ عمل ہی ہمارے لئے کافی دلیل تھا پھر خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے کہ ان کے ساتھ صحابہ کرام کی بڑی تعداد تھی جن میں تین حضرات تو عشرہ مبشرہ میں سے تھے جن میں سے کسی نے اس پر انکار نہیں فرمایا یہ دلیل اور قوی ہو جاتی ہے۔

ان واقعات سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ عورتیں مردوں کے مجمعوں خواہ وہ پارلیمنٹ ہو، اسمبلی ہو یا عام سیاسی جلسہ ہو خطاب کر سکتی ہیں اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

مخلوط تعلیم

ہمارے دور کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلام کی رو سے کیا مخلوط تعلیم کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یا لڑکیوں کے لئے الگ زنانہ کالج یا زنانہ یونیورسٹیاں قائم کرنی چاہئیں؟ گذشتہ تصریحات، دور نبوی میں مساجد میں مردوں کے ساتھ باجماعت نمازمیں عورتوں کی شرکت اور حج کے موقعہ پر مخلوط اجتماعات وغیرہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ لڑکیاں اگر اسلامی ہدایاتِ حجاب کی پابندی کے ساتھ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مرد طلباء کے ساتھ تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے مگر وہی شرائط یہاں بھی ملحوظ رکھنی ضروری ہیں کہ لڑکیاں اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں اور بڑی چادر (جلباب) سے اپنے بدن کو ڈھانپ کر جائیں اور نظریں نیچی کئے رہیں۔ ساتھ ہی تعلیم و تربیت سے ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے کہ لڑکے بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور شرم و حیا

کا دامن نہ لڑکیاں ہاتھ سے چھوڑیں نہ لڑکے ہاتھ سے چھوڑیں۔ پورا ماحول اسلامی ہو۔ لڑکوں کی نشستیں الگ ہوں اور لڑکیوں کی نشستیں الگ ہوں۔ اور کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو۔

مغربی انداز معیشت

لیکن میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں قرآنی قوانین بیان کر رہا ہوں، مغربیت کی وکالت نہیں کر رہا ہوں۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ہمارے اس عہد میں حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں اور لڑکیوں اور لڑکوں دونوں پر مغربیت کا بھوت اس قدر سوار ہو چکا ہے کہ شرم وحیا نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ کسی کالج اور یونیورسٹی میں جا کر دیکھ لیجئے جہاں مخلوط تعلیم رائج ہو۔ وہاں کا ماحول آپ کو قطعاً اسلامی نظر نہیں آئے گا۔ معلوم ہوگا کہ آپ کسی مغربی ملک کے کالج یا یونیورسٹی میں آگئے ہیں۔ حجاب اور شرم وحیا سے ان کا دور کا واسطہ بھی باقی نہیں رہا۔ لڑکیاں ایسے لباس میں ملبوس نظر آئیں گی کہ آپ پہچان نہیں سکیں گے کہ آپ کسی مرد کو دیکھ رہے ہیں یا عورت کو۔ ننگا سر، ننگے ہاتھ پاؤں۔ چست اور تنگ چھوٹی سی شرٹ، پتلون نما پاجامہ، بال کٹے ہوئے۔ میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں یہ قوانین مسلمان عورتوں کے لئے بیان کر رہا ہوں جو شرعی حجاب اور پردہ کی پابند اور شرم وحیا کے زیور سے آراستہ ہوں۔ میں ان مغرب زدہ اور فرنگ گزیدہ آوارہ بھنوروں اور تتلیوں کے لئے یہ تشریحات نہیں کر رہا ہوں جن کا رشتہ اسلامی شرم وحیا سے بالکل ہی کٹ چکا ہے۔ ایسے مردوزن کے لئے اسلامی قوانین اگر ناکافی ہو جائیں تو اسلامی شریعت

نے تعزیرات کا دروازہ بھی اسلامی حکومتوں کے لئے کھلا چھوڑا ہے۔ پھر حکومت کو تعزیری قوانین سے کام لینا چاہیئے۔ ان میں ایک تعزیری حکم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم بند کر دی جائے۔

یہ تنبیہہ اس لئے ضروری تھی کہ میری ان گذارشات سے غلط فائدہ حاصل نہ کیا جا سکے۔ موجودہ ماحول میں مخلوط تعلیم کے جواز کا فتویٰ دینا مصلحتِ وقت کے خلاف ہوگا۔ لیکن قانون، قانون ہے۔ قانون کو بدلا نہیں جا سکتا۔ لیکن اپنے مخصوص حالات کے ماتحت قوانین کو جب تک حالات درست نہ ہوں معطل کیا جا سکتا ہے۔

(تنہا سفر کی اجازت)

عورتوں کے سلسلہ میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ عورت تنہا سفر کر سکتی ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق حضرت ابو سعید خدریؓ، ابو ہریرۃؓ ابن عباس، ابن عمر رضی اللہ عنہم سے یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی عورت کے لئے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر محرم کے سفر کرے۔ چنانچہ فقہائے کرام نے اس میں بھی اختلاف کیا ہے کہ اگر کسی عورت کے پاس اتنا مال موجود ہو کہ وہ حج کر سکے لیکن اسے کوئی محرم ساتھ جانے کے لئے میسر نہ ہو تو کیا اس پر حج فرض ہوگا یا نہیں، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حج فرض ہو جائے گا اور اگر اسے قابل

اطمینان رفقاء میسر آجائیں تو انہیں ان کے ساتھ حج کے لئے روانہ ہو جانا چاہیئے۔

امام ابوحنیفہؒ امام احمدؒ ابن حنبل اور فقہاء کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ اس عورت پر حج فرض ہی نہیں ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (۳/۹۷)

ترجمہ [اور اللہ کے لئے لوگوں پر بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے جسے وہاں پہنچنے کی استطاعت ہو۔]

چونکہ عورت کے لئے بغیر محرم کے سفر کرنا ممنوع ہے۔ لہٰذا جس عورت کو سفر حج پر جانے کے لئے محرم میسر نہ آسکے اسے حج کرنے کی استطاعت حاصل نہیں ہوسکی۔ لہٰذا اس پر حج فرض ہی نہیں ہوا۔

(بدایۃ المجتہد ص ۳۲۲ ج ۱)

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو کہ عورت کو بغیر محرم کے سفر کرنا جائز نہیں ہے تعبدی حکم نہیں سمجھا بلکہ مصلحت پر مبنی حکم سمجھا ہے۔ عورت چونکہ عموماً کمزور ہوتی ہے اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں راستے مامون نہیں تھے۔ کفار و مشرکین سے برابر جنگیں ہو رہی تھیں اس لئے مصلحت وقت کا تقاضا تھا کہ عورتیں بغیر محرم کے سفر نہ کریں۔ اس لئے آپ نے اس سے منع فرمایا تھا۔ لیکن اگر راستے محفوظ ہوں اور ایسے معتبر اور مامون رفقائے سفر میسر ہوں جن کے ساتھ سفر کرنے میں کوئی اندیشہ لاحق نہ ہو تو انہوں نے سفر حج پر جانے کی اجازت دیدی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا یہ خیال بڑی حد تک درست ہے۔ لہٰذا عورت کے لئے سفر میں محرم کی ہمراہی کی پابندی ضروری نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ اطمینان ہونا چاہیئے کہ سفر میں عورت کو کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہیں ہے تو وہ سفر کر سکتی ہے۔

عام حالات میں فقہاء نے تین دن کے سفر کی قید لگائی ہے کیوں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں اونٹوں پر سفر ہوا کرتا تھا اور ایک آدمی ایک دن میں سولہ میل سفر کر سکتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اسی حساب سے اڑتالیس میل کے سفر کی تحدید فرمادی ہے کہ اتنا لمبا سفر جو اڑتالیس میل کا ہو عورت کو بغیر محرم کے نہیں کرنا چاہیئے مگر یہ تحدید آج کل بے معنیٰ ہو گئی ہے۔ کیونکہ آج چھ گھنٹے میں ایک عورت ہوائی جہاز کے ذریعہ سے حجاز مقدس پہنچ سکتی ہے اور بتیس گھنٹے میں ٹرین سے کراچی سے پشاور پہنچ سکتی ہے۔ بہر حال یہ تقییدات اب بے معنیٰ ہیں۔ لوگوں کو خود ہی حالات و کوائف کے ماتحت اس کا فیصلہ کرنا چاہیئے اور عورتوں کے ضعف اور کمزوری کو ملحوظ رکھتے ہوئے نیز ملک میں امن و امان کی صورت حالات کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرنا چاہیئے کہ کتنا سفر وہ تنہا کر سکتی ہے اور کتنا سفر بغیر معتبر اور مامون رفقار کے اسے نہیں کرنا چاہیئے۔

عورت کی دیت

ایک مسئلہ عورتوں کی دیت کا بھی ہے۔ جس سے عورتوں کی کمتری

پر استدلال کیا جاتا ہے چنانچہ فقہائے اُمت میں سوائے امام ابن عُلیہؒ اور امام ابوبکر اصمؒ کے تمام فقہاء اس کے قائل ہیں کہ عورت کی دیت (یعنی خون بہا) مرد کا نصف ہوتا ہے۔ یعنی مرد کی دیت سو اونٹ مقرر ہے تو عورت کی دیت پچاس اونٹ ہوگی۔ امام ابن عُلیہ اور امام ابوبکر اصم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

"ہر مؤمن جان میں سو اونٹ ہیں"

ہمارے محدثین فرماتے ہیں کہ یہ قول شاذ ہے جو اجماع صحابہ اور سنت نبوی کے خلاف ہے۔ چنانچہ عمروؓ ابن حزم کی کتاب میں مذکور ہے کہ عورت کی دیت مرد سے آدھی ہوگی اور یہ حکم اس حکم سے زیادہ خاص ہے جو ابن عُلیہؒ اور اصمؒ نے نقل کیا ہے۔ یہ دونوں حکم ایک ہی مکتوب میں موجود ہیں۔ لہٰذا جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے اس حکم کی تفسیر اور تخصیص ہو جاتی ہے جو ان دونوں حضرات نے بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ابن المنذر اور ابن عبدالبر نے فرمایا ہے کہ ان مذکورہ دو حضرات کے علاوہ تمام اہل علم کا اس پہ اتفاق ہے کہ عورت کی دیت مرد سے نصف ہوتی ہے۔ ابن قدامہ کی المغنی سے نقل کرتے ہوئے والد محترم شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہوتی ہے، یہی ہمارے اصحاب (حنفیہؒ) کا مذہب ہے۔

(اعلاء السنن ص۱۴۶ ج۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ فریئر روڈ کراچی ۱۳۸۶ھ)

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

اس کا تفصیلی بیان تو ہم کتاب الحدود کے ذیل میں قصاص اور دیت کے بیان میں کریں گے۔ لیکن یہاں بھی کچھ اشارات کرنے ضروری ہیں۔ شریعت اسلامیہ نے قتل نفس کے اندر اگر وہ عمداً یا خطأً کسی سے سرزد ہو تو قصاص کا حکم دیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ط فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ط ذٰلِکَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَرَحْمَةٌ۔

(۲/۱۷۸)

ترجمہ [اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم پر قصاص فرض کر دیا گیا ہے مقتولین کے بارے میں (لہٰذا یہی) آزاد آدمی آزاد کے بدلہ میں، یہی غلام، غلام کے بدلہ میں، یہی عورت، عورت کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ تو جس کو اس کے بھائی نے کچھ معاف کر دیا ہو اور کم خوں بہا پر رضا مندی ظاہر کر دی ہو تو دستور کے مطابق اس سے مطالبہ کرنا چاہیئے اور قاتل کو حسن سلوک کے ساتھ اسے ادا کر دینا چاہیئے۔ یہ اللہ کی طرف سے تمہارے لئے تخفیف اور رحمت ہے (جو پچھلی شریعتوں میں نہیں تھی)۔]

قصاص کا حکم شریعت موسوی میں بھی تھا اور اس میں دیت کی رعایت نہیں تھی۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَکَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ۔ (۵/۴۵)

ترجمہ [اور ہم نے تورات میں (بنی اسرائیل پر) فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخم بھی بدلہ میں برابر ہوں گے۔]

چنانچہ شریعت اسلامی میں اسی کے مطابق قتل عمد میں اجماعی طور پر عمل ہوتا ہے۔ اگر کوئی مرد کسی مرد یا عورت یا بچہ کو عمداً قتل کر دے تو اس مرد کو قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ اگر دس مرد مل کر اجتماعی طور پر ایک عورت یا کسی بچہ کو قتل کر دیں تو اس کے بدلہ میں دس مرد قصاص میں قتل کئے جائیں گے۔ کیونکہ قرآن کریم نے جان کے بدلے جان کا حکم دیا ہے۔ اور جان جیسے ایک مرد میں ہوتی ہے، عورت اور بچہ میں بھی ہوتی ہے۔ دونوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے قتل میں اصل حکم قصاص ہی کا ہے۔ اسلامی شریعت نے قتل خطا میں قصاص کے بجائے دیت کی ایک رعایت بھی رکھی ہے جسے اس نے تخفیف و رحمت بتایا ہے۔

قتل عمد کے علاوہ قتل خطا میں اس نے ایک غلام کو آزاد کرنے اور دیت ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا ۚ (۴/۹۲)

ترجمہ [اور کسی مؤمن کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کر دے اِلّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ تو جو کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے تو اسے ایک غلام آزاد کرنا ہوگا اور مقتول کے ورثاء کو دیت

(خون بہا) ادا کرنی ہوگی۔ مگر اس صورت میں کہ ورثاء معاف کر دیں (دیت سے معافی مل سکتی ہے)۔]

یہاں دو باتیں ذہن میں رکھیئے اول یہ کہ قتل کی اصل سزا قتل تھی اور وہ سخت ترین سزا تھی۔ اس میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ آدمی کسی مرد کو قتل کرے، کسی عورت کو قتل کرے یا کسی بچہ کو قتل کرے قتل عمد میں قاتل کو قتل ہی کیا جائے گا۔ نیز یہ کہ یہ فرد کے خلاف نہیں بلکہ مملکت کے خلاف جرم ہے کیونکہ خود مملکت اپنے باشندوں کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔

دوم یہ کہ قتل خطا میں حق تعالیٰ نے رعایت دی ہے جسے اس نے تخفیف و رحمت قرار دیا ہے یعنی یہ کہ قتل خطا میں قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ دیت دینی ہوگی۔ اس میں قرآن کریم نے مرد، عورت یا بچہ کے قتل میں کوئی فرق یا امتیاز نہیں بتایا۔ اس نے صرف یہ فرمایا ہے کہ مقتول کے ورثا کو دیت ادا کرنی ہوگی۔

اس کے بعد یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کافر کو قتل کر دے یعنی کسی ایسے کافر کو قتل کر دے جس سے تمہارا ذمہ داری کا معاہدہ ہو اور قتل کسی غلطی کا نتیجہ ہو تو اس میں بھی ایک غلام کو آزاد کرنا اور مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرنی ہوگی۔ سورۂ نساء میں ہی مذکورہ آیت میں ذرا آگے چل کر ہے۔

وَاِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهۡلِهٖ وَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ ۔ (۴/۹۲)

ترجمہ [اور اگر مقتول کسی ایسی قوم کا فرد ہو کہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان معاہدہ ہو تو مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرنی ہوگی

اور ایک مؤمن غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔]

یہاں اس بات کو پھر ذہن میں رکھیئے کہ قتل خطائ کے پہلے حکم کے الفاظ جو کسی مؤمن کے قتل کے سلسلے میں تھے یہاں بھی بعینہٖ وہی الفاظ ہیں جو کسی معاہد کافر کے سلسلے میں بیان ہوئے ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اب صورت مسئلہ یہ ہے کہ حضرت امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ ذمی کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہوگی۔ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ پوری دیت دینی ہوگی۔ اور طرفین کے پاس اپنے اپنے مسلک کی تائید میں احادیث و روایات موجود ہیں جنہیں تفصیل کے ساتھ والد محترم حضرت علامہ شیخ الاسلام ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کر دیا ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

(اعلاء السنن ص ۱۴۰-۱۴۳ ج ۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی ۱۳۸۶ھ)

بعینہٖ یہی صورت عورت کی دیت میں بھی ہے کہ امام ابن عُلیہ اور امام ابو بکر اصم نے اپنے مسلک کی تائید میں بھی احادیث پیش کی ہیں اور جمہور فقہاء نے بھی اپنی تائید میں روایات پیش کر دی ہیں جیسا کہ ذمی کی دیت میں دونوں طرف احادیث موجود ہیں۔

حضرت علامہ شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ فقہاء کے اس تضاد کی معذرت میں فرماتے ہیں کہ۔

چونکہ روایات میں تضاد پایا جاتا ہے تو ہم نے (ذمی کی دیت میں) مکمل دیت کی روایات کو قبول کر لیا۔ کیونکہ وہ آیت قرآنی کے ظاہر مفہوم کے مطابق تھیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے جس طرح

قتل مؤمن کے قتل کے سلسلہ میں دیت واجب فرمائی ہے اسی طرح معاہد کے قتل میں بھی دیت واجب فرمائی ہے۔ اور ظاہر آیت کا مفہوم مساوات ہے کیونکہ دونوں جگہ الفاظ ایک ہی استعمال ہوئے ہیں۔ اگر تم کہو کہ عورت بھی تو آیت میں داخل ہے مگر اس کی دیت مرد کے برابر نہیں ہے تو ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ معاہد کی دیت بھی مسلمان کی دیت کے برابر نہ ہو۔ اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ ہم عورت کی دیت میں کمی کے قائل اجماع اور ان آثار کی وجہ سے ہیں جو اس سلسلہ میں وارد ہوتے ہیں۔ جن کے معارض اتنے آثار نہیں ہیں۔ اگر معاہد کے بارے میں بھی ایسے ہی آثار وارد ہوتے تو ہم ضرور اس کے بھی قائل ہو جاتے۔ لیکن تم دیکھ چکے ہو کہ آثار (احادیث و روایات) آیت قرآنی کے ظاہر مفہوم کے موافق اور مخالف دونوں طرح کے موجود ہیں تو ان آثار کو قبول کر لینا جو ظاہر آیت کے موافق ہیں بہتر اور اولیٰ ہو گا۔ حاصل یہ ہے کہ آیت کا ظاہری مفہوم مرد اور عورت کی دیت کی مساوات بتا رہا ہے جیسا کہ معاہد اور مسلم کی دیت کی مساوات کو بھی بتا رہا ہے۔ لیکن ہم نے (عورت کے معاملہ میں) آیت کو اپنے ظاہری مفہوم سے آثار اور اجماع کی وجہ سے موڑ لیا ہے۔ معاہد کی صورت یہ نہیں ہے کیونکہ وہاں مختلف آثار وارد ہوئے ہیں۔ بعض آثار اس کے متقاضی ہیں کہ آیت کو اس کے ظاہری مفہوم سے ضرور

موڑا جائے اور بعض آثار اس کے متقاضی ہیں کہ آیت کو اپنے ظاہری مفہوم پر ضرور باقی رکھا جائے تو آیت کو ظاہری مفہوم سے موڑنا ضروری نہ ہوا اور ان آثار پر عمل کیا جائے گا جو ظاہر آیت کے موافق ہیں نہ کہ ان آثار پر جو ظاہر آیت کے مخالف ہیں۔[1]

(اعلاء السنن ص۱۴۲ ج۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

اس کا حاصل یہ ہوا کہ حنفیہ کے نزدیک بھی قرآن کریم کی آیت (۴/۹۲) اپنے ظاہر مفہوم کے لحاظ سے عورت کی دیت مکمل واجب ہونے کو بتا رہی ہے اور اس کا تقاضا یہی ہے کہ ہر مؤمن ، مرد اور عورت کی پوری دیت واجب ہونی چاہیئے جیسا کہ معاہد کے سلسلہ میں اسی آیت

---

[1] واضح رہے کہ میں اکثر و بیشتر اعلاء السنن کے حوالے اس لئے نہیں دیتا کہ یہ میرے والد ماجد کی تصنیف ہے بلکہ اس لئے دیتا ہوں کہ یہ کتاب دوستوں اور دشمنوں سب ہی کے نزدیک فقہ حنفی کی تائید میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ اپنے موضوع پر اس سے بہتر کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے بقول اس کے مصنف اپنے وقت کے امام محمدؒ تھے۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کسی تحریر پر تنقید کر کے مجھے قطعاً کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن میری تنقید حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر نہیں ہوتی بلکہ اس نقطۂ نظر پر ہوتی ہے جس کے ترجمان حضرت والد صاحب مرحوم ہیں حق تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور اچھے کاموں میں مجھے ان کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(۴/۹۲) کے ظاہر الفاظ کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لیکن آیت کریمہ کے ظاہر مفہوم کے خلاف عورت کے سلسلہ میں کثرت سے ایسے آثار ملتے ہیں جن سے عورت کی دیت نصف معلوم ہوتی ہے۔ معاہد کی دیت کے سلسلہ میں جو روایات و آثار ملتے ہیں وہ دونوں قسم کے ہیں۔ ایسے آثار بھی ہیں جن سے معاہد کی پوری دیت معلوم ہوتی ہے اور ایسے بھی ہیں جن سے معاہد کی نصف دیت معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا معاہد کے سلسلہ میں تو ہم نے ان آثار کو ترجیح دے لی جو قرآن کریم کے ظاہر کے مطابق تھے۔ لیکن عورت کے سلسلہ میں چونکہ پوری دیت کے حق میں اس کثرت سے آثار نہیں تھے بلکہ نصف دیت کے حق میں زیادہ تر آثار موجود تھے اور پھر اجماع بھی نصف دیت کے حق ہی میں تھا اس لئے ہم نے آثار اور اجماع کے اتباع میں قرآن کریم کی آیت کریمہ کو اس کے ظاہری مفہوم سے موڑ لیا اور کہہ دیا کہ عورت کی نصف دیت ہونی چاہیئے۔

حق تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں (اگر میں غلطی نہیں کر رہا) اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصل ماخذ شریعت قرآن کریم نہیں ہے بلکہ روایات و آثار ہیں۔ اور روایات و آثار کی وجہ سے نیز اجماع کی وجہ سے ہم قرآن کریم کی آیات کو ان کے ظاہر مفہوم سے موڑ لینے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اگر حضرات فقہائے حنفیہ رح کا موقف یہی ہے تو پھر ان دعووں کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے کہ قرآن کریم کے اطلاق کو اخبار آحاد سے مقید نہیں کیا جا سکتا نیز اخبار آحاد سے قرآن کریم کے عام حکم کو خاص نہیں کیا جا سکتا اور اخبار آحاد سے قرآن کریم کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم کے عام کو خاص اور مطلق کو مقید کرنا درحقیقت قرآن کو اخبار احاد سے

منسوخ کرنا ہی تو ہے۔

خود شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تمام صلوات میں سورۂ فاتحہ کی قرارت کی عدم فرضیت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اور ہمارے اصحاب نے اپنے مسلک پر، یعنی سورۂ فاتحہ کے خصوصی طور پر فرض نہ ہونے پر حق تعالیٰ کے ارشاد" فاقرءوا ماتیسر من القرآن "سے استدلال کیا ہے کیونکہ لفظ "ما" عام ہے۔ ہر اس قرأت کو شامل ہے جو بہ سہولت ہو سکے۔ وہ سورۂ فاتحہ ہو یا کچھ اور ہو، اور خبر واحد کتاب اللہ کے عام حکم کو خاص کر دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ ہمارے اصول فقہ میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ عام اپنے مشمولات کے لئے قطعی ہوتا ہے۔ اور دلیل ظنی، قطعی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔" الخ

(اعلاء السنن ص ۱۷۲ ج ۲ مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ سنٹر کراچی مطبوعہ مارچ ۱۹۶۵ء)

صاحب نور الانوار فرماتے ہیں کہ:-

اور ہمارے نزدیک مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ مطلق اور مقید دونوں ایک ہی حادثہ میں پائے جائیں کیونکہ دونوں پر عمل کرنا ممکن ہے۔ ان دونوں میں کوئی تضاد اور تنافی نہیں ہے چنانچہ ظہار میں صوم اور غلام کو آزاد کرنے میں ضروری ہے کہ بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے پہلے کر دیئے جائیں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے میں قرآن نے یہ قید نہیں لگائی۔ وہ اس سے عام ہے کہ بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہو یا بعد میں ہو۔ اور ایک حادثہ ہی میں ایسا ہوتا ہے دو حادثوں میں اگر ایسا ہو کہ ایک مطلق ہو اور دوسرا مقید تو اس میں بطریق اولیٰ

ایسا ہی کیا جائے گا (یعنی مطلق کو مقید کی وجہ سے مقید نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اپنے اطلاق پر باقی رکھا جائے گا۔)

(نور الانوار ص۱۵۹ مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل کراچی)

واضح رہے کہ صاحب نور الانوار نے حنفیہ کا اصول یہ بتایا ہے کہ قرآن کے مطلق حکم کو خود قرآن ہی کے مقید حکم سے مقید نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اگر کسی نے بیوی سے ظہار کر لیا (یعنی اپنی بیوی کو ماں بہن یا کسی محرمات سے تشبیہ دے دی) تو قرآن کریم نے اس کے تین کفارے بیان کئے ہیں۔

① غلام آزاد کرے۔
② دو مہینے روزے رکھے۔
③ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

پہلے دونوں کفاروں میں قرآن کریم نے یہ قید لگا دی ہے کہ یہ دونوں کفارے بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے ادا کئے جائیں۔ لیکن تیسرے کفارے میں یعنی مسکینوں کو کھانا کھلانے میں اس قید کا ذکر نہیں فرمایا ہے اس کو مطلق رکھا ہے۔ تینوں کفارے ایک ہی حادثہ سے متعلق ہیں۔ تو تیسرے کفارے میں بھی یہ قید لگانا کہ یہ بھی بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہو صحیح نہیں ہوگا۔ تو اگر خود قرآن کے مقید حکم سے قرآن کے مطلق حکم کو مقید نہیں کیا جا سکتا تو روایات و آثار کے ذریعہ سے قرآن کے مطلق حکم کو کس طرح مقید کیا جا سکے گا۔

رہ گیا اجماع تو اول تو وہ تیسرے درجہ کی دلیل ہے۔ کیونکہ دلائل شرعیہ کی ترتیب یوں ہے۔ اول کتاب اللہ دوم سنت رسول اللہ، سوم

اجماع۔ چہارم قیاس۔ تو جب سنت سے کتاب اللہ کے عام کو خاص اور مطلق کو مقید نہیں کیا جا سکتا تو تیسرے درجہ کی دلیل یعنی اجماع سے یہ کیسے ممکن ہو سکے گا۔

علاوہ ازیں اجماع تو یہ ہے کہ ایک ہی زمانہ کے تمام لوگ (علماء وفقہاء) زبان سے اس بات کا اعلان کریں کہ ہم نے فلاں مسئلہ پر اتفاق کر لیا ہے یا سب کے سب عملاً کسی کام کو شروع کر دیں جیسے مزارعت، مضاربت اور شرکت وغیرہ۔ رہ گئی یہ بات کہ کسی نے یا چند آدمیوں نے کوئی بات کہی یا کوئی کام کیا اور دوسرے لوگوں نے اس پر نکیر نہیں کی تو یہ حقیقی اور اصل اجماع نہیں ہے۔ اسے اجماع سکوتی کہتے ہیں۔ جس کا امام شافعیؒ نے انکار کیا ہے۔ کیونکہ دوسروں کی خاموشی جیسے موافقت کے لئے ہو سکتی ہے رعب اور خوف کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ان کی رضامندی کی دلیل ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے جب عَوْل کے خلاف (ترکہ کی تقسیم میں یہ اصطلاح آتی ہے) اپنے دلائل پیش کئے اور لوگوں نے ان سے کہا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان کے سامنے یہ دلائل کیوں پیش نہیں کئے تھے۔ تو انہوں نے یہی جواب دیا تھا کہ وہ بڑے رعب و داب والے آدمی تھے مجھے ان سے ڈر لگا اور میں ان کے درہ کے خوف سے نہیں بول سکا۔ امام مالکؒ نے صرف اہل مدینہ کے اتفاق کو تسلیم کیا ہے۔ امام احمد ابن حنبلؒ نے سرے ہی سے اجماع کا انکار فرما دیا ہے ______

______ بہرحال اجماع سکوتی کو صرف حنفیہ نے تسلیم کیا ہے اور کسی نے تسلیم نہیں کیا۔ لہٰذا جب تک یہ ثابت

نہ کر دیا جائے کہ تمام صحابہ فلاں مقام پر جمع ہوئے تھے۔ بحث ومباحثہ کر کے انہوں نے یہ اعلان فرمادیا تھا کہ ہم اس بات پر اتفاق کرتے ہیں اس وقت تک حقیقی اجماع کا دعویٰ قابل تسلیم نہیں ہوسکتا تو کیا کسی وقت تمام صحابہ ایک جگہ پر جمع ہوئے تھے اور انہوں نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ ہم اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ عورت کی دیت مرد سے آدھی ہوگی؟ اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا قرآن کریم نے جو ایک عام اور مطلق حکم دیا ہے کہ غلطی سے اگر کوئی کسی مومن کو قتل کر دے تو اسے ایک غلام آزاد کرنا اور ورثاء کو پوری دیت ادا کرنی ہوگی یہ حکم مردوں کے لئے بھی ہے اور عورتوں کے لئے بھی ہے۔ اسے نہ روایات و آثار سے خاص اور مقید کیا جا سکتا ہے نہ اجماع سکوتی سے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حکم قرآن کے مطابق نہیں ہے۔ لہٰذا امام ابن علیہؒ اور امام ابوبکر اصمؒ کے قول کو ترجیح دینی ہوگی۔

واللہ اعلم۔

کیا عورت قاضی بن سکتی ہے؟

قاضی اور جج بننے کے متعلق فقہ حنفی کے امام وقت علامہ بدرالدین کاشانیؒ المتوفی ۵۸۷ھ نے جو اصول بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ۔

اھلیۃ القضاء تدور مع اھلیۃ الشھادۃ۔

(البدائع والصنائع ج۷ ص۳)

جہاں شہادت کی اہلیت ہوتی ہے وہاں قضاء کی اہلیت بھی ہوتی ہے۔

اسی اصول کے ماتحت فقہاء حنفیہ نے تصریح کی ہے کہ۔

"اموال کے متعلق عورت کا قاضی ہونا جائز ہے"

چنانچہ علامہ ابن رشد قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ۔

اسی طرح قضاء کے سلسلہ میں قاضی کے مذکر ہونے کی شرطیں بھی اختلاف ہے۔ چنانچہ جمہور نے کہا ہے کہ صحتِ فیصلہ میں قاضی کا مرد ہونا ضروری ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ اموال کے مقدمات میں عورت کی قضاء صحیح ہے۔ طبریؒ نے کہا ہے کہ عورت ہر چیز میں مطلقاً حاکم ہو سکتی ہے۔ عبدالوہاب نے کہا ہے کہ میں فقہاء کے درمیان اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں دیکھتا کہ قاضی کا آزاد ہونا ضروری ہے۔ تو جس نے عورت کی قضاء کو رد کر دیا ہے اس نے اس مسئلہ کو امامت کبریٰ کے مشابہ سمجھا ہے اور غلام پر عورت کو قیاس کر لیا ہے کیونکہ عورت کی حرمت و عزت میں بھی غلام کی طرح کمی ہوتی ہے اور جس نے اس کے حکم کو اموال میں جائز قرار دیا ہے تو اس نے اموال میں اس کی شہادت کے جواز کی مشابہت کی وجہ سے اسے جائز قرار دیا ہے اور جس نے اس کے فیصلہ کو مطلقاً ہر چیز میں نافذ قرار دیا ہے، اس کا کہنا یہ ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو لوگوں کے درمیان فیصلہ کر سکے تو اس کا فیصلہ جائز ہو گا بجز ان صورتوں کے جنہیں اجماع نے مخصوص کر دیا ہو، مثلاً امامت کبریٰ۔ لیکن آزادی کے شرط ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(بدایۃ المجتہد صفحہ ۴۶۰ ج ۲)

جیسا کہ شہادت کے بیان میں اس سے پہلے گذر چکا ہے کہ فقہائے

حنفیہؒ صرف اموال کے بارے میں عورتوں کی شہادت کو قبول کرنے کے حق میں ہیں۔ لہٰذا اس قاعدہ کی بنیاد پر کہ۔

"جہاں شہادت کی اہلیت ہوتی ہے وہاں قضاء کی اہلیت بھی ہوتی ہے۔"

فقہائے حنفیہؒ اموال کے بارے میں چونکہ عورتوں کی شہادت قبول کرتے ہیں اس لئے اموال ہی کے بارے میں وہ عورتوں کی قضاء کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔ دوسرے معاملات میں چونکہ ان کی شہادت ہی قابل قبول نہیں ہوتی اس لئے ان کی قضاء بھی نافذ نہیں ہوگی۔ اس موضوع پر ہم عورتوں کی شہادت کے باب میں بتا چکے ہیں کہ اس سلسلہ میں کہی گئی دونوں باتیں ناقابل فہم ہیں۔ یہ بھی کہ چونکہ صرف ایک آیت میں (۲ ـــ ۲۸۲) جو قرض لین دین یعنی مالیات سے متعلق ہے چونکہ عورتوں کی گواہی کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے اس لئے مالیات ہی میں عورتوں کی گواہی معتبر ہو سکتی ہے۔ باقی دیگر آیات میں صراحت کے ساتھ عورتوں کی شہادت کا ذکر نہیں فرمایا گیا اس لئے وہاں عورتوں کی شہادت معتبر نہیں ہو سکتی۔ یہ بات اس لئے قابل فہم نہیں ہے کہ عدمِ ذکر، عدمِ شیئ کو مستلزم نہیں ہوا کرتا اگر دیگر آیات میں عورتوں کی شہادت کا صراحتہً ذکر نہیں ہے تو عورتوں کی شہادت کی نفی بھی تو نہیں کی گئی ہے۔ کیا جن احکام میں عورتوں کا صراحتہً ذکر نہ کیا جائے اُن کی مخاطب عورتیں نہیں ہوتیں؟ قرآن کریم میں زیادہ تر احکام و ہدایات مذکر صیغوں ہی میں فرمائی گئی ہیں تو کیا عورتیں ان احکام و ہدایات سے مستثنیٰ ہیں؟ اور کیا یہ سمجھا

جائے کہ یہ احکام صرف مردوں ہی کے لئے ہیں ؟

دوسری یہ بات بھی قابل فہم نہیں ہے کہ اگر دیگر معاملات میں عورتوں کی شہادت تسلیم بھی کی جائے تو اسی نصاب سے قابل تسلیم ہوگی جو اس کا نصاب قرض لین دین یعنی مالیات میں بتایا گیا ہے کہ اول تو دو مرد ہوں اور دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ کیونکہ اصول فقہ میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ مطلق آیات اپنے اطلاق پر قائم رہتی ہیں۔ کسی مقید آیت سے مطلق آیت کی تقیید صحیح نہیں ہوا کرتی۔ خواہ وہ مقید حکم ایک ہی واقعہ سے متعلق کیوں نہ ہو۔ (تفصیل گذر چکی ہے)

نیز یہ کہ مالی معاملات کو دیگر معاملات سے الگ کرنا انتہائی مشکل ہے۔ ہر معاملہ، مالی معاملہ بن سکتا ہے۔ ایک شخص نکاح کرتا ہے اور طے کرتا ہے کہ وہ مہر بعد میں عندالطلب یا اتنے عرصے کے بعد ادا کرے گا۔ کسی شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا اور مقتول کے ورثائنے دیت یا خون بہا پہ صلح کر لی۔ ایک شخص نے مکان یا دکان کرایہ پر دی اور طے پایا کہ وہ ماہوار اتنی رقم کرایہ میں ادا کرے گا۔ ایک شخص نے کسی کو ملازم رکھا اور طے کیا کہ وہ اتنی رقم ماہانہ تنخواہ ادا کرے گا۔ یہ سارے معاملات مالی ہیں یا مالی بن جاتے ہیں۔ ان میں آپ عورتوں کی شہادتیں قبول کریں گے یا نہیں ؟ عہ

عہ مجھے خوب یاد ہے اور بہت سوں کو یاد ہوگا کہ جب غیر منقسم ہندوستان میں عارضی حکومت (NTERIM GOVERNMENT) بنائی گئی تو کانگریس نے اپنے خیال میں اہم محکموں پر قبضہ کر لیا اور وزارت مالیات غیر اہم سمجھ کر مسلم لیگ

پھر ہمارے فقہاء خود تسلیم فرماتے ہیں کہ ایسے معاملات جو مخصوص نسوانی معاملات کہلاتے ہیں۔ ان میں صرف عورتوں کی گواہی معتبر ہوتی ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں (مثلاً ولادت و رضاعت وغیرہ) صرف ایک عورت کی گواہی معتبر ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کا کوئی تعلق مالیات سے نہیں ہوتا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کی شہادت مالیات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

لہٰذا چونکہ عورت کی شہادت اصول کے مطابق تمام معاملات میں قابل قبول ہونی چاہیئے اس لئے اس کی قضاء بھی تمام معاملات میں صحیح ہونی چاہیئے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ عورتوں کو قاضی اور جج بنانا جائز ہے اور ان کے فیصلے شرعاً صحیح ہوں گے بشرطیکہ ان میں اس منصب کی اہلیت اور صلاحیت موجود ہو (جس طرح بغیر اہلیت وصلاحیت کے مردوں کے لئے بھی یہ منصب جائز نہیں ہے)۔

عورت کی ذہنی صلاحیتیں

عورت کی فکری صلاحیتوں کے متعلق قرآن کریم اور سنت نبوی کی ہدایات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں تمام فکری

کو پیش کی گئی۔ قائداعظمؒ نے مسلم فائننس حکام کے مشورہ سے یہ پیشکش قبول کرلی اور وزارت مالیات کا قلمدان لیاقت علی خان مرحوم کے حوالہ ہوا، تو انہوں نے مالیات پر قبضہ کرکے ساری حکومتی مشینری کو ناکارہ بنادیا تھا۔ کیونکہ ہر منسٹری کا واسطہ وزارت مالیات سے پڑتا تھا اور وہ ان کے ہر کام میں روڑے اٹکا دیتے تھے۔ جواہر لعل نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل کو زچ آکر تقسیم کا اصول ہی بالآخر تسلیم کرنا پڑا تھا۔ تو وہ کون سا معاملہ ہو سکتا ہے جو بالآخر مالیات کا مسئلہ نہ بن جاتا ہو۔

صلاحیتوں میں مردوں سے کم تر نہیں ہوتیں۔ اگر کچھ صلاحیتوں میں وہ مردوں سے کم تر بھی ہیں تو بعض دوسری صلاحیتوں میں وہ مردوں سے برتر بھی ہیں۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کے شارح علامہ اکمل الدین البابرتی نے اپنی معلومات کی روشنی میں عورت کی ذہنی صلاحیتوں کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"نفس انسانی کی قوتوں کو چار درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا درجہ یہ کہ مطلقاً سوچنے سمجھنے کی استعداد موجود ہو۔ یہ استعداد فطرتاً ہر شخص میں پائی جاتی ہے۔ دوسرا درجہ یہ کہ جزئیات میں حواس کے استعمال سے بدیہی باتیں دریافت ہونے لگیں (مثلاً دیکھ کر رنگ کا، اور چکھ کر ذائقہ کا تعین وغیرہ) اور عقل اس قابل ہو کہ ان میں غور و فکر کے ذریعہ خالص فکری حقائق کا اکتساب کرنے لگے۔ اس کو اصطلاح میں "العقل بالملکہ" کہتے ہیں۔ اس صلاحیت کے بعد ہی آدمی پر شریعت کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ بدیہی حقیقتوں سے جو نظریات مستنبط ہو رہے ہیں ان کے ادراک میں کسی قسم کی دقت اور محنت پیش نہ آئے۔ اس کا نام "العقل بالفعل" ہے۔ چوتھا درجہ یہ کہ یہ نظریات ہمیشہ ذہن میں اس طرح مستحضر ہوں گویا کہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اس کو "عقل مستفاد" کہا جاتا ہے۔"

چاروں درجوں کی تفصیل دینے کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

"شریعت کی ذمہ داریوں کا دارومدار جس صلاحیت عقل پر ہوتا ہے

یعنی "العقل بالملکہ" (عقل کا دوسرا درجہ) عورتوں میں اس کی کمی نہیں ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جزئیات میں حواس کو استعمال کر کے بدیہیات کو پا لیتی ہیں۔ اور اگر کسی بات کو فراموش کر جاتی ہیں تو یاد دہانی کے بعد ذہن میں حاضر بھی کر لیتی ہیں۔ اگر اس کی صلاحیت میں کسی قسم کا نقص ہوتا تو دین کے جن ارکان کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی گئی ہے، عورتوں کو اس سے مختلف ارکان کی تکلیف دی جاتی حالانکہ صورتِ واقعہ یہ نہیں ہے۔ بلکہ دونوں پر ایک ہی طرح کی ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں ناقصات العقل جو فرمایا ہے تو اس سے العقل بالفعل یعنی عقل کا تیسرا درجہ مراد ہے۔

(العنایہ مطبوعہ بر حاشیہ فتح القدیر ص ۸ ج ۶)

امام بابرتیؒ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ عورتوں میں "العقل بالفعل" اور "عقل مستفاد" یعنی عقل کے تیسرے اور چوتھے درجہ میں کمی اور نقص ہوتا ہے۔ عورتوں کو اسی وجہ سے ناقصات العقل کہا جاتا ہے۔

علامہ بابرتیؒ نے "العقل بالفعل" اور "عقل مستفاد" کی جو تعریف کی ہے کہ:

بدیہی حقیقتوں سے جو نظریات مستنبط ہو رہے ہیں ان کے ادراک میں کسی قسم کی دقت اور محنت پیش نہ آئے (العقل بالفعل) اور یہ کہ نظریات ہمیشہ ذہن میں اس طرح مستحضر ہوں گویا آنکھوں کے سامنے ہیں (عقل مستفاد) وہ غالباً علامہ موصوف کے عہد میں عورتوں

میں نہ پائے جاتے ہوں گے یا ناقص پائے جاتے ہوں گے۔ لیکن ہمارے اس عہد میں جبکہ عورتوں میں بہترین وکیل، بیرسٹرز، انجینرز، فلاسفرز، سائنسدان، میڈیکل پریکٹیشنرز، فلائٹ انجینرز خود ہمارے پس ماندہ ملک میں بہتر سے بہتر موجود ہیں اور ان کی اہلیت اور قابلیت کا لوہا سب ہی ماننے پر مجبور ہیں ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے بھی تو مشاہدات اور تجربات اس کی تکذیب کر رہے ہیں؎۔

علامہ ابن الہمام حنفیؒ اپنی یہ تحقیق پیش فرماتے ہیں:۔

"شریعت نے عورت کے متعلق یہ کہا ہے کہ اس کی عقل ناقص ہوتی ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے اندر عقل کی ملی اس عد

؎ مجھے یاد ہے کہ ایک مجلس میں جس میں بڑے سائنسدان اور فلاسفر حاضر تھے یہ موضوع زیر بحث تھا کہ عورتوں کے لئے الگ یونیورسٹیاں قائم ہونی چاہئیں۔ فلسفہ کے ایک ڈاکٹر (پی ایچ ڈی) نے فرمایا تھا کہ عورتوں کی الگ یونیورسٹی قائم کرنا فی الحال مشکل ہے۔ کیونکہ صورتِ حال یہ ہے کہ سائنس کے تمام مضامین میں بہتر سے بہتر عورتیں موجود ہیں جو یونیورسٹی کے معیار کی کلاسوں کو بخوبی پڑھا سکتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مختلف مضامین سے متعلق مختلف نام بھی پیش کئے تھے۔ لیکن آرٹس کے مضامین کی میں ایسی عورتیں نہیں مل سکیں گی جو یونیورسٹی کے معیار کی کلاسوں کو بخوبی پڑھا سکیں۔ وہ کراچی کے متعلق بات کر رہے تھے۔ یہ کہنا بڑی ہی زیادتی ہوگی کہ آج سائنس اور فلسفہ کی یہ نامور خواتین عقل کے تیسرے اور چوتھے درجہ کی "العقل بالفعل" اور "عقل مستفاد" نہیں رکھتی ہیں۔

تک نہیں پہنچ گئی ہے کہ وہ کسی منصب کی اہل ہی نہ رہ گئی ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ اوقاف کی متولی اور نگراں ہو سکتی ہے اور اس کو یتیموں کی دیکھ بھال کی وصیت کی جا سکتی ہے۔

(فتح القدیر صفحہ ۴۸۶ ج ۵)

اس پوری تفصیل سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ عورت کو قاضی اور جج بنائے جانے کے متعلق ہمارے علماء و فقہاء نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ مشاہدات اور تجربات اس کی نفی کرتے ہیں۔ لہٰذا ہماری دیانتدارانہ رائے ہے کہ عورتوں کو اس منصب سے محض اس لئے محروم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عورت ہے۔

عورت سیاسی میدان میں

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ عورت کا دائرۂ کار اندرون خانہ نظم و نسق کو سنبھالنا اور بچوں کی تعلیم و تربیت اور غور و پرداخت ہے۔ لیکن یہ اس کا عام حالات میں دائرۂ کار ہے۔ اگر اسلامی ریاست کو اس طرح کے ہنگامی حالات پیش آجائیں کہ عورت کو بیرونِ خانہ ملکی سیاسیات میں دخل اندازی کرنی پڑ جائے تو قرآن کریم نے اس پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے گھر کو عورت کی سعی و جہد کا مرکز قرار دیا ہے لیکن ہنگامی حالات میں وہ گھر سے باہر کے معاملات میں بھی دخل دے سکتی ہے۔ حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد جب نظام حکومت میں ابتری پیدا ہو گئی تو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے قاتلین حضرت عثمانؓ سے قصاص لینے کے لئے اور قوانین اسلام کے نفاذ کے لئے پوری پوری کوشش

فرمائی اور اس راہ میں جس حد تک مردوں کی صنف کا کوئی راہنما جا سکتا ہے ام المؤمنین بھی اپنے فرض کی ادائیگی میں اس سے پیچھے نہیں رہیں۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ حالات نے مجبور کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں اسلامی افواج کی جنگ کی کمان بھی کرنا پڑی۔

حالات اس قسم کے پیدا ہو گئے تھے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا اور بظاہر حضرت علیؓ کو خلیفہ بنا کر زمام کار اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حیثیت محض ایک محصور خلیفہ کی رہ گئی تھی جو صرف قاتلین عثمانؓ کے حکمناموں پر مہر لگانے کا کام سرانجام دے رہے تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنی کتاب خلافت و ملوکیت میں طبری کے حوالہ سے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اعتراف نقل فرمایا۔ مولانا کے اپنے الفاظ میں سنیئے۔

"حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما چند دوسرے اصحاب کے ساتھ حضرت علیؓ سے ملے اور کہا کہ ہم نے اقامتِ حدود کی شرط پر آپ سے بیعت کی ہے، اب آپ ان لوگوں سے قصاص لیجیئے جو حضرت عثمانؓ کے قتل میں شریک تھے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "بھائیو! جو کچھ آپ جانتے ہیں اس سے میں بھی ناواقف نہیں ہوں، مگر ان لوگوں کو کیسے پکڑوں جو اس وقت ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم ان پر۔ کیا آپ حضرات اس کام کی گنجائش کہیں دیکھ رہے ہیں جسے آپ کرنا چاہتے ہیں؟" سب نے کہا "نہیں" اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا "خدا کی قسم میں بھی وہی

خیال رکھتا ہوں جو آپ کا ہے۔ ذرا حالات سکون پر آنے دیجئے تاکہ لوگوں کے حواس برجا ہو جائیں، خیلالات کی پراگندگی دور ہو اور حقوق وصول کرنا ممکن ہو جائے۔

(صـ ۱۲۷-۱۲۸ بحوالہ طبری)

بقول حافظ ابن کثیرؒ حالاتِ خلافت یہ تھے کہ:۔

"عراقیوں کا یہ طریقہ ہو گیا تھا کہ وہ حضرت علیؓ کے احکام اور اوامر و نواہی کی مخالفت کرتے تھے اور ان کے احکام نیز اقوال وافعال سے دور رہتے تھے۔ ان کا یہ طرز عمل ان کی جہالت، کم فہمی، بے حسی اور کند ذہنی، نیز ان میں سے بہتوں کے فسق و فجور کا رہینِ منت تھا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ہفتم احوال ۳۸ھ)

چنانچہ سیدنا حضرت علیؓ اور ان کے بعد سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہما آخر تک ان بدباطن سبائیوں کی نافرمانیوں کے شاکی رہے۔ خود شیعوں کی مرتب کردہ کتاب نہج البلاغۃ کے خطبوں میں حضرت علیؓ نے ان مفسدین کو جن خطابات سے نوازا ہے وہ آج بھی ان کی شورش پسندی کے شاہد ہیں۔

قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ نے جن میں اکثر بلکہ سارے کے سارے سبائی ہی تھے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی سے خلفائے ثلثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد غالیانہ تقدس کے وہ تانے بانے بننے شروع کر دیئے تھے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کو تمام صحابہ سے برتر ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی حتیٰ کہ ان میں سے ایک فرقہ اس عقیدہ کا حامل تھا کہ

حضرت علیؓ میں الوہیت کی تمام صفات موجود ہیں۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان زنادقہ کو زندہ آگ میں جلانے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا کہ اب تو یقین کامل ہو گیا کہ آپ ہی الٰہ ہیں۔ کیونکہ آگ سے عذاب دینا تو حق تعالیٰ ہی کی خصوصیت ہے۔ (ان زندیقوں کو آگ میں جلانے اور اس پر حضرت ابن عباسؓ کے اعتراض کا ذکر امام بخاری نے کتاب الجہاد باب لا یعذب بعذاب اللہ میں کیا ہے، اور شیعوں کی مشہور و مستند کتاب رجال کشی میں بھی ان کا ذکر ہے۔)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بڑے بڑے صحابہ موجود تھے۔ حضرات عشرہ مبشرہ میں سے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ (آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ماموں) حضرت زبیر ابن العوام رضی اللہ عنہ (آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی) حضرت طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ لیکن سبائی پروپیگنڈے کے زیر اثر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بلند قامتی کے آگے سب حضرات لاچار نظر آتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بعض خصوصیات میں کچھ بعید نہیں کہ برتر بھی ہوں لیکن ان سب حضرات کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے اور حضرت علیؓ کے موافق زبردست غالیانہ پروپیگنڈے نے ایرانی موالیوں کے درمیان جن کی تعداد مدینہ منورہ میں مہاجرین وانصار سے کئی گنا زیادہ تھی ان حضرات کی شخصیات حضرت علیؓ کے مقابلہ میں جن کا سایہ (SHEL TER) بظاہر

قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا غیر مؤثر ہو کر رہ گئی تھیں۔
ان حالات میں جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص لینے کو ضروری سمجھتے تھے، (مثلاً حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہ و دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم) انہیں بھی کسی قدآور شخصیت کی ضرورت تھی جس کے زیر سایہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے قصاص کی مہم چلا سکیں۔

اس وقت ایسی قدآور شخصیت سوائے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ام المؤمنین ہونے کی حیثیت سے اور کوئی نہیں تھی۔ دیگر امہات المؤمنین میں نہ وہ صلاحیتیں تھیں جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا طرۂ امتیاز تھیں اور نہ عام مسلمانوں میں انہیں وہ عقیدت و احترام حاصل تھا جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حاصل تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نہ خلافت کا دعویٰ فرمایا، نہ لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنے اقتدار کی طرف دعوت دی۔ وہ خالصتاً لوجہ اللہ اصلاح کے لئے کوشش فرما رہی تھیں۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بار بار یہ عذر فرما رہے تھے کہ وہ باغیوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان سے مغلوب ہیں اس لئے حدود اللہ کو قائم نہیں کر پا رہے اس لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت زبیر، حضرت طلحہ اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہ اقدام اس لئے کیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان باغیوں کے چنگل سے نکال سکیں۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب

بصرہ کے قریب پہنچیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ گورنر حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے دو آدمیوں کو مقصد سفر دریافت کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں بھیجا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا :-

" مختلف شہروں اور قبائل کے شورش پسند اور فتنہ پرداز لوگوں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقدس شہر پر حملہ کیا اور وہاں بدعتیں ایجاد کیں اور بدعت طرازوں کو اس میں پناہ دی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی لعنت کے مستحق بنے۔ اس کے ساتھ امام المسلمین کے خون ناحق کے مرتکب ہوئے ۔ اس حرام قتل کو انہوں نے حلال بنالیا ناجائز طریقے سے مال لوٹا اور شہر و ماہ کی حرمت کو پامال کیا اور لوگوں کی عزت اور ان کی کھالوں کو پارہ پارہ کیا ۔ ایسے لوگوں کے وطن میں قیام کیا جو ان کے قیام کو ناپسند کرتے تھے ۔ ان کے ساتھ ان کے لئے باعث ضرر و تکلیف بنے ۔ نہ انہیں کوئی نفع پہنچایا نہ اللہ کا تقویٰ اختیار کیا ۔ لیکن وہ لوگ (یعنی اہل مدینہ) نہ ان لوگوں کی حرکات شنیعہ کو روکنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ان کے شر سے مامون ہیں ۔ میں مسلمانوں کو یہ بتانے کے لئے نکلی ہوں کہ اس قوم نے کیا کیا ہے اور پس پشت لوگ کس حالت میں مبتلا ہیں اور انہیں اصلاح حالات کے لئے کیا کرنا چاہیئے ۔ اس کے بعد ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے یہ آیات تلاوت فرمائیں :-

" اکثر سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہے ۔ البتہ ان لوگوں کی سرگوشیوں میں بھلائی ہے جو صدقہ یا کسی اچھے کام یا لوگوں کے درمیان

اصلاح کو کہیں:-

ہم اصلاح کے لئے ہر اس شخص کو آمادہ کریں گے جسے اس کارِ اصلاح کا حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ یعنی ہر چھوٹے بڑے مرد و عورت کو۔ پس ہم تمہیں معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے منع کرتے ہیں اور تمہیں اسے (منکر کو) بدلنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

(تاریخ طبری جلد چہارم احوال ۳۶ھ)

دورانِ سفر جب ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے لشکر کا گذر ایک صاحب ملیح ابن عوف اسلمی پر ہوا اور انہوں نے مقصدِ سفر دریافت کیا تو حضرت زبیرؓ نے فرمایا تھا کہ:۔

امیر المؤمنین کو بے قصور ظلماً شہید کر دیا گیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کس نے قتل کیا؟ آپ نے جواب میں فرمایا اِدھر اُدھر کے شورش پسندوں اور بعض قبائلی اجانب نے جن کی امداد بعض گنواروں اور غلاموں نے کی (امیر المؤمنین کو شہید کیا ہے) انہوں نے دریافت کیا کہ آپ لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟ حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ ہم عوام مسلمین کو ان مفسدوں کے خلاف کھڑا کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس خون کا انتقام لیا جائے۔ اسے یونہی چھوڑ دینے میں ہمارے ہاں سلطان اللہ کی ہمیشہ توہین ہوا کرے گی۔ اس لئے کہ یہ لوگ ـــــ اس قسم کے کاموں سے رو کے نہ گئے تو ہمارا ہر امام اسی طرح قتل کیا جاتا رہے گا۔"

(طبری جلد چہارم احوال ۳۶ھ)

حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہم کا مقصد خدانخواستہ حضرت علیؓ کے خلاف کوئی شورش پیدا کرنا نہیں تھا۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان شورش پسندوں کے چنگل سے نکالنا اور شورش پسندوں سے خلیفۂ مظلوم کے خون کا قصاص لینا تھا تاکہ آئندہ یہ ریت نہ پڑ جائے کہ چار پانچ ہزار شورش پسند جس خلیفہ کو چاہیں معزول کر دیں، جسے چاہیں قتل کر دیں۔ ورنہ یہ حقیقت ہے کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما ان چھ آدمیوں میں شامل تھے جن کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وصیت فرمائی تھی کہ ان چھ آدمیوں میں سے خلیفہ کا انتخاب کیا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بعد لوگ پہلے ان ہی دو حضرات کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے کہ ہم آپ کے ہاتھوں پر بیعت کرتے ہیں۔ آپ خلافت منظور کر لیں۔ لیکن ان دونوں حضرات کے انکار کے بعد ہی لوگ حضرت علیؓ کے پاس گئے تھے۔ لہٰذا یہ سمجھنا انتہائی زیادتی ہوگی کہ یہ حضرات خلافت کے طلبگار تھے اور حضرت علیؓ کی خلافت کے مخالف تھے۔ طبری نے محدثین کے ذریعہ حضرت احنف بن قیس سے (جو حضرت علیؓ کے مشہور حامی ہیں) نقل کیا ہے کہ:۔

"میں نے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما سے ملاقات کی کہ میری رائے میں یہ بزرگ (یعنی حضرت عثمانؓ) ضرور شہید کر دیئے جائیں گے تو آپ مجھے کس سے بیعت کرنے کی رائے دیتے ہیں اور کس کی حکومت میرے لئے پسند کرتے ہیں تو دونوں حضرات نے یہ فرمایا کہ حضرت علیؓ کی میں نے کہا کہ کیا آپ ان سے بیعت کرنا میرے لئے پسند فرماتے ہیں اور اس کا مجھے حکم دیتے ہیں تو دونوں حضرات نے فرمایا

کہ ہاں۔ پھر میں مکہ معظمہ چلا گیا۔ وہاں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ تشریف فرما تھیں وہاں پہنچتے ہی مجھے حضرت عثمانؓ کی شہادت کی اطلاع ملی تو میں ام المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ کا کیا حکم ہے؟ میں کس سے بیعت کروں؟ ام المؤمنین نے فرمایا۔ حضرت علیؓ سے۔ میں نے عرض کیا کہ کیا آپ مجھے اس کا حکم دیتی ہیں اور میرے لئے اسے پسند فرماتی ہیں؟ جواب میں آں معظمہ نے فرمایا کہ "ہاں" چنانچہ میں حضرت علیؓ کے پاس مدینہ منورہ آیا اور ان سے یعنی حضرت علیؓ سے بیعت کرلی۔

(طبری۔ حالات ۳۶ھ)

ہمارے بعض بزرگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس اقدام کو پسند نہیں فرمایا۔ اُن کا خیال ہے کہ عورت کو گھر کی چار دیواری سے باہر قدم رکھنا ہی جائز نہیں چہ جائیکہ وہ میدانِ کارزار میں پہنچ کر فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لے انہوں نے حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے اس جعلی مکتوب سے استدلال فرمایا ہے جس میں وہ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تحریر فرماتی ہیں:۔

آپ کی حیثیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان ایک دروازے کی ہے۔ اور آپ کا حجاب گویا اس کی حرمت کا پردہ ہے لیکن آپ نے اس پردہ کو چاک کر دیا۔ یاد رکھیئے قرآن نے آپ کے دامن کو سمیٹ دیا ہے۔ اسے پھیلایئے نہیں۔ اللہ نے آپ کو اپنے گھر میں بٹھایا ہے۔ اسے چھوڑ کر میدان میں نہ چلی آئیے۔ خدائے تعالیٰ اس امت کی

پشت پر ہے۔ آپ خود جانتی ہیں کہ حضورؐ کو آپ سے کس قدر محبت تھی۔ اگر امت کی ذمہ داری آپ کے حوالے کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں کیا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ دین کا ستون اگر گرنے لگے تو عورتیں اسے کھڑا نہیں کر سکتیں اور اگر اس میں شگاف پیدا ہو جائے تو عورتوں کے بس میں نہیں کہ اسے بھر دیں۔ ان میں اگر دین کے لئے جہاد کی اہلیت ہوتی تو حضورؐ لازماً آپ کو جہاد کی وصیت کر جاتے عورتوں کا جہاد حج ہے ان کے لئے انتہائی محبوب بات یہ ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنا دامن سمیٹے رہیں۔

ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کی ملاقات حضورؐ سے اس حال میں ہوتی کہ آپ اونٹ پر بیٹھے ہوئے پہاڑوں اور ٹیلوں کے اطراف ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ گھوم رہی ہیں تو آپ کیا جواب دیتیں۔ کل آپ کو حضورؐ کے سامنے حاضر ہونا ہے اور حال یہ ہے کہ آپ نے اللہ کے ڈالے ہوئے پردہ کو چاک کر دیا ہے۔ اور اس کے عہد کو توڑ چکی ہیں۔

آپ نے جو کچھ کیا اگر مجھ سے سرزد ہوتا تو قسم خدا کی مجھے جنت میں جاتے ہوئے بھی ندامت ہوتی (لہٰذا میری گذارش ہے) کہ آپ حضورؐ کے قائم کردہ پردہ کو اپنا ستر اور گھر کے صحن کو اپنا قلعہ بنائیں۔ آپ حقیقت میں امت کی خیرخواہ اسی وقت ہوں گی جبکہ آپ ان کی مدد کیلئے (بجائے میدان میں جانے کے) گھر میں رہیں۔ اگر میں آپ کو وہ حدیث سناؤں جو میں نے حضورؐ سے سنی ہے تو (یقین جانیئے) کہ آپ سانپ کی طرح مجھے ڈسنے کے لئے دوڑ پڑیں گی۔"

(العقد الفرید ص ۹۶-۹۷ ج ۲ اور الامامۃ والسیاسۃ ص ۵۷ ج ۲)

(قطع نظر اس کے کہ اس خط کا ماخذ شیعہ مؤلفین کی غیر مستند کتابیں ہیں، اس کے متن اور اس کی سند پر بحث کے لئے ملاحظہ فرمائیے اظہار حقیقت جلد دوم مؤلفہ حضرت مولانا محمد اسحاق صدیقی ندوی سابق شیخ الحدیث و مہتمم ندوۃ العلماء لکھنؤ شائع کردہ مکتبہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی)

بصرہ کی ایک اور مشہور شخصیت اور صحابئ رسول حضرت جاریہ ابن قدامہ رضی اللہ عنہ کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:۔

"آپ کے اس خروج کے معاملہ میں ہمارے نزدیک حضرت عثمانؓ کی شہادت بہت ہلکی ہے۔ اللہ نے آپ کی حرمت قائم کی تھی اور آپ کو پردہ کا پابند کیا تھا۔ لیکن آپ نے اس پردہ کو چاک اور اس حرمت کو ختم کر دیا جو شخص آپ سے جنگ جائز سمجھتا ہے۔ وہ گویا آپ کے قتل کو بھی جائز سمجھتا ہے۔ غور کیجیئے آپ نے لوگوں کو کس نازک پوزیشن میں ڈال دیا ہے۔ لہٰذا اگر آپ اپنی خوشی سے آئی ہیں تو اب اپنے گھر لوٹ جائیے اور اگر آپ کو مجبور کر کے یہاں لایا گیا ہے تو اس کے خلاف لوگوں کا تعاون حاصل کیجیئے اور اپنے مستقر پہ پہنچ جائیے۔

(طبری ج ۵ ص ۱۷۶)

(اس کی تاریخی و درایتی حیثیت کے لئے بھی اظہار حقیقت جلد دوم ملاحظہ ہو۔)

مشہور صحابی ابو بکرہ کہتے ہیں کہ جنگ جمل میں، میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ شریک ہو جاتا۔ لیکن حضورؐ کے ایک فرمان نے مجھے اس سے

بچا لیا۔ جب آپ کو کسریٰ کی لڑکی کے تخت نشین ہونے کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا تھا کہ:۔

"وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جو اپنا اقتدار کسی عورت کے حوالے کر دے"۔ (بخاری کتاب الفتن)

الامامۃ والسیاستہ کے شیعہ مؤلف نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بات منسوب کی ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا۔

بَیْتُھَا خَیْرٌ مِّنْ ھَوْدَجِھَا (الامامۃ والسیاستہ ص ۶۲ ج ۱)

ترجمہ [حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر ان کے ہودج سے زیادہ بہتر تھا۔]

ایک افسانہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب اپنی مہم پر بصرے پہنچیں تو انہوں نے زید ابن صوحان کو اپنی اولاد خالص سے خطاب کر کے خط لکھا کہ:۔

حضرت عثمان رضؓ کا قصاص لینے کے لئے جو کوشش ہو رہی ہے تم فوراً اس میں شریک ہو جاؤ اور اگر شریک ہونا نہیں چاہتے ہو تو کم از کم اپنی قوم کے لوگوں کو حضرت علیؓ کی حمایت سے باز رکھو"۔

یہ خط دیکھ کر زید بن صوحان نے کہا۔ اللہ ام المؤمنین پر رحم فرمائے۔ انہیں گھر میں بیٹھے رہنے اور ہمیں باہر نکل کر جہاد کرنے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن جس امر کی وہ پابند ہیں، خود تو اس سے آزاد ہو گئیں اور ہم سے اس کی پابندی کرانا چاہتی ہیں۔ اور جس کام پر ہم مامور کئے گئے ہیں اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور ہمیں اس سے روک رہی ہیں"۔

پھر خط کے جواب میں حضرت عائشہ رض کو لکھا :۔

" یقیناً میں آپ کی اولادِ خالص ہوں اور آپ میری ماں ہیں، بشرطیکہ آپ اس سعی و جہد سے کنارہ کش ہو جائیں اور گھر لوٹ جائیں۔ ورنہ آپ کو چھوڑنے والوں میں مجھے پہلا شخص سمجھیئے۔

(طبری ص ۱۸۳-۱۸۴ ج ۵ الکامل لابن اثیر ص ۹۷ ج ۳)

(اس کی حقیقت کے لئے بھی اظہار حقیقت جلد دوم دیکھیئے)

ان تمام مصنوعی مشوروں اور نصیحتوں کو اگر سچ بھی مان لیا جائے تو ان میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف سے جواب نہ دیا جا سکے۔ مثلاً ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف منسوب یہ ارشاد کہ :۔

" دین کا ستون گرنے لگے تو عورتوں اسے کھڑا نہیں کر سکتیں اور اگر اس میں کوئی شگاف پیدا ہو جائے تو عورتوں کے بس میں نہیں کہ اسے بھر دیں " حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے عملی اقدام نے اسے غلط ثابت کر دیا۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا قصاص لینے کے لئے کھڑی ہوئی تھیں اور وہ اس میں کامیاب ہوئیں۔ بہت سے قاتلین کو وہ کیفر کردار تک پہنچا سکیں اور جو باقی بچ گئے تھے وہ بھی بعد میں اپنے کیفر کردار کو پہنچ کر رہے۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جو شمع روشن کی تھی اسی کی روشنی میں امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعد میں قدم اٹھایا اور چن چن کر تمام قاتلین کو موت کے گھاٹ اتار کر دم لیا۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے مشن میں ناکام رہیں۔ رہی حضرت ابو بکرہ رضی اللہ تعالےٰ

عنہ کی روایت تو اس کے متعلق بھی بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے اور کہا جا سکتا ہے۔ (اس کے متعلق مفصل بحث اگلے عنوان کے تحت ملاحظہ ہو)

حضرت جاریہ ابن قدامہ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا تھا اسے ان کی ذاتی رائے ہی کہا جا سکتا ہے۔ زید ابن صوحان نے جو کچھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو لکھا اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن ہم ان مشاجرات صحابہ میں خود کو ملوث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔ یہ واقعہ ہے کہ صحابۂ کرام تین حصّوں میں بٹے ہوئے تھے۔

① ان کی اکثریت ان فتنوں سے الگ رہی، نہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور نہ حضرت زبیر، حضرت طلحہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کا ساتھ دیا۔

② صحابہ کی خاصی تعداد جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔

③ اتنی ہی تعداد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ۔ اور ان کے بعد حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھی۔

امام ربّانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے متعلق فرماتے ہیں کہ:۔

"اے بھائی! حضرت معاویہؓ اس معاملہ میں تنہا نہیں ہیں۔ بلکہ کم و بیش نصف صحابۂ کرام اس معاملہ میں ان کے ساتھ شریک ہیں، حضرت علیؓ سے جن حضرات کی جنگ ہوئی اگر وہ کافر یا فاسق ہوں تو آدھے دین سے جو ان کی تبلیغ کے راستہ سے ہم تک پہنچا ہے، اعتماد اٹھ جاتا ہے اور اس امر کو تجویز نہیں کرے گا مگر وہ زندیق جس کا مقصد دین اسلام کو باطل قرار دینا ہے۔"

(مکتوبات امام ربانی دفتر اوّل مکتوب ۲۵۱)

لہٰذا ہمیں یہی زیبا ہے کہ ہم سب کا احترام کریں اور ان کی سیاسی کشمکش میں کسی ایک کی بھی تردید یا تغلیط نہ کریں۔ ہمارا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فوجوں کی کمان فرمائی اور براہِ راست اسلامی ریاست کی سیاست میں عملاً حصّہ لیا اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک جمِ غفیر ان کے ساتھ تھا اور انہوں نے ان کے اقدام کو صحیح بروقت اور برمحل قرار دیا۔ صحابہ کے اس جم غفیر میں کم ازکم دو عشرۂ مبشرہ ان کے بعد اہل بدر اور اہل بیعت رضوان کے کثیر صحابہ نے ان کی تصویب فرمائی۔ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق ہمارا یعنی اہل سنت کا وہی عقیدہ ہے جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ان کے متعلق ارشاد تھا کہ:-

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اهْتَدَیْتُمْ۔

ترجمہ [میرے صحابہ کی مثال ستاروں کی طرح ہے تم جس کی بھی پیروی کر لو سیدھی راہ پر پہنچ جاؤ گے۔

البتہ ہمیں افسوس ان بزرگوں کے طرز عمل پر ہے جو ایک طرف حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اقدام کی تغلیط فرماتے ہیں اور شدومد سے ان مواعظ و نصائح اور مشوروں کو پیش کرتے ہیں جو کچھ صحابۂ کرام نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اس اقدام سے باز رہنے کے لئے پیش کئے تھے (بشرطیکہ وہ تحقیق کے معیار پر صحیح ثابت بھی ہو سکیں) لیکن یہی مواعظ و نصائح اور مشورے جب جلیل القدر

صحابۂ کرام کی طرف سے جنگ جمل وصفین کے موقعہ پر حضرت علیؓ کو اور بعد میں حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کو ان کے اقدام سے باز رکھنے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں تو ان کے لبوں پر مہر لگ جاتی ہے اور وہ ان مواعظ و نصائح اور مشوروں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ اور نہ حضرت علیؓ یا حضرت حسینؓ رضی اللہ عنہما کے اقدام کی تغلیط کی جرأت اپنے اندر پاتے ہیں۔

نیز ایک طرف وہ عورتوں کو سیاسیات میں حصہ لینے سے منع فرماتے ہیں اور اسے ناجائز فعل قرار دیتے ہیں لیکن جب خود انہیں اس کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تو قلا بازیاں کھانے لگتے ہیں اور عوتوں کو سیاسیات میں داخل کرنے کی حمایت فرمانے لگتے ہیں۔ حق تعالیٰ ہمیں اور ان بزرگوں کو معاف فرمائے وہ پہلے ہی سوچ سمجھ کر فتوے کیوں نہیں دیتے تاکہ انہیں بعد میں یہ قلا بازیاں نہ کھانی پڑیں۔[1]

---

[1] ہمارے جید علماء کرام کے فتوے موجود ہیں جن میں انہوں نے عورتوں کے سیاسیات میں دخیل ہونے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ پھر انہی علمائے کرام کے وہ فتوے بھی موجود ہیں جو انہوں نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم کے خلاف الیکشن میں محترمہ فاطمہ جناح مرحومہ کی تائید اور موافقت میں جاری فرمائے تھے۔ اور محترمہ فاطمہ جناح مرحومہ کی صدارت کو جائز قرار دے دیا تھا پھر انہوں نے ان کی الیکشن کی مہم میں دوروں پر دورے فرمائے اور عوام کو اس کے لئے تیار فرمایا تھا۔

یغفر اللہ لنا ولھم وعفا عنا وعنھم۔

۱۱ مئی

(عورت سربراہ مملکت)

عربی زبان کے بہت سے الفاظ اردو میں مستعمل ہو کر اپنی معنویت سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں گزشتہ صفحات میں گذر چکی ہیں۔ انہی الفاظ میں سے ایک لفظ اَمْرٌ بھی ہے۔ اَمْرٌ کا لفظ ہمارے ہاں اُردو میں محض ایک بات کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "مجھے اس امر میں شبہ ہے" آپ کس امر کی بات کر رہے ہیں؟" "یہ امر تو بہت معمولی ہے" وغیرِ ذٰلک۔ لیکن عربی زبان میں یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ اس کے بہت سے معنے آتے ہیں۔ منجملہ ان معانی کے اکثر و بیشتر اس کے معنے حکم، قانون، اقتدار، اختیار اور غلبہ کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی یہ لفظ عام طور پر انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثالیں بے شمار ہیں مگر بات کو سمجھانے کے لئے میں صرف چند مثالوں پہ اکتفا کروں گا۔ مثلاً سورۃ آل عمران میں ہے۔

قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ط يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ط (۳/۱۵۴)

ترجمہ: [اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ اقتدار و اختیار تو سارا کچھ اللہ ہی کیلئے ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپا رہے ہیں جو آپ سے ظاہر نہیں کرتے۔]

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا

هٰهُنَا۔ (۳/۱۵۴)

ترجمہ [وہ کہتے ہیں اگر اختیار و اقتدار ہمیں بھی کچھ ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔]

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ۔ (۳/۱۵۹)

ترجمہ [تو اے پیغمبر! انہیں معاف کر دیجئے اور ان کے لئے استغفار فرمائیے اور حکومت کے معاملہ میں ان سے مشورہ کیا کیجئے۔]

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ (۴/۵۹)

ترجمہ [اے مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اربابِ حکومت کی اطاعت کرو۔]

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ۔ (۴/۸۳)

ترجمہ [اور اگر وہ اس بات کو رسول کی طرف اور اپنے میں سے اربابِ اقتدار کی طرف لوٹا دیتے تو جو لوگ اس کی تہہ تک پہنچ سکتے وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے۔]

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○ (۲۲/۴۱)

ترجمہ [یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں انہیں اقتدار دیدیں تو صلوٰۃ (کے نظام) کو قائم کریں گے۔ (لوگوں کو) زکوٰۃ دیں گے اور

٦٠ وف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔ اور تمام امور کا انجام اللہ ہی کے لئے ہے۔]

اس آیت سے واضح ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بااختیار اور صاحب اقتدار حکومتوں کا فریضہ بتایا گیا ہے جنہیں زمین کا اقتدار حاصل ہوگا۔ وہ ظاہر ہے کہ قانونی طور پر لوگوں کو معروف یعنی اسلامی معاشرہ کے دستوری (RECOGNIZED) معاملات کا حکم دیں گے یعنی اُنہیں اس کے مطابق عمل پیرا ہوتے کے لئے قانوناً مجبور کریں گے اور منکر (UN-RECOGNIZED) امور سے طاقت کے ذریعے سے روکیں گے یعنی جو لوگ منکرات کے مرتکب ہوں گے اُنہیں سزا دیں گے اور اس طرح قوت اور طاقت کے استعمال سے منکرات کو روکیں گے۔ وہ محض مشورے یا وعظ و نصیحت سے کام نہیں لیں گے بلکہ طاقت کا استعمال کریں گے اور بزور معروف کو نافذ اور منکر کا سدباب کریں گے۔ حکومتی اتھارٹی کے ساتھ لوگوں کو معروف کرنے پر مجبور کرنا اور منکر سے لوگوں کو باز رکھنا ہی امر کے معنے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے قرآن کریم کی آیات سے بتایا گیا ہے امر کے معنے مشورے دینے یا وعظ و نصیحت کرنا نہیں ہے۔

چنانچہ آج بھی بعض حکومتوں مثلاً سعودی عرب وغیرہ میں احتساب کے محکمے قائم ہوتے ہیں اور وہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو حکومت کی سطح پر یعنی قوت اور طاقت کے استعمال سے اس فریضہ کو ادا کرتے ہیں۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر حکومت کا کام نہیں

سمجھا جاتا بلکہ علمائے کرام کا کام سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ جب موقعہ ملے دھواں دار تقریر فرمادیں اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرما کر منکر کی برائیاں اور معروف کی خوبیاں لوگوں کے ذہن نشین کرادیا کریں۔ ادھر تو حضرات علمائے کرام اقتدار و اختیار سے محروم اور قوت اور طاقت سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ وہ بیچارے وعظ و نصیحت ہی کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف حکومتوں کو محض ٹیکس وصول کرنے، حکومت کے خزانے بھرنے اور انتظامیہ کو طاقتور بنانے سے فرصت نہیں ملتی وہ نہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا فریضہ سمجھتے ہیں اور نہ اسے انجام دیتے ہیں۔ یہ ساری خرابی اس سے پیدا ہوئی کہ دیگر اقوام کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی مذہب اور سیاست کی ثنویت رائج ہوگئی۔ علماء کا کام مذہب کا تحفظ اور حکومت کا کام ملک کا نظم و نسق قرار پاگیا۔ مذہب کی اجارہ داری علمائے کرام نے سنبھال لی اور ملکی نظم و نسق کی ذمہ داری اربابِ سیاست نے سنبھال لی۔ اب حکومت پاکستان کو الحمد للہ اس کا احساس ہوا ہے اور وہ احتساب کا محکمہ قائم کرنے کا ارادہ کر رہی ہے۔

(۱) اس ضروری تمہید کے بعد اب اس آیت پر غور فرمائیے جو سورۂ توبہ میں واقع ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

(۹/۷۱)

ترجمہ: اور مؤمن مرد اور صاحبِ ایمان عورتیں، ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں۔ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے منع کرتے ہیں اور صلوٰۃ (کے نظام) کو قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر حق تعالیٰ جلد ہی اپنا رحم فرمائیں گے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ غلبہ اور حکمت والے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں مردوں اور عورتوں (انسان کی دونوں صنفوں) کو ایک دوسرے کا معین و مددگار اور ولی قرار دیا گیا ہے اس کے بعد وہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں کا فریضہ قرار دیا گیا ہے اور ساتھ ہی نظامِ صلوٰۃ قائم کرنا اور معاشرہ کے افراد کو سامانِ نشو و نما بہم پہنچانا یعنی انہیں زکوٰۃ ادا کرنا بھی دونوں کا بحیثیت مساوی فریضہ بتایا گیا ہے۔ حق تعالیٰ کے ارشادات اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی اطاعت اور فرمانبرداری بھی دونوں کا یکساں فریضہ بتایا گیا ہے۔ نظامِ صلوٰۃ قائم کرنا اور لوگوں کو زکوٰۃ ادا کرنا بھی حکومت ہی کا فریضہ ہے جیسا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر حکومت کا فریضہ تھا۔ حق تعالیٰ کے قوانین اور ہدایات کی اطاعت اور پیروی کرنا بھی دونوں کا یکساں فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ نیز حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری بھی یکساں طور پر دونوں کا فرض بتایا گیا ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی خدا کے احکام اور قوانین ہی کو لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ آپ کی ہدایات بعینہٖ حق تعالیٰ

ہی کی ہدایات تھیں، ان سے الگ کوئی چیز نہیں تھیں۔ بہرحال اس میں بھی دونوں کا یکساں حصہ بتایا گیا ہے۔ پھر دونوں جنسوں سے یکساں طور پر حق تعالیٰ کی رحمت اور فضل کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔

بہرحال جو حکومت کے کام تھے، یعنی اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نیز حق تعالیٰ کے قوانین واحکام کو نافذ کرنا اور اس طرح حق تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا، دونوں اصنافِ انسانی کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر عورتوں کا اختیار و اقتدار میں کوئی حصّہ ہی نہ ہو تو وہ حکومت کے ان تمام کاموں کو کس طرح ادا کریں گی۔ پھر تو یہ ساری ہدایات بے معنیٰ ہو کر رہ جائیں گی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ قرآن کریم ان تمام حکومتی فرائض میں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی شامل سمجھتا ہے۔ وہ عورتوں کو اختیار و اقتدار سے کسی معنیٰ میں بھی محروم نہیں کرنا چاہتا۔

(۲) والد محترم شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ "الباب العاشر فی الاحتجاج بشرع من قبلنا" کے ذیل میں فرماتے ہیں:-

> ابن العربیؒ نے کہا ہے کہ اس قصہ (قصۂ بقرہ) میں حق تعالیٰ نے ایک حکم کے متعلق بتایا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا۔ وہ ہم پر بھی لازم ہے یا نہیں۔ اس بارہ میں فقہاء نے مختلف آراء قائم کی ہیں۔ یہ مسئلہ اس لقب سے یاد کیا جاتا ہے کہ انبیائے سابقین کی شریعت

ہمارے لیے بھی شریعت ہیں (تاآنکہ ان کا منسوخ ہونا ثابت ہو جائے) یا نہیں؟ اس میں فقہائے کرام کے پانچ قول ہیں۔ ابن العربیؒ نے سب کو بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ صحیح قول یہی ہے کہ انبیائے سابقین کی شریعت کی پیروی ہم پر بھی لازم ہے۔ بشرطیکہ اس شریعت کو ان سے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے نقل فرمایا ہو (یا اسے حق تعالیٰ نے بغیر کسی نکیر کے نقل کر دیا ہو) دوسرے طریقوں سے جو شریعت ہم تک پہنچی ہو، اس کا اعتبار نہیں۔ کیونکہ انبیاء سے ان کے منقول ہونے کی راہیں سرتاپا فساد ہیں۔ اس کے تمام اصول میں امام مالکؒ کا صریح مذہب یہی ہے (اور یہی مذہب سادات حنفیہؒ کا ہے (اللہ ان کی سعی کو مشکور فرمائے) جیسا کہ کتب اصول میں ثابت ہو چکا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے قصے قرآن میں بیان فرمائے ہیں۔ تو جو آیاتِ زجر و تنبیہ ہیں اور جن سے عبرت حاصل کرنے کا ذکر ہے۔ ان کا فائدہ تو امت محمدیہ کو وعظ و نصیحت فرمانا ہے۔ اور جو آیاتِ احکام ہیں ان سے مقصود ان کا امتثال اور اقتدار کرنا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

۱ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ۔

ترجمہ [یہ وہ لوگ ہیں جنہیں حق تعالیٰ نے ہدایت عطا فرما دی تھی۔ لہٰذا (اے پیغمبر اسلام!) آپ بھی ان کی ہدایت کی پیروی فرمائیے]۔

تو ہمارے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں ان کی پیروی فرمانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے ابن الجوزیؒ کے اس قول کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ ہمارے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کبھی بھی نہیں سنا گیا کہ انہوں نے کبھی اہل کتاب میں سے کسی کی طرف کبھی رجوع فرمایا ہو، اور نہ اُن سے کسی مسئلہ کے متعلق تفتیش کی ہو یا کوئی مسئلہ ان سے پوچھا ہو[1] ایسا کہنا اس غلطی کی وجہ سے ہے جو ان کے نزدیک چلا آرہا ہے۔ لیکن جس مسئلہ کو لے کر فرشتہ آپ پر نازل ہو چکا ہو (اور وحی کے ذریعہ سے آپ کو پہنچا ہو) صرف وہی حق ہے اور مفید مطلب ہے۔ اسی وجہ سے جو ہم نے اوپر تفصیلاً بیان کیا ہے۔ اس کے کوئی دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے۔

(احکام القرآن جلد اول ص۲۲ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

اس اصولی بحث کے بعد کہ انبیاء سابقین کی شریعت جسے آنحضرت

---

[1] یہ دعویٰ غلط ہے۔ کیونکہ بخاری کی روایت سے ثابت ہے کہ آپ نے علمائے یہود کو قسمیں دے کر زنا کے متعلق تورات کا حکم دریافت فرمایا تھا۔ اور یہود سے تورات کا حکم معلوم کر کے اسے قبول فرمالیا، اپنا لیا اور اس کے مطابق عمل بھی فرمایا تھا۔ (مؤلف)

صلے اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا ہو یا حق تعالیٰ نے بغیر کسی نکیر کے قرآن کریم میں نقل فرمادیا ہو، ہمارے لئے بھی شریعت ہوتی ہے اور ہمارے لئے اس کا اتباع اور پیروی ضروری ہوتی ہے، آپ قرآن کریم کی سورۂ نمل میں ملکۂ سبا حضرت بلقیس کی امامت کبریٰ کا قصہ ملاحظہ فرمائیں قرآن کریم نے ان کو ایک ملک (سبا) کی سربراہ مملکت اور با اختیار و اقتدار ملکہ کی حیثیت سے پیش فرمایا ہے۔ اور اُن کے صاحب اقتدار و اختیار سربراہ مملکت ہونے پر قرآن کریم نے کوئی معمولی سی نکیر بھی نہیں فرمائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں ان کا سربراہِ مملکت ہونا صحیح تھا۔ ان کے ایمان لانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے انہیں معزول کر کے تخت و تاج سے محروم نہیں کر دیا۔ بلکہ انہیں ان کے منصب پر قائم اور باقی رکھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ان کے اقتدار و اختیار کو قائم رکھنا اور قرآن کریم کا اس پر کوئی نکیر نہ فرمانا۔ اس کی صحت کی دلیل ہے۔ اگر اس میں کوئی قباحت ہوتی تو حق تعالیٰ کی طرف سے یا حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے اس کا اظہار ہونا چاہیئے تھا۔ لہٰذا یہ شریعت خود ہمارے لئے بھی شریعت ہے اور ہمیں اس کی پیروی لازم ہے۔ واضح رہے کہ یہ میرا استدلال نہیں ہے بلکہ عہد حاضر کے ایک جید عالم حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کا استدلال ہے جسے ہم پوری تفصیل کے ساتھ آگے نقل کر رہے ہیں۔

بہرحال ملکۂ سبا حضرت بلقیس کے واقعہ کو قرآن کریم میں بغیر

کسی نکیر کے نقل کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کی امامت کبریٰ کے سلسلہ میں قرآن کریم کا وہ نقطۂ نظر نہیں ہے جو ہمارے بہت سے فقہائے کرام نے اختیار فرمایا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے عورت سربراہِ مملکت بن سکتی ہے۔

قرآن کریم کی آیت کریمہ (۹/۷۱) امور مملکت میں مردوں کی طرح یکساں طور پر عورت کی شرکت کے جواز کو ثابت کرتی ہے اور سورۂ نمل میں قصۂ حضرت بلقیس عورت کے سربراہِ مملکت مقرر ہونے کے جواز پر قطعی دلیل ہے۔ قرآن کریم میں ہمیں ایسی کوئی آیت نہیں ملی جسے عورت کے اس حق سے محرومی کی دلیل بنایا جاسکے۔

اگرچہ اسلام، خواتین کا اولین فریضہ نئی نسل کی تخلیق و تربیت قرار دیتا ہے اور اسی وجہ سے اس کے تمام مصارف کا ذمہ دار شوہر کو قرار دے کر اسے معاشی الجھنوں سے بچاتا، اکتساب رزق کی جدوجہد سے آزاد کر کے اسے ہر طرح سے یکسوئی عطا کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنے فرائض خیر و خوبی کے ساتھ ادا کر سکے۔ لیکن جس طرح اس کے باوجود عورت کو باقی اجتماعی کاموں سے منع نہیں کیا گیا۔ مثلاً اسے تجارت کا حق ہے۔ اسے ملازمت کا حق ہے۔ اسے تمام عملی کاموں میں حصہ لینے کا حق ہے۔ اسی طرح اسے سیاسی امور میں بھی شرکت کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ جو خالصتہً حکومتی ادارات ہیں، یہ جس طرح مردوں کا فریضہ ہیں، عورتوں کا بھی فریضہ ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہیں بھی عورتوں کے سیاسی امور میں حصہ لینے سے یا انہیں سربراہِ

ریاست بنانے سے منع نہیں کیا، نہ صرف یہ بلکہ اس کی تائید (کسی نہ کسی صورت میں) قرآن کریم سے مل جاتی ہے۔ ملکۂ سبا کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کریم فرماتا ہے کہ۔

اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ ۝ ---------- قَالَتْ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْۤ اَمْرِیْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ ۙ۬ وَّالْاَمْرُ اِلَیْكِ فَانْظُرِیْ مَاذَا تَاْمُرِیْنَ ۝ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ ۝ ---------- قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ ($\frac{۲۷}{۲۳ ، ۳۲-۳۴ ، ۴۴}$)

ترجمہ [ہُد ہُد نے کہا۔ میں نے ایک عورت کو پایا ہے جو لوگوں کی ملکہ ہے۔ اسے ہر قسم کی نعمتیں ملی ہوئی ہیں اور اس کا ایک بڑا تخت حکومت ہے ---------- اس نے ارکانِ دولت سے کہا کہ مجھے میرے بارے میں مشورہ دو۔ میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا کرتی جبتک تم سب موجود نہ ہو۔ ارکانِ دولت نے کہا کہ ہم قوت والے ہیں اور سخت جنگ جو ہیں۔ باقی فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ غور فرمالیجئے آپ ہمیں کیا حکم دیتی ہیں ملکہ نے کہا کہ بادشاہ جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کا ستیاناس کر دیتے ہیں اور اس کے معزز لوگوں کو ذلیل تر کر دیتے ہیں۔ ان کا کردار یہی

ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ ملکہ نے کہا کہ اے میرے رب میں اپنے نفس پر ظلم کرتی رہی ہوں اور میں سلیمانؑ کے ساتھ اللہ کی مطیع و فرمانبردار بنتی ہوں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔]

پورا قصہ تفصیل کے ساتھ سورۂ نمل میں بیان ہوا ہے۔ وہاں دیکھ لیں ہم نے صرف چند ضروری آیات نقل کر دی ہیں۔ ان آیات میں حق تعالیٰ سبحانہ، نے بتایا ہے کہ قوم سبا پر ایک عورت حکمراں تھی۔ وہ ان کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ اسے حق تعالیٰ کی تمام نعمتیں حاصل تھیں اور عظیم تخت حکومت کی مالک تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط اسے ملا تو اس نے ارکانِ دولت کو جمع کیا اور انہیں صورت حالات سے آگاہ کر کے ان سے مشورہ طلب کیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے بتایا کہ میں کوئی قطعی فیصلہ تم لوگوں کے مشورہ کے بغیر نہیں کیا کرتی اس لئے تمہاری اس بارے میں جو رائے ہو اس سے مجھے آگاہ کرو۔ ارکانِ حکومت نے بتایا کہ ہم کوئی کمزور قوم نہیں ہیں۔ قوت و حشمت کے مالک ہیں اور بڑی جنگجو قوم کے افراد ہیں۔ اگر آپ مقابلہ کرنا چاہیں تو ہم اس کے لئے تیار ہیں۔ باقی فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ جو حکم دیں گی اس کی تعمیل کی جائے گی۔ ملکہ نے کہا کہ جنگ کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ بادشاہ جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کا ستیاناس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ مملکت میں جو باعزت لوگ ہوتے ہیں، انہیں ذلیل کر ڈالتے ہیں۔ اس لئے میرا ارادہ جنگ کا نہیں ہے۔ میں سلیمان کی قوت اور اس کے ارادوں کا اندازہ کر لینا چاہتی ہوں۔ چنانچہ اس نے سلیمان علیہ السلام کو کچھ تحائف بھیج کر صورتِ

حالات کو سمجھنا چاہا۔ بالآخر وہ اسی نتیجہ پر پہنچی کہ اطاعت قبول کر لی جائے چنانچہ وہ یروشلم میں حاضر ہوئی اور اسلام لے آئی۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ عورت سربراہ مملکت بن سکتی ہے کیونکہ بلقیس کے ایمان لے آنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے معزول نہیں کر دیا۔ اور یہ نہیں فرمایا کہ تم عورت ہو کر سربراہ مملکت نہیں بن سکتیں۔ کسی مرد کو سربراہ مملکت بنایا جائے۔ چنانچہ حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے استفسار کیا تھا کہ :-

سوال :- بخاری میں حدیث ہے لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَھُمْ اِمْرَاَۃً (وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملہ حکومت کا والی عورت کو بنا دیا ہو) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا والی و حاکم ہونا موجب عدم فلاح ہے۔ تو کیا جن ریاستوں پر عورتیں حکمراں ہیں وہ بھی اس میں داخل ہیں؟

الجواب :- حکومت کی تین قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ جو تام بھی ہو، عام بھی ہو۔ تام سے مراد یہ کہ حاکم بانفرادہ خود مختار ہو۔ یعنی اس کی حکومت شخصی ہو۔ اور اس کے حکم میں کسی حاکم اعلیٰ کی منظوری کی ضرورت نہ ہو۔ دوسری قسم وہ جو تام تو ہو مگر عام نہ ہو۔ تیسری قسم وہ جو عام ہو تام نہ ہو۔ مثال اول کی، کسی عورت کی سلطنت یا ریاست بطرز مذکور شخصی ہو۔ مثال ثانی کہ کوئی عورت کسی مختصر جماعت کی منتظم بلا شرکت ہو۔ مثال ثالث کی، کسی عورت کی سلطنت جمہوری ہو کہ اس میں والی صوری درحقیقت والی

نہیں بلکہ ایک رکن مشورہ ہے اور والیٔ حقیقی مجموعہ مشیروں کا ہے۔ حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد حدیث میں پہلی قسم ہے۔ چنانچہ سبب ورود اس حدیث کا کہ اہل فارس نے دختر کسریٰ کو بادشاہ بنایا تھا اور لفظ وَلَّوْا میں تولیت کے اطلاق سے متبادر اس کا کمال مفہوم ہونا۔ پھر اس کی اسناد قوم کی طرف ہونا، یہ سب اس کا قرینہ ہے۔ کیونکہ یہ طریقہ تولیت کاملہ کا سلطان ہی بنانے کے ساتھ خاص ہے کہ قوم کے اہل حل وعقد باہم متفق ہوکر کسی کو سلطان بنا دیتے ہیں اور سلطان کا کسی کو حکومت دینا یہ بھی بواسطہ سلطان کے قوم ہی کی طرف مسند ہوگا۔ بخلاف قسم ثانی کے کہ وہاں گو تولیت کامل ہوتی ہے مگر وہ مستفاد قوم سے حقیقۃً یا حکماً نہیں ہوتی اور بخلاف ثالث کے کہ وہاں گو اسناد اس کی قوم کی طرف صحیح ہے مگر تولیت کامل نہیں ہے۔ بلکہ وہ مشورہ محضہ ہے۔ گو اس مشورہ کو دوسرے منفرد مشوروں پر ترجیح ہو۔ لیکن اس میں ولایت کاملہ کی شان نہیں ہے۔ ورنہ تمام ارکان کی مخالف ہونے کی صورت میں اسی کو سب پر ترجیح ہوتی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ قرینہ تو خود الفاظ حدیث سے ماخوذ ہے۔ اب دوسرے دلائل شرعیہ میں جو نظر کی جاتی ہے تو اس تفصیل کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت بلقیس رضی اللہ عنہا کی سلطنت کا قصہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اس میں آیت ہے۔ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ جس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلطنت کا طرز عمل خواہ ضابطہ سے خواہ بلقیس رضی اللہ عنہا کی عادت

مستمرہ سے سلطنت جمہوری کا سا تھا اور بعد ان کے ایمان لانے کے کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ ان سے انتزاع سلطنت کیا گیا ہو۔ پس ظاہر حکایت سلطنت اور عدم حکایت انتزاع سے اس سلطنت کا بحالہ باقی رہنا ہے اور تاریخ صراحۃً اس کی مؤید ہے اور قاعدہ اصولیہ ہے۔ اِذَا قَصَّ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ عَلَیْنَا اَمْرًا مِنْ غَیْرِ نَکِیْرٍ فَھُوَ حُجَّۃٌ لَنَا (جب اللہ اور اس کا رسول ہم سے (انبیائے سابقین کا) کوئی واقعہ بغیر نکیر کے بیان فرمائیں تو وہ ہمارے لئے حجت ہوتا ہے) پس قرآن سے ظاہراً ثابت ہو گیا کہ سلطنت جمہوری عورت کی ہو سکتی ہے جو قسم ثالث ہے حکومت کی اقسام ثلثہ مذکورہ میں سے اور راز اس میں یہ ہے کہ حقیقت اس حکومت کی محض مشورہ ہے اور عورت اہل ہے مشورہ کی۔ چنانچہ واقعہ حدیبیہ میں خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہ رضؓ کے مشورہ پر عمل فرمایا اور انجام اس کا محمود ہوا۔ اور اگر سلطنت شخصی بھی ہو مگر ملکہ التزاماً اپنی انفرادی رائے سے کام نہ کرتی ہو، وہ بھی اس حدیث میں داخل نہیں۔ کیونکہ علت عدم فلاح کی نقصانِ عقل ہے اور جب مشورۂ رجال سے اس کا انجبار ہو گیا تو علت مرتفع ہو گئی، تو معلول یعنی عدم فلاح بھی منتفی ہو گیا۔ جیسے نقصانِ شہادتِ نساءٗ انضمام شہادتِ رجال سے منجبر ہو جاتا ہے۔ سلطنت بلقیسؓ

میں یہ شق بھی محتمل ہے جس کی طرف اوپر عبارت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ خواہ بلقیسؑ کی عادت مستمرہ ہو اور حدیث شیخین میں ہے۔ فَالْاِمَامُ الَّذِیْ عَلَی النَّاسِ دَاعٍ اِلٰی قَوْلِہٖ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَالْمَرْاَۃُ دَاعِیَۃٌ عَلٰی بَیْتِ زَوْجِھَا وَوَلَدِہٖ وَھِیَ مَسْئُوْلَۃٌ عَنْھُمْ (پس امام جو لوگوں کا راعی (نگہبان) ہوتا ہے (تا این قول رسول صلعم) اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد پر راعی (نگہبان) ہوتی ہے اور ان کے متعلق اس سے سوال ہوگا۔) لفظ داعیۃ مثل لفظ داعٍ جو اس سے قبل ہے مستعمل ہے معنی محاکمہ میں۔ اس حدیث سے قسم ثانی کا عورت کے لئے مشروع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ حضرات فقہاء نے امامت کبریٰ میں ذکورت کو شرط صحت اور قضاء میں شرط صحت نہیں مگر شرط صون عن الاثم فرمایا ہے اور نظارت ووصیت شہادت میں کسی درجہ میں اس کو شرط نہیں کہا۔ ھٰکذا فی الدر المختار باب الامامۃ وکتاب القاضی الی القاضی۔ فقہاء کے اس حکم مذکور قسم اول اور قسم ثانی کے احکام کی تصریح ہے اور قسم ثالث مقیس ہے قسم ثانی پر لاشتراکہما فی کونہما غیر جامعین لوصف التام والعموم۔ جب دلائل بالا سے ثابت ہوگیا کہ حدیث میں مذکور قسم اول ہے تو معلوم ہو گیا کہ ایسی ریاستیں جو آجکل زیر فرمان عورتوں کے ہیں

اس حدیث میں داخل نہیں، اس لئے کہ اگر اس کے محکومین کو مختصر جماعت قرار دیا جائے تب تو وہ قسم ثانی ہے اور اگر اس جماعت کو مختصر نہ قرار دیا جائے جیسا ظاہر بھی ہے تب بھی وہ درحقیقت جمہوری ہیں، یا تو ظاہراً بھی جہاں پارلیمنٹ کا وجود مشاہد ہے یا صرف باطناً جہاں پارلیمنٹ تو نہیں ہے لیکن اکثر احکام میں کسی حاکم بالا سے جو صاحب سلطنت یا نائب سلطنت ہو منظوری لینی پڑتی ہے بس اس طور سے وہ قسم ثالث ہے اور اب یہ بھی شبہ نہ رہا کہ ظاہراً یہ رئیسات مثل قاضی کے ہیں۔ اور قاضی عورت کا حکم حدود و قصاص میں نافذ نہیں ہوتا کما صرح بہ الفقہاً تو ایسے احکام کے نفاذ کی ان ریاسات میں کوئی صورت صحت کی نہ ہوگی۔ وجہ دفع شبہ ظاہر ہے کہ وہ ریاست اول تو جمہوری ہے اور علی سبیل التنزل یوں کہا جاوے گا کہ چونکہ قضاۃ تو ذکور ہیں اس لئے وہ احکام نافذ ہو جائیں گے جیسا فقہاء نے قضاۃ منصوبین من السلطان غیر المسلم کے جمیع احکام کو صحیح اور نافذ فرمایا ہے۔ بالجملہ تحقیق مذکور سے ثابت ہو گیا کہ ریاستیں عدم فلاح کے حکم سے بری ہیں۔ واللہ اعلم۔ ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ

(امداد الفتاوی ج ۵ ص ۹۹-۱۰۱ مطبوعہ دار العلوم کورنگی)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو صحیح مان کر بھی کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے امور

کی تولیت عورتوں کے حوالے کردی ہو" اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس سے مراد وہ حکومتیں ہیں جو تام بھی ہوں۔ یعنی عورتیں حاکم مطلق ہوں اور انہیں غیر محدود اختیارات حاصل ہوں اور وہ کسی کو جواب دہ نہ ہوں جیسا کہ عام طور پر شخصی حکومتوں میں ہوا کرتا ہے۔ لیکن آج کل کی ریاستیں اور حکومتیں جو عموماً جمہوری ہوتی ہیں ان میں سربراہِ مملکت صرف آئینی سربراہ ہوتا ہے ورنہ درحقیقت حکومت واقتدار کی مالک اسمبلی یا پارلیمنٹ ہوتی ہے۔ لہٰذا موجودہ حکومتیں اس میں داخل نہیں ہیں۔ ملکۂ سبا کے واقعہ میں چونکہ یہ تصریح موجود ہے کہ وہ بغیر اپنے ارباب حل وعقد کے مشورے کے، خواہ دستوری طور پر، خواہ آئینی طور پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا کرتی تھیں اس لئے وہ حکومت شخصی آمرانہ اور جابرانہ حکومت نہیں تھی۔ جو ایسی حکومتیں ہوں وہ اس حدیث کی زد میں نہیں آتیں۔ برخلاف ایرانی حکومت کے کہ اس زمانہ میں کسریٰ بالکل خود مختار شخصی بادشاہ ہوتا تھا۔ اور وہ نہ کسی کو جواب دِہ ہوتا تھا اور نہ کسی سے مشورہ کا پابند، ایسی حکومتیں واقعی اس حدیث کے مفہوم کے مطابق ناجائز حکومتیں ہوں گی۔ (حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی حکومتیں مردوں کے لئے بھی ناجائز ہیں۔ مصنف)۔

عورت کے سربراہِ ریاست ہونے کے جواز کی تائید علماء کا ایک طبقہ ہمیشہ سے کرتا آیا ہے۔ اگرچہ علماء کی اکثریت اس کی مخالف رہی ہے اور وہ ان علماء کی تردید کرتے رہے ہیں جو اس کے جواز کے قائل ہیں۔ دیکھیئے رد المختار علی الدر المختار صفحہ ۴۹۴ ج ۴ ۔

قدیم دور کی مشہور شخصیات میں سے مشہور مؤرخ و مفسر علامہ ابن جریر طبری (جن کی تاریخ و تفسیر عموماً تمام مؤرخین و مفسرین کا اول ماخذ مانی جاتی ہے) عورت کے قاضی اور سربراہِ ریاست ہونے کے جواز کے قائل ہیں۔

ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ سے بھی اس کی ایک روایت موجود ہے۔ بخاری کے مشہور شارح علامہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کہتے ہیں

وَالمنع من ان تلی الامارۃ وَالقضاء قول الجمھور و اجازہ الطبری و ھی روایۃ عن مالکؒ۔

(فتح الباری شرح بخاری مطبوعہ مصر صفحہ ۹۸ ج ۸ باب کتاب رسول اللہ الی کسریٰ)

ترجمہ [عورت کے امام اور قاضی ہونے کو ناجائز قرار دینا جمہور کا قول ہے۔ لیکن طبریؒ نے اس کی اجازت دی ہے اور امام مالکؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔]

امام مالکؒ کے اس قول کی بنا پر فقہائے مالکیہ نے اس کی تائید میں فتوے بھی دیئے ہیں۔ (فتح الباری صفحہ ۴۷ ج ۱۳ کتاب الفتن)

امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد یہ ہے کہ:۔

وَعن ابی حنیفۃؒ تلی الحکم فیما تجوز فیہ شھادۃ النساء۔

(فتح الباری صفحہ ۹۸ ج ۸)

ترجمہ [امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے کہ عورت ان امور میں حکم اور فیصلہ دے سکتی ہے جن میں عورتوں کی شہادت جائز مانی گئی ہے۔]

یعنی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حدود اور قصاص کے علاوہ دیگر معاملات میں اس کی حکومت اور قضا شرعاً جائز ہے۔

چونکہ قرآن کی آیات سے جو ہم نے اوپر بیان کر دی ہیں عورت کے سربراہ مملکت ہونے کا جواز معلوم ہوتا ہے اور ائمہ سلف میں سے علامہ طبریؒ، امام مالکؒ اور ایک حد تک امام ابوحنیفہؒ کا رجحان اسی طرف ہے اور علمائے متاخرین میں سے حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ، اور حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے اس لئے ہم اسی قول کو ترجیح دیں گے کہ عورت کا سربراہِ مملکت ہونا شرعاً جائز ہے۔ صحابۂ کرام میں سے حضرات طلحہ و زبیر اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ اور ان کے دیگر ہم نوا سینکڑوں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل بھی ہماری تائید میں ہے۔ (قصۂ جمل پر تفصیلی بحث گذشتہ باب میں گذر چکی ہے)۔

ان دلائل و شواہد کی روشنی میں ہماری رائے یہی ہے کہ اسلام عورت کے سربراہِ مملکت بننے کے خلاف نہیں ہے۔

فریق ثانی کی طرف سے عورت کے سربراہِ مملکت ہونے کے عدم جواز پر چند احادیث پیش کی جاتی رہی ہیں "فقہ القرآن" کا مقصد روایات و احادیث پر کلام کرنا نہیں ہے۔ ہمارا کام صرف تعلیماتِ قرآنی کو پیش کرنا ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ بحث تشنہ نہ رہ جائے ہم تبرعاً ان احادیث کے متعلق بھی مختصراً کچھ عرض کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں ہم اپنی تحقیقات کو پیش کرنے کے بجائے جامعہ اسکندریہ کے دستوری قانون و نظامہائے سیاسیہ کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کی شہرۂ آفاق کتاب "مبادی

نظام الحکم الاسلامی" مطبوعہ مصر کے چند اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید صاحب دستوری مسائل کے متعلق اصول بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"جب ہم دستوری احکام کی سنت پر غور کرتے ہیں (یعنی وہ سنت جو دستوری قانون کے موضوعات سے تعلق رکھتی ہو) تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ عام قاعدہ کی طرح عام تشریع شمار نہیں ہو سکتی"

چنانچہ علمائے شریعت نے جنہوں نے اس سے بحث فرمائی ہے کہ سنت کے کون سے احکام تشریع عام شمار ہوتے ہیں اور کون سے احکام تشریع عام شمار نہیں ہوتے (مثلاً امام قرافی مالکیؒ اور شیخ الازہر الشیخ شلتوتؒ) ہم انہیں یہ اعتراف کرتے ہوئے پاتے ہیں کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے جو احکام جماعت مسلمین کی امامت اور ریاست عامہ کے متعلق صادر ہوئے ہیں وہ تشریع عام شمار نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ ان کی بنیاد وہ مصلحت ہے جو آنحضرتؐ کے مبارک عہد میں قائم تھی۔ اور ظاہر بلکہ بدیہی بات ہے جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ وہ محض وقتی مصلحت کے ماتحت آجاتے ہیں عام تشریع نہیں ہوتے۔ دستوری احکام کی سنتوں کا یہی حال ہے۔

(مبادی نظام الحکم الاسلامی صہ ۲۰۲)

پھر ذرا آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"ظاہری امور بلکہ بدیہی امور میں سے ہے کہ دستوری تشریع (یعنی وہ تشریع جو نظام حکومت سے مختص ہے) وہ ایک

ایسی تشریع ہے جس میں مخصوص معاشرہ کے حالات کی رعایت فرمائی گئی ہے جو تشریع کے وقت موجود تھے۔ اسی لئے ہم انہیں ہر زمان ومکان میں معاشرہ کے اختلاف کے مطابق بدلتا سدلتا پاتے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ زمان ومکان کے اختلاف کے ساتھ بدلتے رہیں گے۔"

(ایضاً ص۲۰۳)

امام قرافی مالکیؒ اور شیخ الازہر الشیخ شلتوتؒ اور خود پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کا غالباً مطلب یہ ہے کہ جماعت مسلمین کی امامت اور ریاستِ عامہ کے سربراہ کی حیثیت سے حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے اگر کوئی خاص طریقہ مروی ہے (واقعہ یہ ہے کہ آپ سے کوئی خاص طریقہ مروی ہی نہیں ہے) تو اسے تشریع عام نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ وہ عرب معاشرہ کے اس وقت کے حالات اور مصالح کے تحت صادر ہوئے تھے۔ بعد میں ہر زمانہ اور ہر مکان میں اس کا اتباع ضروری نہیں ہے۔ ہر زمانہ اور ہر مکان میں اتباع اس اصولی حکم کا ضروری ہے کہ،

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۔ (۴۲/۳۸)

ترجمہ [مسلمانوں کے معاملات حکومت ان کے باہمی مشورے سے طے ہونے چاہئیں۔]

لیکن اس مشورے کی کیا صورت ہونی چاہیئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور بعد میں خلفائے راشدینؓ نے کیا صورت اختیار فرمائی وہ تشریع عام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام خلفاء راشدین کا طریقہ

انتخاب ایک دوسرے سے الگ الگ ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انتخاب جس طرح ہوا، اس طرح فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا انتخاب نہیں ہوا جس طرح حضرت فاروق اعظمؓ کا انتخاب ہوا تھا اس طرح حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا انتخاب نہیں ہوا۔ پھر جس طرح حضرت عثمانؓ کا انتخاب ہوا تھا، حضرت علیؓ کا انتخاب اس طرح نہیں ہوا۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کے حالات ومصالح کے پیش نظر (الائمۃ من قریش (سربراہ مملکت خاندانِ قریش سے ہوں گے) فرمایا تھا۔ اگر اسے بجائے خبر کے حکم بھی مانا جائے) تو یہ حکم بھی اس وقت کے حالات اور مصالح کے ماتحت تھا۔ اسے تشریع عام نہیں سمجھنا چاہیئے۔

اس اصول کے ماتحت ظاہر ہے کہ اگر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے دَور کے حالات ومصالح کے ماتحت بالفرض عورتوں کے سربراہِ مملکت ہونے کی مخالفت بھی فرمائی ہو۔ تو چونکہ یہ بھی ایک دستوری مسئلہ ہے اس لئے اسے بھی تشریع عام نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ ہر زمانہ اور ہر مکان میں ابدالآباد تک قابل عمل ہو۔

اس کے بعد پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید صاحب اس حدیث کے متعلق اظہار خیال فرماتے ہیں جس میں عورتوں کو ناقصات العقل والدین (عقل اور دین میں ناقص) قرار دیا گیا ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"رہی وہ حدیث "النساء ناقصات عقل ودین" (عورتیں

عقل اور دین میں ناقص ہوتی ہیں) تو یہ ایک واضح بات ہے جسے کوئی بیان اور کوئی دلیل رد نہیں کرسکتی کہ یہ حدیث ان ہزاروں حدیثوں میں سے ایک ہے جو گھڑی گئیں اور جھوٹ موٹ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔ متن حدیث میں علاماتِ وضع (جھوٹ) میں سے جیسا کہ علمائے حدیث نے بیان فرمایا ہے اس کے مضمون کا فساد ہے۔ یعنی حدیث کا ایک ناممکن بات کو بیان کرنا جسے عقل انسانی قبول نہ کرسکے یعنی بداہت کے خلاف ہونا یا حدیث کا قرآن کے مخالف ہونا یا حدیث کا تاریخی حقائق کے خلاف ہونا۔"

(۱) ہم بتائیں گے کہ یہ حدیث ان تینوں علاماتِ وضع پر مشتمل ہے۔ اگر اس حدیث کو احادیث صحیحہ میں بھی شمار کیا جائے تو صرف سیاسی حقوق سے عورت کا محروم ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس پر دوسرے بے شمار خطرناک نتائج بھی مرتب ہوں گے جو بدیہی طور پر شریعتِ اسلامیہ کے بے شمار احکام سے ٹکرائیں گے۔ (جو خود قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں) جیسا کہ بعض دوسری احادیث سے بھی ٹکرائیں گے۔ ساتھ ہی عہد رسالت مآب اور عہد خلفائے راشدین کے بعض تاریخی حقائق سے بھی ٹکرائیں گے، نیز بداہت سے بھی یوں ٹکرائیں گے جنہیں عقول انسانی قبول نہیں کرسکتیں۔

اگر یہ بات صحیح ہو کہ عورتیں ناقصات العقل والدین ہوتی ہیں

تو ان پر اپنے اموال میں تصرفات پر پابندیاں عائد کرنا لازم ہونا چاہیئے یا کم از کم ان کے تمام تصرفات کو بغیر ان کے شوہر یا ولی کی اجازت کے قبول نہ کیا جانا چاہیئے۔ لیکن اسلام نے اس بارے میں عورت کی اہلیت کاملہ کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ اسلام نے ان کے مالک بننے اور اپنے اموال میں ہر قسم کے جائز تصرفات کرنے کے حق کو تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا اسلامی شریعت میں "عورت ہونا" حجر (پابندی عائد کرنے) کے اسباب میں سے نہیں ہے جیسا کہ جرمنی کے قانون کے مطابق بعض ادوار میں تھی یا جیسا کہ فرانسیسی قانون کے مطابق عہد جدید میں بھی ۱۹۳۸ء تک عائد رہی ہے۔

اور اگر یہ بات صحیح ہو کہ عورتیں ناقصات العقل والدین ہوتی ہیں تو مؤرخین کا وہ بیان صحیح نہ ہونا چاہیئے۔ کہ خلفائے راشدینؓ عورتوں سے بھی مشورہ لیا کرتے اور ان کی آراء کو اہمیت دیا کرتے تھے۔[۱]

اور اگر یہ بات صحیح ہوتی کہ عورتیں ناقصاتِ عقل و دین ہوتی ہیں تو امام ابو حنیفہؒ بعض حالات اور مقدمات میں عورت کے عہدۂ قضاء

---

[۱] گذشتہ ابواب میں گذر چکا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جبکہ مسلمانوں کے جذبات برافروختہ تھے اور آپ کے ارشاد کے بعد بھی لوگ قربانی کر کے احرام کھولنے کے لئے تیار نہ ہوتے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ سے فرمایا اور انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ آگے بڑھ کر خود قربانی کر کے احرام کھول دیں چنانچہ آپؐ نے ایسا ہی کیا تو تمام صحابہ نے قربانیاں کر کے احرام کھول دیئے تھے۔ حضرت ام سلمہؓ کے مشورہ کا انجام نہایت ہی محمود ہوا۔ (مؤلف)

کو قبول کرنے کی اجازت نہ دیتے اور علامہ طبری رح عام حالات میں اس کی اجازت نہ دیتے۔[1] اور اگر یہ بات صحیح ہو کہ عورتیں ناقصاتِ عقل و دین ہوتی ہیں تو ان میں سے کوئی عورت ان صحابہ کرام میں شمار نہ ہونی چاہیئے جو فتاویٰ دینے میں شہرت رکھتی ہیں اور تاریخ اسلامی میں کوئی عورت ان بیشمار عالم عورتوں میں نہ پائی جاتی جو علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ اور علم ادب وغیرہ میں شہرت کے آسمان پر چمک رہی ہیں۔

پھر عقولِ انسانی اس حدیث کی صحت کو کیسے قبول کر سکتی ہیں جبکہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لانے والی ایک عورت ہی تھی یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی زوجۂ مطہرہ سیدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ اور جب قرآن کریم کو سرکاری طور پر ایک مصحف میں جمع کیا گیا تو اسے ایک عورت ہی یعنی حضرت حفصہ بنت عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تحویل میں دیا گیا تھا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ تھیں۔ یہ امانت ان کے پاس حضرت ابوبکر صدیق خلیفۂ اول کے عہد سے لے کر خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد تک رہی۔ چنانچہ ان ہی کے پاس سے قرآن کریم کا مصحف حاصل کیا گیا اور سرکاری مصاحف کی نقول تیار کرنے میں اسی مصحف پر اعتماد کیا

[1] اس حدیث کے متن میں وضع کی علامات کی اگر آپ تفصیل دیکھنا چاہیں تو استاذ ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی صدر شعبۂ فقہ اسلامی فیکلٹی حقوق و شریعت دمشق یونیورسٹی کی کتاب "السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی" صفحات ۱۰۶، ۱۲۰، ۲۵۰، ۲۵۱ کو ملاحظہ فرمالیں۔ (ڈاکٹر سباعی اخوان المسلمین کے نہایت اہم رہنما تھے)۔

گیا۔ چنانچہ اسی سے نقلیں تیار کی گئیں اور مختلف شہروں میں نقول تیار کرنے کے لئے بھیجی گئیں کہ لوگ اپنے اپنے مصحف اس کے مطابق صحیح کرلیں یہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پہ کتنا بڑا اعتماد تھا؟

اس حدیث کی صحت کو لوگوں کی عقلیں کس طرح تسلیم کرلیں کہ عورتوں کی عقلیں اور ان کے دین ناقص ہوتے ہیں جبکہ خود حق تعالیٰ نے ایک عورت یعنی سیدہ مریم علیہا السلام کے متعلق قرآن میں یہ فرمایا ہو کہ۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ترجمہ [یاد کرو، جب فرشتوں نے یہ کہا تھا کہ اے مریم اللہ تعالیٰ نے تمہیں برگزیدہ کرلیا ہے اور تمہیں پاک کر دیا ہے اور تمہیں تمام جہانوں کی عورتوں میں سے منتخب کرلیا ہے۔]

واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیث اس روح اسلامی سے قطعاً ہم آہنگ نہیں ہے جس نے عورت کو عزت و حرمت سے نوازا جبکہ وہ ذلت و رسوائی کے قعر مذلت میں، عرب جاہلیت کے نزدیک اور عربوں کے علاوہ دوسری قوموں کے نزدیک بھی گرفتار چلی آرہی تھی کہ وہ جس سے چاہتے اس کا نکاح (اس کی مرضی کے بغیر) کر دیتے تھے۔ بلکہ اسے پیشہ کرنے پہ مجبور کر سکتے تھے۔ جس کی وہ خود تو وراثت حاصل کر سکتے تھے مگر اسے وارث نہیں بناتے تھے۔ وہ مملوکہ ہو سکتی تھی مگر کسی چیز کی مالک نہیں ہو سکتی تھی۔ اور خود اپنی ملکیتوں میں بغیر مرد کی اجازت کے اس کے تمام تصرفات پہ پابندیاں عائد تھیں۔

پھر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی تو نقل کیا جاتا

ہے کہ۔

مَا اَکْرَمَ النِّسَاءَ اِلَّا کَرِیْمٌ وَلَا اَهَانَهُنَّ اِلَّا لَئِیْمٌ

ترجمہ [یعنی شریف آدمی ہی عورتوں کی عزت کرتا ہے اور کمینہ آدمی ہی عورتوں کی اہانت کرتا ہے"]

اس حدیث کو حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ابن عساکر نے نقل کیا ہے۔ (دیکھئے الوحی المحمدی للسید رشید رضا ص۲۸۰)

ابن عساکر میں یہی روایت حضرت معاویہؓ سے بھی مروی ہے (عثمانی)

(مبادی نظام الحکم الاسلامی ص۸۷۹ تا ۸۸۲ للاکتور عبد الحمید استاذ القانون الاستوری والانظمۃ السیاسیۃ بکلیۃ الحقوق بجامعۃ الاسکندریۃ)

اس کے علاوہ ڈاکٹر پروفیسر عبد الحمید صاحب فرماتے ہیں کہ،،

"ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ دستوری مسائل کی عظمت اور اہمیت کے پیش نظر یہ جائز نہیں ہے کہ دستوری میدان میں کسی ایسی دلیل کو لیا جائے جو غیر یقینی اور ظنی رنگ رکھتی ہو ــــــ یعنی اخبار آحاد ــــــ جیساکہ معلوم ہے اور جیساکہ علماء کے مابین متفق علیہ ہے۔ خبر واحد ظنی رنگ کی چیز ہی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کو بیان کرنے والے عظیم امام بخاریؒ ہی کیوں نہ ہوں۔ جیساکہ ہم پہلے کہہ چکے اور بتا چکے ہیں کہ امام شیخ محمد عبدہؒ اکثر اخبار کو قبول نہیں کرتے تھے وہ انہیں ترک کر دیتے تھے، چاہے وہ حدیث ان روایات میں سے کیوں نہ ہو جنہیں امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ نیز ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ بھی اخبار آحاد کو قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ احادیثِ مشہورہ کو قبول کیا کرتے تھے۔

اور وہ دونوں حدیثیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اخبار آحاد ہی میں سے ہیں۔

دوم:۔ بحث میں اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ یہ دونوں حدیثیں یقینی رنگ کی حامل ہیں۔ یعنی بالفرض وہ دونوں متواتر یا مشہور حدیثوں میں شمار ہونے لگیں جن میں ہم نے ایک متعین شرط لگائی ہوئی ہے کہ حدیث کبار صحابہ میں سے کم از کم دو صحابیوں سے منقول ہو۔ اگر ہم بحث میں یہ بات مان بھی لیں تو بھی ان دو حدیثوں کی طرح کی حدیثیں ہمارے لئے اس جدید دَور میں حجت نہیں ہو سکتیں (یعنی لازمی دلیل نہیں بن سکتیں) کیونکہ سنت، دستوری احکام کے میدان میں (جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں) تشریع عام شمار نہیں ہوتی۔ یعنی ابدی رنگ والی شمار نہیں ہوتی کہ وہ تمام مسلمانوں کے لئے ہر دَور میں لازمی دلیل بن جائے۔

سوم:۔ گزشتہ تصریحات کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ یہ دونوں حدیثیں مسلمانوں کی جماعت کے لئے امر کے صیغہ کے ساتھ یا عموماً قاعدہ کے طور پر جس پر انہیں عمل کرنا چاہیئے اور ان پر اس کی پیروی لازم ہو، وارد نہیں ہوئیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجیئے کہ انہیں کوئی تشریعی رنگ حاصل نہیں ہے۔

چہارم:۔ جہاں تک پہلی حدیث کا تعلق ہے کہ

مَا أَفْلَحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ امْرَأَةً [۱]

---

[۱] یعنی بعض رُوات نے اس میں "مَا أَفْلَحَ" (فلاح نہیں پائی) فرمایا ہے اور بعض رُوات نے اس میں "لَنْ يُفْلِحَ" (ہرگز فلاح نہیں پائے گی) فرمایا ہے۔ بہرحال

اگر ہم بطورِ بحث کے یہ تسلیم بھی کر لیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس قوم کے فلاح نہ پانے کی خبر دینا ہی نہیں ہے جو اپنے معاملات حکومت کسی عورت کے حوالے کر دے بلکہ آپ کا مقصد یہی بتانا ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکے گی جو اپنے معاملات عورت کے حوالے کر دیں یعنی آپؐ کا مقصد یہی تھا کہ اپنی امت کو ایرانیوں کے طرزِ عمل کی پیروی سے منع فرمائیں۔ اور اس کے باوجود کہ یہ حدیث ـــــــ راویوں کے بقول ـــــــ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ جب آپ کو یہ بات پہنچی کہ ایرانیوں نے اپنے اوپر حکومت کرنے کے لئے کسریٰ کی ایک بیٹی کو کسریٰ کے مرنے پر مقرر کر لیا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ بحث میں اگر ہم یہ بات تسلیم بھی کر لیں تو یہ ممانعت یہاں خاص رئیس مملکت بنانے کے لئے ہے۔ اس سے یہ بات کہاں سے نکل آئی کہ ہم حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارادہ کو ریاست کے علاوہ دوسرے وظائف دولت اور مہمات سلطنت پر بھی چسپاں کر لیں۔ اور پارلیمنٹ کی رکنیت، حق انتخاب وغیرہ سیاسی حقوق سے بھی عورت کو اس لئے محروم کر دیں کہ وہ سربراہِ مملکت نہیں بن سکتی۔ کیونکہ دستوری کوائف میں (جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں) قیاس کے ذریعہ احکام مستنبط کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ پھر یہ کہ عام قاعدہ تو یہی ہے کہ تمام حقوق و واجبات میں مرد اور عورت کے درمیان کامل مساوات ہے بجز ان امور کے جن کا استثنار کسی نص صریح سے کر لیا گیا ہو۔ (مبادی نظام الحکم الاسلامی صفحہ ۸۷۶ ـ ۸۷۸)

روایت کی اس عبارت کا اختلاف حدیث کے معنے و مطلب میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کی اس تفصیلی بحث پر ہم اتنا اضافہ اور کریں گے کہ پہلی حدیث مَا اَفْلَحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَأَةً بھی دوسری حدیث کی طرح موضوع ہے۔ اس حدیث کا اس وقت تک کوئی پتہ نہیں تھا جبتک جنگ جمل واقع نہیں ہوئی۔ حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کو بھی (حسبِ بیانِ حدیث) یہ حدیث اسی وقت یاد آئی جب حضرت علی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فوج کی کمان سنبھال لی۔ اس واقعہ سے پہلے انہیں بھی یہ حدیث یاد نہیں آئی۔ یہ بات صاف چغلی کھا رہی ہے کہ یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قیادت کو کمزور کرنے کے لئے بعد میں گھڑی گئی ہے۔ اس حدیث کے موضوع اور من گھڑت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کے متعلق تمام محدثین اور مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تھے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا۔ جب وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے شریکِ جنگ تھے تو انہیں اس حدیث کے یاد آجانے سے کیا فائدہ ہوا اور اس حدیث کے یاد آجانے نے انہیں کیا خاک بچایا۔ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ جیسا جلیل القدر صحابی ارشادِ نبوی کے یاد آجانے کے بعد بھی اپنے غلط موقف پر جما رہے اسے ہماری عقل تسلیم نہیں کرتی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری شرح بخاری میں رقم طراز ہیں کہ:۔

ابن بطال نے مہلب سے نقل کیا ہے کہ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بظاہر

یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمل و کردار کے کمزور ہونے کا وہم ہوتا ہے۔ (یعنی یہ حدیث حضرت عائشہؓ کے موقف کو کمزور کر دیتی ہے) حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے مسلک کے متعلق مشہور بات یہی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان اصلاح حال کے مطالبہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی رائے کی تائید میں تھے۔ ان کا مقصد جنگ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ لیکن جب جنگ بھڑک اٹھی تو ان لوگوں کے لئے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ تھے جنگ کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر ہی نہیں۔ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہؓ کی رائے سے قطعاً رجوع نہیں کیا۔ البتہ انہوں نے یہ بات سمجھ لی کہ وہ مغلوب ہو جائیں گی۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ جو لوگ حضرت عائشہؓ کے ساتھ تھے وہ ان کے حکم اور ان کی کمان کے اندر جنگ کر رہے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے ایرانیوں کے بارہ میں (حضور صلعم سے) سنا تھا۔ ابن بطال نے کہا ہے کہ اس بات کی دلیل (کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ساتھی جنگ نہیں چاہتے تھے) یہ ہے کہ کسی ایک نے بھی یہ بات نقل نہیں کی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے (مثلاً حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعید ابن العاص رضی اللہ عنہم وغیرہ) انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے امر خلافت میں جھگڑا کیا ہو یا لوگوں کو اپنے میں سے کسی ایک کی طرف دعوت دی ہو کہ اسے خلیفہ بناؤ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اور جو ان کے ساتھ تھے انہوں نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس موقف پر انکار کیا تھا کہ وہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل نہیں کر رہے تھے اور ان سے کوئی قصاص نہیں لے رہے تھے۔

(فتح الباری صفحہ ۱۶۶ ج ۱۶ کتاب الفتن۔ مطبوعہ مصر)

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ ؓ قَالَ لَقَدْ نَفَعَنِی اللّٰہُ بِکَلِمَۃٍ اَیَّامَ الْجَمَلِ لَمَّا بَلَغَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ فَارِسَ مَلَّکُوْا اِبْنَۃَ کِسْرٰی قَالَ لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَھُمْ اِمْرَاَۃً۔

(صحیح بخاری صفحہ ۱۰۵۳ ج ۲ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)

ترجمہ [ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے مجھے جنگ جمل کے ایام میں ایک بات نے بہت نفع پہنچایا۔ (وہ بات یہ تھی کہ) جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ اہل ایران نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنی ملکہ بنا لیا ہے تو آپ نے فرمایا تھا کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات کا اختیار ایک عورت کے سپرد کر دیا ہو۔]

سوال یہ ہے کہ اس قولِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یاد آجانے نے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے صحابی کو کیا صرف یہ فائدہ پہنچایا تھا کہ وہ یہ بات سمجھ گئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ماتحت جنگ کرنے والے مغلوب ہو جائیں گے۔ حالانکہ وہ خود بھی ان کے زیرِ کمان شریک جنگ تھے۔ لیکن یہ یاد آجانے کے بعد بھی حسب تصریح ابن بطال ؒ وہ آخر دم تک حضرت عائشہ ؓ کی رائے پر قائم رہے۔ انہوں نے اپنی رائے سے رجوع بھی نہیں فرمایا۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت پر بھی آمادہ نہ ہو سکے۔ یہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ پر سراسر بہتان ہے کہ ارشادِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کو یاد آجانے کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر جمے رہیں اور اس سے رجوع نہ فرمائیں۔ جس نے یہ روایت وضع کی ہے اس نے نہ صرف

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی پوزیشن ہی کو کمزور کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بھی بہت بڑا اتہام لگایا ہے حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان اس قسم کی ضد، ہٹ اور مخالفت رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے بہت بلند ہے۔

علامہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور علامہ حافظ ابن بطالؒ نے جو کچھ فرمایا ہے اسے حضرت امام بخاریؒ کی روایت کا بھرم رکھنے کی کوشش ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس روایت کے نتائج و عواقب پر غور نہیں فرما سکے۔ حق تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کو معاف فرمائے۔ ہمارے نزدیک ایک صحابی رسول کی شان کا تحفظ امام بخاری کی روایت کے تحفظ سے زیادہ ضروری ہے۔

لیکن بالفرض اگر اس حدیث کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو حسب بیان پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید صاحب مصری یہ حدیث تشریعی نہیں ہے بلکہ ایک نفسیاتی تجزیہ ہے کہ جس قوم میں اتنا قحط الرجال ہو جائے کہ انہیں اپنی سربراہی کے لئے کوئی مرد نہ مل سکتا ہو اور وہ عورت کو اپنی سربراہی کے لئے منتخب کرنے پر مجبور ہو جائے اس قوم کا اللہ ہی حافظ ہے۔ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی۔ یہ بات ایسی ہی ہے جیسے کسی شاعر نے ہمارے موجودہ مسلم معاشرہ پر طنز کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ ؎

این زماں ہمت مرداں بہ ہمیں محدود است
کہ زن از پردہ بروں آید و کارے بکند

تو یہ حدیث کوئی تشریعی حکم نہیں ہے بلکہ ایسی قوموں کا ایک نفسیاتی تجزیہ ہے کہ وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جس کی قیادت کے لئے کوئی مرد میسّر نہ آ سکے اور اسے اپنی قیادت کسی عورت کے سپرد کرنی پڑے۔

آخر میں ہم علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے اقتباس پر اس باب کو ختم کرتے ہیں۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ:-

"حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اسلام کے اس حادثہ کو معلوم کر کے کیا کچھ صدمہ نہ ہوا ہوگا اور مسلمانوں کو اس ابتری کی حالت میں دیکھ کر ان کو کیسا دکھ ہوا ہوگا اور خصوصاً جب ان کو نظر آیا ہوگا کہ اس گتھی کو سلجھانے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ وہ فطرتاً نہایت بلند حوصلہ، جری اور پُر دل تھیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے اجازت چاہی تھی کہ وہ جہاد میں شریک ہوا کریں۔ آپؐ نے فرمایا۔ "عورتوں کا جہاد حج ہے"۔ اس سے پہلے جب حجاب کا حکم نہ تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بعض غزوات میں شریک رہی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق وہ غزوۂ بدر میں گئی تھیں۔ جنگ احد میں جب مسلمان خطرہ کی حالت میں تھے اور بہادروں کے پاؤں اکھڑ رہے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پائینچے چڑھائے مشک کاندھے پر لئے زخمیوں کو دوڑ دوڑ کر پانی پلا رہی تھیں۔ غزوۂ خندق میں جب مسلمان محصوری کی حالت میں تھے حضرت عائشہؓ زنانہ قلعہ سے نکل کر جنگ کی حالت کو دیکھتی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ عورت کے طبعی حالات فرائض امامت کے منافی ہیں اور خود اسلام نے امام کے لئے جو ضروری شرائط قرار دیئے ہیں ان سے یہ جنس لطیف کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ امامت جمہور اور خلافت الٰہی کے فرائض سے سبکدوش ہے۔ لیکن اس سے یہ غلط

استناد نہیں کرنا چاہیئے کہ کسی مسلمان عورت کو کسی حالت
میں بھی پبلک کی سیاسی اور فوجی رہبری جائز نہیں، خصوصاً
ایسی حالت میں کہ ساری ملت میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک
رہی ہو اور اس کے خیال میں مسلمانوں میں کوئی دوسرا آدمی اس
فتنہ کو بجھانے والا نہ ہو۔ امام مالکؒ، امام طبریؒ اور ایک روایت
میں امام ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے اماموں کے نزدیک عورت
کو امامت اور قضاء کا عہدہ مل سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے
زمانہ میں بازار کا انتظام ایک عورت کے سپرد کیا تھا۔ خود
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب مسلمان عورتوں کے مجمع میں
ہوتیں اور نماز کا وقت ہوتا تو بیچ میں امام بن کر کھڑی ہوتی
تھیں۔"

(سیرت عائشہ ص۱۲۶ سید سلیمان ندوی مطبوعہ مطبعہ معارف
اعظم گڑھ۔ انڈیا)

ہم اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے اس موقف کی
حرف بحرف تائید کرتے ہیں۔ البتہ ہمیں اس سے مزید اختلاف ہے جو مولانا
نے فرمادیا ہے کہ:

"خود اسلام نے امام کے لئے جو ضروری شرائط قرار دیئے ہیں
ان سے یہ جنس لطیف کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔"

ان مشہور ضروری شرائط کو اسلام کے سر تھوپ دینا ہماری سمجھ
میں نہیں آیا۔ ہم گذشتہ صفحات میں تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ قرآن و سنت سے
کوئی ایسی بات ثابت نہیں جس کی بنیاد پر عورت کی سربراہی کو ناجائز قرار

دیا جا سکے۔ البتہ اگر ہمارے علماء کی طرف ان شرائط کو منسوب کیا جاتا تو زیادہ صحیح ہوتا۔ مگر ہمارے علماء کا جو حال ہے وہ بھی ہم بتا چکے ہیں کہ ایک وقت میں وہ اسے ناجائز قرار دیتے ہیں اور دوسرے وقت میں اسی کے جواز کے فتوے بھی صادر فرما دیتے ہیں۔

خواتین کے لئے اسوۂ حسنہ

امہات المؤمنین سب کی سب ہماری مائیں ہیں اور اس حیثیت سے وہ تمام مسلمانوں کے لئے لائقِ صد احترام ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ عہد حاضر کی مسلم خواتین کے لئے اگر کسی نے اپنے عمل اور کردار سے کوئی نمونۂ زندگی چھوڑا ہے تو صرف ام المؤمنین سیدۂ کائنات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی نے چھوڑا ہے۔ یہ ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ آج مسلم خواتین نے اپنے آپ کو صرف گھریلو زندگی کے مشاغل تک ہی محدود نہیں رکھا ہے۔ بلکہ وہ مصافِ زندگی میں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک بن چکی ہے۔ وہ تجارت بھی کر رہی ہے۔ ملازمت بھی کر رہی ہے۔ مقدمات کی پیروی بھی کر رہی ہے۔ کرسیٔ عدالت پر بیٹھ کر فیصلے بھی کر رہی ہے۔ سیاسیات میں بھی حصہ لے رہی ہے۔ انتخابات بھی لڑ رہی ہے۔ پارلیمان کی ممبر بھی بن رہی ہے۔ اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں تعلیمی و تدریسی وظائف بھی ادا کر رہی ہے۔ ہسپتالوں میں دکھی مریضوں کے مرض کا مداوا بھی کر رہی ہے۔ فوجی خدمات بھی انجام دے رہی ہے۔ موجودہ دور کی مسلم خواتین کے لئے دیگر امہات المؤمنین کی حیاتِ طیبہ میں کوئی نمونۂ عمل نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی نمونۂ عمل نظر آتا ہے تو سیدۂ کائنات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زندگی ہی میں نظر آتا ہے۔ لیکن بُرا ہو پروپیگنڈے

کا۔ ہمارے مؤرخین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے تابناک کارناموں پر پردہ ڈالنے اور ان کی سیاسی قیادت کو ملعون کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اُمت مسلمہ پر جو احسان عظیم کیا ہے اس کے تشکر سے ہم تاقیامت عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اگر انہوں نے بر وقت ہمت مردانہ کا مظاہرہ نہ فرمایا ہوتا تو نہ جانے آج اسلام کا حلیہ کتنا کچھ بگڑ چکا ہوتا۔ ان کی اس سیاسی جدوجہد نے اسلام کو واقعۃً تباہی سے بچا لیا۔ اور جو کام اپنے وقت میں (حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امت مسلمہ کو ارتداد جیسی اذیت ناک صورتِ حال سے نکالنے اور ملت اسلامیہ کو حیات نو عطا فرمانے کے لئے انجام دیا تھا۔ بعینہٖ وہی کام ان کی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے وقت میں سبائی فتنہ سے ملت اسلامیہ کو نجات دینے کے لئے انجام دیا ہے۔ حق تعالیٰ انہیں پوری ملّت اسلامیہ کی طرف سے جزائے خیر دے اور ان کے مرقد مبارک کو اپنے لافانی انوار سے پر نور فرمائے۔ اس سلسلہ میں ہم اپنے ملک کے ایک مقتدر عالم مولانا محمد اسحٰق صاحب صدیقی ندوی سابق شیخ الحدیث و مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماً لکھنؤ کا ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں۔ جس سے ام المؤمنین علیہا السلام کے کارناموں کا کچھ سرسری اندازہ ہو سکے گا۔ مولانا موصوف اپنی گرانقدر تالیف "اظہار حقیقت" جلد دوم (شائع کردہ مکتبہ اسلامیہ جامع مسجد بنوری ٹاؤن کراچی) میں رقم طراز ہیں:۔

جنگ جمل کے روشن پہلو

اسلام کے خلاف جو تخریبی تحریک رئیس المنافقین عبد اللہ ابن ابی ابن سلول نے

شروع کی تھی اور جس کی تجدید عبداللہ ابن سبا نے کی وہ حالات کے لحاظ سے مختلف رنگ بدلتی رہی۔ اس میں اتار چڑھاؤ تو بہت ہوا مگر تحریک ختم نہیں ہوئی اور آج بھی مختلف صورتوں میں جاری ہے۔

اس کی تاریخ یہ ہے کہ اپنی ابتدار میں تو یہ بالکل ناکام رہی۔ حضرات شیخین رضؓ کے پورے دور اور امت کے شہید اعظم حضرت عثمانؓ ذی النورین کے ابتدائی اور متوسط دور میں بھی مضمحل رہی۔ ان کے آخری زمانہ میں اس نے طاقت پکڑی۔ خلافت مرتضویؓ کے زمانہ میں اس کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ اگر وہ اس کے بعد خدانخواستہ اپنے ناپاک منصوبے میں کامیاب ہوجاتے تو آج دین اسلام کی جگہ بھی یہودیت اور مسیحیت کی صف میں ہوتی۔ اس سازش کو ناکام بنانے میں جنگ جمل بہت مؤثر ثابت ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فریقین کی مرضی اور ان کے ارادے کے خلاف محض سبائیوں کی فتنہ انگیزی اور فریب کاری کی وجہ سے مسلمانوں کا جو خون بہا وہ بہت افسوسناک ہے۔ لیکن یہ خون رائیگاں نہیں گیا۔ اس سے مندرجہ ذیل عظیم الشان فوائد اور دوررس نتائج نکلے۔

(۱) سبائیوں کو اتنی کامیابی تو ضرور ہوگئی کہ انہوں نے مسلمانوں کے درمیان خون ریزی کرادی۔ لیکن اس کے نتیجہ میں فریقین کے درمیان بجائے بغض و عداوت پیدا ہونے کے مستقل اتحاد پیدا ہوگیا جو انتہائی خلوص پر مبنی تھا۔ یہ سبائیوں کی بہت بڑی ناکامی تھی جس سے ان کا منصوبہ بڑی حد تک ناکام ہوگیا۔ اور اس ناکامی نے ان کی شرانگیز تحریک کو کمزور کردیا۔

(۲) سبائیوں کی نقابِ نفاق و تقیہ پارہ پارہ ہوگئی اور ان کا مکروہ چہرہ اس قدر نمایاں ہوگیا کہ قریب قریب سب انہیں پہچان گئے۔ اس شناخت

نے بھی ان کی تحریک کو بالکل مردہ نہیں تو کم از کم مفلوج اور ادھ موا کر دیا۔

③ صفحاتِ سابقہ میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں کہ ام المؤمنینؓ اور ان کے رفقاءؓ کا بہت بڑا مقصد دستورِ اسلامی کی حفاظت اور اسے تحریف سے بچانا تھا۔ اس مقصد میں اُنہیں مکمل طور پر کامیابی ہوئی۔ خوں ریزی ہوئی مگر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ سیدنا عثمانؓ کو خلافت سے ہٹانے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ از روئے اسلام غلط تھا۔ گویا دینِ اسلام کا دستوری حصہ تحریف سے بچ گیا۔ اور اس معاملہ میں بھی سبائی اپنی کوشش میں بالکل ناکام رہے۔

④ مفسدوں نے اپنی سازش کا جال دُور دُور تک پھیلا دیا تھا اور کوفہ اور بصرہ کو اپنا مرکز بنا لیا تھا۔ ام المؤمنین علیہا السلام کے اس جرأت آمیز اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ایک مرکز بصرہ تباہ ہو گیا۔ مدینہ میں سبائیوں نے قدم جمالئے تھے وہ بھی وہاں سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور ان کی خاصی تعداد جنگ جمل میں مردار، مستحق نار ہو گئی جس کی وجہ سے ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ کوفہ کے مرکز پر بھی اس کا اثر پڑا اور ایک مدت کے لئے ان کی تحریک رک گئی اور نہ صرف رک گئی بلکہ اسلام کو مٹانے کے لئے جو خاکہ انہوں نے اس وقت بنایا تھا وہ خاک میں مل گیا۔

⑤ بار بار عرض کیا جا چکا ہے کہ سبائیت یہودی ذہن و دماغ کی اختراع ہے۔ انہوں نے اسلام میں یہودیت کی قلم لگا کر ایک نیا مذہب ایجاد کر لیا تھا اور اس کا دامن سیاست سے وابستہ کر دیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ سیاسی اقتدار حاصل کر کے اپنے افکار و عقائد اور فاسقانہ اعمال و اطوار کی اشاعت و ترویج کی جائے اور پوری امت کو اصل اسلام سے ہٹا کر

ایک ایسے اسلام کا پیرو بنا دیا جائے جو نام کا اسلام اور حقیقت کے لحاظ سے یہودیت، مجوسیت وغیرہ باطل مذاہب کا ایسا مرکب ہو جس میں کچھ اجزاء اسلام کے بھی شامل ہوں۔

اسکیم یہ تھی کہ حضرت علیؓ کو گھیر کر خلیفہ برائے نام بنا دیا جائے اور ان کی آڑ میں اقتدار حاصل کیا جائے۔ ان کی تعریف و ستائش میں حدودِ مبالغہ کو بھی پار کر لیا جائے۔ پھر اپنے افکار باطلہ کو ان کی طرف منسوب کیا جائے اور جو جماعت صحابہ اس فریب کے خلاف آواز اٹھائے یا جس سے اس کا اندیشہ ہو کہ اس مفسد گروہ کی نقاب کشائی کر دے گی اسے بدنام کر کے اس کے خلاف عام مسلمانوں کو ابھار دیا جائے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہم خیالوں کی قوت اور تعداد میں اضافہ کر کے ایک دن خلافت و حکومت پر مکمل قبضہ کر لیا جائے اور اس سے فائدہ اٹھا کر پوری امت میں اپنے افکار باطلہ اور اعمالِ خبیثہ کو مروج کیا جائے۔ اگر خدانخواستہ ان کا یہ خواب پورا ہو گیا ہوتا تو آج اہلسنت کی وہی حیثیت ہوتی جو شیعوں اور قادیانیوں کی ہے۔ یعنی وہ امت سے کٹا ہوا ایک قلیل التعداد فرقہ ہوتا اور سوادِ اعظم شیعوں پر مشتمل ہوتا۔ اللہ تعالیٰ درجات و مراتب بلند فرمائے حضرت ام المؤمنین سلام اللہ علیہا اور حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ حضرت سعیدؓ ابن العاص، حضرت مروان اور ان کے سب رفقاء کے رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کے بروقت، جرأت آمیز، مجاہدانہ اقدام نے سبائیوں کی خطرناک امیدوں پر پانی پھیر دیا اور ان پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ان کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ آج ان کے متبعین ایک قلیل التعداد فرقہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور سواد اعظم اہل سنت پر مشتمل ہے۔ یہ طفیل

ہے ان حضرات کے اس مخلصانہ تاریخی اقدام کا اور یہ ایک بے بہا نتیجہ ہے جنگ جمل کا جو اگر دس ہزار کیا دس لاکھ خون کر کے بھی حاصل ہوتا تو مفت ہی کہا جاتا۔

(۶) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب بحیثیت خلیفہ جن حالات اور جس طرز پر ہوا اس کا اثر یہ ہوا کہ آں ممدوح کو سبائیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور انہیں بالکل شاہ شطرنج بنا دینے کی پوری کوشش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ آں موصوف اپنے تدبر اور اپنی دانشمندی کی وجہ سے ان کے قابو میں نہ آسکے۔ لیکن سبائیوں نے تو کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور نظام حکومت پر حاوی ہو جانے کے لئے ہر قسم کی ممکن تدبیر انہوں نے کی۔ حضرت علیؓ پر وہ مکمل قبضہ نہ پا سکے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کی خلافت کو اپنے پیشرو خلفائے راشدینؓ کی خلافت کے مثل استحکام حاصل نہ ہوا اور سبائی امور خلافت میں خاصے دخیل ہو گئے۔ جیسا کہ ہم صفحات ماسبق میں عرض کر چکے ہیں۔ ام المؤمنین علیہا السلام کی پیش گوئی "اِنَّ الْاَمْرَ لَا يَسْتَقِيْمُ" کی صحت و صداقت کو تاریخ کا ہر طالب علم معلوم کر سکتا ہے۔ جنگ جمل میں سبائیوں کی قوت ٹوٹنے اور ان مفسدوں کے بہت سے سرغنہ غنڈوں کے فی النار ہونے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ایک حد تک استحکام پیدا ہو گیا اور انہیں اس مار آستین ٹولی سے پورے طور پر نہ سہی تاہم خاصی حد تک نجات حاصل ہو گئی۔ اگر جنگ جمل نہ ہوتی تو خلافت علوی میں اتنا استحکام بھی پیدا نہ ہوتا۔ جنگ جمل کے یہ دو اہم اور تابناک پہلو ہیں جنہیں دیکھنے کے بعد اس میں ہونے والے جانی و مالی نقصانات کا کوئی وزن باقی نہیں رہتا اور اس کے

تاریک پہلو بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ مؤرخین نے اس کے ان روشن پہلوؤں اور عظیم الشان مصلحتوں کی طرف مطلق نظر نہ کی بلکہ صرف اس کے تاریک پہلوؤں پر مرثیہ لکھنے میں اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا۔

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ علامہ ابن کثیرؒ وغیرہم کے زمانہ میں شیعی پروپیگنڈے اور سیاسی حالات کی وجہ سے ایسی فضا تیار ہو گئی تھی کہ اس میں اس حادثہ کے روشن پہلو کی جانب نظر جانا بہت دشوار تھا۔ ان حضرات نے صرف اس کے ایک ہی پہلو پر نظر کی اور وہ بھی ایسی فضا میں جو طبری، ابن اسحٰق، واقدی وغیرہ کے ایسے دشمنان صحابہ اور سبائیت زدہ مؤرخوں کے اڑائے ہوئے غبار سے کثیف ہو رہی تھی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے تبحر علمی کے باوجود مؤرخانہ فطانت و ذوق نہ رکھتے تھے۔ جہاں تک روایات کے استقصار اور انہیں جمع کرنے کا سوال ہے ان حضرات کی وسعتِ نظر اور ان کے وفور علم کا اعتراف نہ کرنا سخت ناانصافی ہے۔ لیکن واقعات کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑنا اخبار و روایات کے منتشر اجزار کو مناسبت کے لحاظ سے مربوط کرنا اور ان سے حقیقت واقعہ تک پہنچنا۔ حوادث و واقعات کے جنگل میں گھس کر اسباب و علل اور نتائج کا کھوج لگانا، ان کے بس کی بات نہ تھی۔ نہ ان کا ذہن ان چیزوں کے لئے تیار تھا۔ یہ حضرات وسیع النظر تھے مگر دقیق النظر نہ تھے۔ ورنہ اگر طبری وغیرہ کی روایتوں کو بھی مؤرخانہ نگاہ سے دیکھتے تو جنگ جمل کا روشن پہلو ان کی نظر سے اوجھل نہ رہتا اور یہ اس حادثہ پر مرثیہ خوانی کے بجائے ؎

"عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد"

کہتے۔ اور اُنہیں کرشمۂ قدرت نظر آتا کہ سبائیوں کی مفسدہ پردازی سے جس قدر ضرر مسلمانوں کو پہنچا اس سے زیادہ ضرر خود اس مفسد گروہ کو پہنچا۔ اور مسلمانوں کے ضرر کی تلافی ان منافع سے ہو گئی جو اس جنگ سے انہیں بحیثیت ملت حاصل ہوئے اور جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔"

اس بحث کے آخر میں، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے متعلق ایک تاریخی غلط بیانی پر تبصرہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ مفید ہوگا (کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے موقف کو کمزور کرنے کے لئے ہی یہ افسانے گھڑے گئے ہیں) جس کا اظہار مودودی صاحب نے اس طرح کیا ہے :-

"جنگ جمل کے آغاز میں حضرت علیؓ نے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو پیغام بھیجا کہ " میں آپ دونوں سے بات کرنا چاہتا ہوں" ———— دونوں حضرات تشریف لے آئے اور حضرت علیؓ نے ان کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد یاد دلا کر جنگ سے باز رہنے کی تلقین کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت زبیرؓ میدانِ جنگ سے ہٹ کر الگ چلے گئے اور حضرت طلحہؓ آگے کی صفوں سے ہٹ کر پیچھے کی صفوں میں جا کھڑے ہوئے۔

(خلافت و ملوکیت ۱۲۹ــ۱۳۰)

لیکن انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ وہ ارشادات نبوی کیا تھے؟ اگر ان کا اظہار کر دیتے تو حقیقتِ حال ظاہر ہو جاتی۔ اور ان دونوں حضرات کی جنگ سے علیحدگی کا قصہ سبائیوں کا طبعزاد افسانہ ہی نظر آتا۔

دراصل طبری وغیرہ مؤرخین نے ایک روایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر حضرت طلحہؓ وزبیرؓ سے بطور پیش گوئی فرمایا تھا کہ تم حضرت علیؓ سے جنگ کروگے اور اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ یہ واقعہ حضرت علیؓ نے ان دونوں حضرات کو یاد دلایا۔ اس پر وہ جنگ سے الگ ہوگئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت کسی سند سے بھی ثابت نہیں۔ بلکہ اس کی ساخت بتا رہی ہے کہ سبائیوں کی وضع کی ہوئی بالکل جعلی روایت ہے۔ ان دونوں حضرات کی جنگ جمل سے علیحدگی اور اس سے بے تعلق ہو جانے کا افسانہ اسی موضوع روایت پر مبنی ہے۔ بنیاد کے منہدم ہونے کے بعد اس غلط افسانہ کا پورا قصہ خود بخود زمین بوس ہو جاتا ہے۔

ذرا بھی فہم سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ قصہ خود اپنے خلاف شہادت دے رہا ہے۔ بالکل فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دونوں حضرات واقعی اس جنگ کو مذموم سمجھنے لگے تھے اور اس میں حصہ لینا کم از کم اپنے لئے جائز نہیں سمجھتے تھے تو یہ مخالف کیمپ میں واپس کیوں گئے؟ خود حضرت علیؓ کے کیمپ میں کیوں نہ آگئے؟ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ بصرہ میں حضرت طلحہؓ کا بہت اثر تھا اور وہاں کے ہزاروں مخلص مسلمان ان ہی کی وجہ سے اس جنگ میں شریک تھے۔ (اور اپنے اسی اثر و رسوخ کی وجہ سے وہ حضرت ام المؤمنینؓ کو یہاں لائے تھے۔ کیونکہ یہاں انہیں پوری کامیابی کی امید تھی) ایسے جلیل القدر صحابی کیا اس تعلیم نبوی سے بے خبر تھے کہ مسلمان کو دوسروں کے لئے بھی وہی بات پسند کرنا چاہیئے جو خود اپنے لئے پسند کرے (خصوصاً جبکہ وہ دوسرے محض اسی کی

وجہ سے شریک جنگ ہو رہے ہوں) پھر کیا وجہ ہے کہ خود تو جنگ سے الگ ہو گئے مگر اپنے معتقدین کو اس سے روکنے کی تلقین نہ فرمائی اور کھڑے کھڑے ان کی نبرد آزمائی دیکھتے رہے؟

حضرت زبیرؓ کے متعلق بھی یہی سوال پیدا ہوتا ہے کیونکہ ان کا بھی خاصا اثر بصرے میں تھا۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ خود ان دونوں حضرات کے ہزاروں معتقدین ان کی غیر جانبداری دیکھنے کے باوجود کیوں کر مصروفِ جنگ رہے۔ ہزاروں میں سے سو دو سو کو چھوڑیئے، دس بیس کی بھی جنگ سے علیحدگی کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ ان قرائن سے روشن ہے کہ یہ پورا قصہ من گھڑت ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ سے ملاقات کرکے مصالحت کے بارے میں گفتگو کی ہو لیکن حضرت علیؓ کا انہیں آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی سنانا اور ان کا جنگ سے کنارہ کش ہو جانا۔ حضرت طلحہؓ کا پچھلی صف میں شامل ہو جانا اور حضرت زبیرؓ کا لشکر سے باہر چلا جانا یہ سب سرتاپا دروغ افسانے ہیں جو سبائیوں یا ان کے ہمدردوں نے اپنے خاص مقاصد کے لئے تصنیف کئے ہیں جن میں صداقت کا شائبہ بھی نہیں۔ عقل و درایت کے معیار پر تو یہ قصہ افسانہ ثابت ہوتا ہی ہے۔ تاریخی روایتیں بھی ایسی ملتی ہیں جو اسے غلط اور موضوع ثابت کر رہی ہیں۔

طبری کی مندرجہ ذیل روایت ملاحظہ ہو:۔

کان القتال یومئذ فی صدر النھار مع طلحۃ والزبیر فانھزم الناس وعائشۃ توقع الصلح ۔

(طبری جلد ۴ ۔ احوال سنہ ۳۶ھ بیان جنگ جمل صفحہ ۲۶۶)

[دن کے اول حصہ میں اس دن حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ سے جنگ ہوتی رہی۔ لوگ پسپا ہوگئے اور حضرت عائشہؓ صلح کی توقع کر رہی تھیں۔]

اس روایت سے ظاہر ہے کہ اختتام جنگ تک حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ مصروفِ جنگ رہے۔ پھر حضرت طلحہؓ پچھلی صف میں کب داخل ہوئے اور حضرت زبیرؓ کب غیر جانبدار ہوئے؟ اگر ایسا ہوتا تو جنگ کا زور ان دونوں حضرات کی طرف کیوں ہوتا۔

دوسری روایت بھی ملاحظہ ہو:۔

عن محمد و طلحۃ قالا لما انهزم الناس فی صدر النهار نادی الزبیرؓ انا الزبیر الیّ ایها الناس۔

(ایضاً صـ۳۰۶)

[محمد اور طلحہ سے روایت ہے کہ جب دن کے اول حصہ میں لوگ پیچھے ہٹے تو حضرت زبیرؓ نے آواز دی کہ میں زبیر ہوں لوگو! میرے پاس آؤ۔]

آخر میں اصح الکتب بعد کتاب اللہ (بخاری) کی مندرجہ ذیل روایت پر بھی نظر کیجئے:۔

عبداللہ ابن الزبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:۔

لما وقف الزبیرؓ یوم الجمل دعانی فقمت الی جنبه فقال یٰبُنَیَّ لا یقتل الیوم الا ظالم او مظلوم وانی لا ارانی الا ساقتل الیوم مظلوما۔

[جب حضرت زبیرؓ یوم الجمل میں کھڑے ہوئے تو مجھے بلایا اور

جب میں ان کے پاس آکھڑا ہوا تو فرمایا۔ اے میرے بیٹے! آج کے دن مقتول ہونے والے ظالم ہیں یا مظلوم۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں آج مظلوم قتل ہوں گا۔]

اسی روایت میں آتا ہے "فقتل" یعنی وہ شہید ہو گئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ میدان جنگ میں ہی شہید ہوئے۔ جنگ سے کنارہ کش اور صفوں سے الگ ہو جانے کا قصہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ انہوں نے میدان جنگ میں کھڑے ہو کر اپنے قتل کی پیشگوئی فرمائی جو بالکل صحیح نکلی اور وہ خود کو مظلوم سمجھ رہے تھے۔ اگر وہ اس جنگ میں شرکت کو اپنی غلطی سمجھتے تو خود کو مظلوم کیوں کہتے۔

(اظہار حقیقت جلد دوم۔ ص ۱۶۰ تا ۱۶۸)

اسی قسم کی روایت لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق بھی جو آپ کے کنویں کے نام پر گھڑی جو قطعی موضوع ہے۔

(ملاحظہ ہو اظہار حقیقت جلد دوم)

دوسری روایت لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ الخ والی جس میں عورت کی سربراہی کی مخالفت کی گئی ہے اسی معاندانہ پروپیگنڈے کا اثر معلوم ہوتی ہے اس پر ہم پیچھے گفتگو کر آئے ہیں۔

غرض یہ کہ بڑے ہی دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رض، حضرت طلحہ رض، حضرت زبیر رض، حضرت سعید ابن العاص رض اور حضرت مروان رض اور ان کے رفقاء کی ان تمام مساعی، جدوجہد اور قربانیوں کی کماحقہ، قدر نہیں کی۔ یہودیوں اور سبائیوں نے میدان جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد زہد و تقشف کا جامہ اوڑھ کر، دستار و عمامہ

اور جبہ وقبہ کا روپ دھار کر اور مسلمانوں کی صفوں میں گھس کر شیعیت اور باطنیت کے راستہ سے اپنے تبلیغی پروپیگنڈے کا راستہ اختیار کیا تو مسلمان بری طرح مات کھا گئے۔ فاطمیوں نے مصر میں الجامعۃ الازہر کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم کر کے جب اپنے مشنریز تیار کر کے اطراف واکناف عالم میں، غوث، قطب، شاہ ولایت اور ابدال کے القاب سے ملقب کر کے پھیلا دیئے اور انہوں نے مسلمانوں کے عقائد و نظریات کو تصوف کے راستہ سے بگاڑنے کی کوشش کی تو مسلمان اس دام ہمرنگ زمین میں گرفتار ہو کر اپنے نظریات کو مسخ ہونے سے نہ بچا سکے۔ ان کی تدبیر ایسی کارگر ہوئی کہ جو مسلمان خود کو اہل سنت کہتے ہیں وہ بھی نوے فیصدی کے حساب سے شیعیت وسبائیت کے عقائد میں گرفتار ہو کر صحیح اسلام ہی سے بیگانہ ہو گئے۔

بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اہل سنت کے بہترین دماغ بھی اس زہر ہلاہل سے محفوظ نہ رہ سکے۔ غوث، قطب، شاہ ولایت اور ابدال دراصل وہ ڈگریاں تھیں جو جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل مشنریز کو فاطمیوں یعنی باطنیوں کی طرف سے عطا ہوتی تھیں اور عالم اسلام کے کونے کونے میں انہیں دعوت وتبلیغ کے لئے بھیجا جاتا تھا۔

فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

بعد میں حضرت سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے مصر سے شیعہ اسماعیلیوں کی سلطنت ختم کی تا کہ صلیبی عیسائیوں کے ساتھ ان کی سازباز کو ختم کریں، تب سے جامعہ ازہر مسلمانوں کا مرکز بنی اور وہاں ائمۂ اربعہ کی اسلامی فقہ پڑھائی جانے لگی۔

(شرعی پردہ)

برصغیر ہند و پاکستان میں شرعی پردہ کے متعلق جو عام طور پر تصور پایا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ عورتوں کو گھروں سے باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔ انہیں کسی اہم ضرورت سے بھی سفر وغیرہ میں گھر سے باہر نکلنا پڑے تو برقعہ اوڑھ کر، منہ چھپا کر، منہ پر نقاب ڈال کر نکلنا چاہیئے تاکہ غیر مردوں کی نگاہ ان کے چہروں پر اور ان کے بدن پر نہ پڑ سکے۔ اس سلسلہ میں ہمارے علمائے کرام سورۂ احزاب کی ان آیات سے استدلال فرماتے ہیں:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝

(۳۳ / ۳۲ — ۳۳)

ترجمہ [اے نبی کی بیویو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم تقویٰ شعاری اختیار کرو تو (نامحرموں سے) نرم و نازک لہجہ میں بات نہ کیا کرو، اس سے ان لوگوں میں جن کے دل میں روگ ہے طمع پیدا ہوتی ہے اور دستور کے مطابق بات کیا کرو۔ اور اپنے گھروں میں رہا کرو اور

پرانی جاہلیت کی طرح بن ٹھن کر نہ گھوما کرو اور صلوٰۃ کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ چاہتا ہے کہ رسول کی گھروالیو! تم سے ہر ناپاکی کو دور کر دے اور تمہیں اچھی طرح پاک اور صاف کر دے۔]

اس آیت کریمہ میں خطاب ازواج مطہرات کو ہے اور بات شروع ہی ان الفاظ کے ساتھ ہوئی ہے کہ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو) جس سے صراحتاً ثابت ہے کہ ان آیات کریمہ میں جو احکام دیئے گئے ہیں وہ عام مسلمان عورتوں کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ ازواج مطہرات کے لئے خصوصی احکام ہیں۔ لیکن اگر عام مسلمان اور ہمارے علمائے کرام اپنے آپ کو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور اپنی ازواج کو ازواج مطہرات کا درجہ دینا چاہتے ہیں تو اس کے متعلق ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ وہ شوق سے ایسا کریں۔ لیکن ہم ان احکام کو عام مسلم خواتین کے لئے شرعی احکام نہیں کہہ سکتے۔

اسی سلسلہ کی ایک دوسری آیت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْــَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا

اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ○ (۳۳/۵۳)

ترجمہ [اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! نبی کے گھروں میں بلا اجازت اندر نہ چلے جایا کرو۔ کھانا کھانے کے لئے کہ کھانے کی تیاری کا انتظار کرتے رہو۔ لیکن جب تمہیں بلایا جایا کرے تو اندر جاؤ اور جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جایا کرو۔ بات چیت میں دل لگا کر جم نہ جایا کرو۔ اس سے نبی کو اذیت ہوتی ہے۔ لیکن وہ کچھ کہتے ہوئے تم سے شرماتا ہے اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ اور جب تم ازواج مطہرات سے کچھ سامان مانگو تو پردہ کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ بات تمہارے قلوب کے لئے اور ازواج مطہرات کے دلوں کے لئے پاکیزہ تر ہے۔ اور تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو ایذاء دو اور نہ اس کے بعد کبھی بھی اس کی ازواج سے نکاح نہ کرو۔ یقیناً یہ بات اللہ کے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔]

اس آیت کریمہ میں بھی ازواج مطہرات کے سلسلہ میں خصوصی ہدایات دی گئی ہیں۔ نبی کے گھروں میں بلا اجازت کھانا کھانے کے لئے نہ جانا۔ کھانا پک کر تیار ہونے کے انتظار میں جم کر نہ بیٹھنا۔ بات چیت کے شوق میں کھانا کھانے کے بعد بھی جمے نہ رہنا۔ اگر کوئی چیز ازواج مطہرات سے مانگنی ہو تو پردہ کے پیچھے سے مانگنا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کا ارادہ بھی نہ کرنا۔ یہ تمام احکام وہ ہیں جن کا تعلق عام مسلمان خواتین سے نہیں ہے۔ بلکہ صرف ازواج مطہرات سے ہے۔ ان آیات میں خاص طور پر یہ حکم کہ اگر ازواج مطہرات سے کچھ مانگنا ہو

تو پردہ کے پیچھے سے مانگا جائے، یہ خصوصیت کے ساتھ ازواج مطہرات کے سلسلہ میں عام مسلمانوں کو ہدایت ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نہایت اچھی ہدایت ہے اور احتیاط کا تقاضہ ہے۔ لیکن اسے عام مسلم خواتین کے سلسلہ میں مستحسن اور مستحب ہی کہا جاسکتا ہے۔ ان کے لئے لازمی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ قرآن کریم نے خصوصیت کے ساتھ ازواج مطہرات ہی کے سلسلہ میں یہ حکم دیا ہے۔ عام خواتین کے لئے نہیں دیا۔

عام مسلمان خواتین کے لئے قرآن کریم نے پردہ کے متعلق جو ہدایات دی ہیں وہ یہ ہیں:-

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَائِهِنَّ اَوْ اٰبَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَائِهِنَّ اَوْ اَبْنَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَائِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَاءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ط وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

(۲۴/۳۱)

ترجمہ [اے پیغمبر اسلام! مؤمن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی

زینت کو ظاہر نہ کریں بجز اس کے جو خود ہی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور اپنے گریبانوں پر اوڑھنیاں ڈالے رکھیں اور اپنی زینت (کے مقامات) کو بجز اپنے شوہروں اور اپنے والدوں، خسروں، بیٹوں، شوہروں کے بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں، گھر کی عورتوں، ہاتھ کے نیچے کے خادموں، گھر میں بوڑھے کام کاج کرنے والے مردوں کے جنہیں عورتوں کی خواہش نہیں رہتی یا بچوں کے جو عورتوں کے مستور اعضاء سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے، کسی (غیر مرد) پر ظاہر نہ کریں، اور اپنے پیروں کو (زمین پر زور سے) نہ ماریں کہ جو زینت و آرائش (یعنی زیورات) کو وہ چھپائے ہوئے ہیں ان کا پتہ لگ جائے۔ اور سب کے سب اے مومنو! اللہ کی طرف رجوع کرو۔ توقع ہے کہ اس طرح تم فلاح پا جاؤ گے۔]

دوسری آیت کریمہ یہ سورۂ احزاب کی ہے :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ○

(۳۳/۵۹)

ترجمہ [اے پیغمبر اسلام! اپنی ازواج، اپنی بیٹیوں اور تمام مسلمانوں کی عورتیں سے کہہ دیجیئے کہ (گھر سے باہر نکلیں تو) اپنی چادروں کو اپنے جسموں پر ڈال لیا کریں۔ تاکہ اس سے کم از کم ان کی پہچان ہو جائے (کہ شریف گھرانوں کی عورتیں جا رہی ہیں) تو ان کو کسی قسم کی اذیت نہ دی جا سکے۔ اور اللہ بہت بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔]

عام مسلمان خواتین کے لئے قرآن کریم نے جو ہدایات دی ہیں ان

کی تفصیل یہ ہے۔

① عورتیں اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں۔ بے حجابانہ باہر نہ نکلیں۔ شرم و حیا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

② اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ کسی بے حیائی (زنا وغیرہ) کی مرتکب نہ ہوں۔

③ اپنی زینت و آرائش کا اظہار نہ کرتی پھریں۔ البتہ وہ اعضاء یا وہ زینت جو ظاہر ہو ہی جاتی ہے وہ مستثنیٰ ہے۔

④ سینہ اور سر پر اوڑھنی لپیٹے رہیں۔ سر اور سینہ ڈھانپے رہنا چاہیئے۔

⑤ پیروں میں عورتیں زیورات پہنتی ہیں تو اپنے پیروں کو زمین پر اس طرح زور سے نہ ماریں کہ ان کے گھونگرو بجیں اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کریں۔

⑥ گھر سے باہر نکلیں تو عام کپڑوں کے اوپر ایک بڑی چادر (جلباب) اوڑھ لیا کریں تا کہ لباس کے رنگ، تراش خراش کی شوخی لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہ کرے اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ کسی شریف گھرانے کی عورت جا رہی ہے اور لوگ اس پر آوازے نہ کسیں۔

حجاب اور پردہ کے سلسلہ میں عام مسلمان خواتین کے لئے یہ موٹی موٹی ہدایات ہیں جن کی پابندی ہر مسلمان خاتون کو کرنی چاہیئے۔

حیا اور شرم وحجاب ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ خواہ وہ

مرد ہو یا عورت۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:۔

الحیاء شعبۃ من الایمان۔

شرم وحیا ایمان ہی کی ایک شاخ ہے۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں خود اتنی شرم وحیا تھی کہ ایک کنواری لڑکی میں بھی اتنی شرم وحیا مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ لیکن عورتوں کے لئے تو شرم وحیا ان کا زیور ہوتا ہے۔ اسلام نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے بھی سب سے پہلے اسی ہدایت کو بیان فرمایا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں. کیونکہ حیا اور شرم کا مظاہرہ سب سے پہلے آدمی کی نگاہوں ہی سے ہوتا ہے. مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی عفت وعصمت کی حفاظت کریں۔ جو عورتیں اپنی نگاہیں برابر نیچی رکھتی ہیں وہ کبھی لغزش کا شکار نہیں ہوتیں۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی حکم ہے کہ سینہ پر اوڑھنی لپیٹے رکھیں۔ عورت کی سب سے بڑی زینت اس کا سینہ ہی ہوتا ہے اسے ڈھانپنا ضروری ہے۔ سینہ کا ابھار مردوں کو اپنی طرف فوراً متوجہ کر لیتا ہے۔ لہٰذا اسے مستور رکھنا بہت ضروری ہے۔ ویسے عام حکم یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کے مقامات کی نمائش کسی وقت بھی نہ کریں۔ البتہ جو مقامات ایسے ہیں کہ ان کو چھپانا مشکل ہوتا ہے۔ اور وہ کام کاج اور لین دین میں ظاہر ہو ہی جاتے ہیں ان کے ظاہر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ علماء کے اس میں کئی قول ہیں کہ اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا (بجز اس زینت کے جو ظاہر ہو ہی جاتی ہے) سے کیا مراد ہے؟

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں ان اقوال کی تفصیل دیدی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :-

"عورتوں کو بھی اپنی عصمت کا بچاؤ چاہیئے۔ بدکاری سے دور رہیں۔ اپنا آپا کسی کو نہ دکھائیں۔ اجنبی غیر مردوں کے سامنے اپنی زینت کی کسی چیز کو ظاہر نہ کریں۔ ہاں جس کا چھپانا ممکن ہی نہ ہو اس کی اور بات ہے جیسے چادر اور اوپر کا کپڑا وغیرہ جن کا پوشیدہ رکھنا عورتوں کے لئے ناممکن ہے۔ یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد چہرہ اور پہنچوں تک ہاتھ اور انگوٹھی ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ یہی زینت کے وہ محل ہیں جن کے ظاہر کرنے سے شریعت نے ممانعت کر دی ہے۔ جیسے حضرت عبداللہ (ابن مسعودؓ) سے روایت ہے کہ وہ اپنی زینت ظاہر نہ کریں یعنی بالیاں، ہار، زیور وغیرہ۔ فرماتے ہیں کہ زینت دو طرح کی ہے ایک تو وہ جسے خاوند ہی دیکھے جیسے انگوٹھی اور کنگن اور دوسری زینت وہ ہے جسے غیر بھی دیکھیں جیسے اوپر کا کپڑا۔ زہریؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جن رشتہ داروں کا ذکر ہے، ان کے سامنے تو دوپٹا، بالیاں کھل جائیں تو حرج نہیں۔ لیکن دوسرے لوگوں کے سامنے صرف انگوٹھیاں ظاہر ہو جائیں تو پکڑ نہیں۔ اور روایت میں انگوٹھیوں کے ساتھ ہی پیر کے خلخال کا بھی ذکر ہے ہو سکتا ہے کہ مَا ظَهَرَ مِنْهَا کی تفسیر ابن عباسؓ وغیرہ

نے منہ اور پہنچوں سے کی ہو۔ جیسے ابو داؤد میں ہے کہ اسماءؓ
بنت ابی بکرؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں
باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں تو آپ نے منہ پھیر لیا اور
فرمایا جب عورت بلوغت کو پہنچ جائے تو سوا اس کے اور
اس کے یعنی چہرے کے اور پہنچوں کے اس کا کوئی عضو
دکھانا ٹھیک نہیں۔ لیکن یہ مرسل ہے۔ خالد ابن دریکؒ
اسے حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں اور ان کی
مائی صاحبہ سے ملاقات کرنا ثابت نہیں واللہ اعلم عورتوں
کو چاہیئے کہ اپنے دوپٹوں سے یا اور کپڑے سے بُکل مار لیں
تاکہ سینہ اور گلے کا زیور چھپا ہوا رہے۔ جاہلیت میں
اس کا رواج بھی نہیں تھا۔ عورتیں اپنے سینوں پہ کچھ
نہیں ڈالتی تھیں۔ بسا اوقات گردن، بال، چوٹی اور
بالیاں وغیرہ صاف نظر آتی تھیں۔ اور آیت میں ہے
"اے نبی! اپنی بیویوں سے، اپنی بیٹیوں سے اور مسلمان
عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی چادریں اپنے اوپر لٹکا لیا
کریں تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور ستائی نہ جائیں۔"
خُمُر خِمَارٌ کی جمع ہے۔ خمار کہتے ہیں ہر اس چیز کو جو
ڈھانپ لے۔ چونکہ دوپٹیا سر کو ڈھانپ لیتی ہے اس
لئے اسے بھی خمار کہتے ہیں۔ پس عورتوں کو چاہیئے کہ
یا تو اپنی اوڑھنی سے یا کسی اور کپڑے سے اپنا گلا اور
سینہ بھی چھپائے رکھیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ

اللہ تعالیٰ ان عورتوں پر رحم فرمائے جنہوں نے شروع شروع میں ہجرت کی تھی کہ جب یہ آیت اتری تو انہوں نے اپنی چادروں کو پھاڑ کر دوپٹے بنا لیے۔ بعض نے اپنے تہمد کے کنارے کاٹ کر ان سے سر ڈھک لیا

۔۔۔۔۔ پس عورت کو ہر ایسی حرکت منع ہے جس سے اس کا کوئی چھپا ہوا سنگھار کھل سکے۔ پس اسے گھر سے عطر اور خوشبو لگا کر باہر نکلنا بھی ممنوع ہے۔ ترمذی میں ہے کہ ہر آنکھ زانیہ ہے۔ عورت جب عطر لگا کر پھول پہن کر مہکتی ہوئی مردوں کی کسی مجلس کے پاس سے گذرے تو وہ ایسی اور ایسی ہے یعنی زانیہ ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کو ایک عورت خوشبو سے مہکتی ہوئی ملی۔ آپ نے اس سے پوچھا، کیا تو مسجد سے آرہی ہے؟ اس نے کہا ہاں! فرمایا کیا تو نے خوشبو لگائی ہے؟ اس نے کہا ہاں آپ نے فرمایا میں نے اپنے حبیب ابوالقاسم صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو عورت اس مسجد میں آنے کے لئے خوشبو لگائے اس کی نماز نامقبول ہے جب تک وہ لوٹ کر جنابت کی طرح غسل نہ کر لے۔ ترمذی میں ہے کہ اپنی زینت کو غیر جگہ ظاہر کرنے والی عورت کی مثال اس اندھیرے جیسی ہے جس میں نور نہ ہو۔"

(تفسیر ابن کثیر ص۵۹-۶۰ پارہ ۱۸ مطبوعہ نور محمد کارخانہ کتب کراچی)

اس اقتباس سے جو امور معلوم ہوئے وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

① حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور زہری کا یہ قول ہے کہ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنۡھَا (بجز اس زینت کے جو ظاہر ہی ہو جاتی ہے) سے مراد اوپر کی چادر، برقعہ، انگلیوں کی انگوٹھیاں وغیرہ ہیں۔ یعنی ان حضرات کے نزدیک عورتوں کو اپنا چہرہ اور ہاتھ بھی چھپانے چاہئیں۔ لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر بعض صحابہ کا خیال ہے کہ عورتوں کیلئے ہاتھ اور چہرے اور پاؤں کو چھپانا ضروری نہیں ہے۔ وہ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنۡھَا (بجز اس زینت کے جو ظاہر ہو جاتی ہے) میں داخل ہے۔

② عورتوں کو سر اور سینہ پر دوپٹہ ڈال لینا چاہیئے تاکہ سر، گلے اور سینہ کی زینت غیر مردوں پر ظاہر نہ ہو سکے۔

③ گھر سے باہر عورتیں نکلیں تو کپڑوں کے اوپر ایک چادر (جلباب یعنی بڑی چادر) ضرور اوڑھ لیں۔ تاکہ کپڑے اور زیورات اور اسباب زینت بالکل مستور ہو جائیں اور کوئی غیر مرد انہیں نہ دیکھ سکے۔

④ عورتوں کو عطر، پھلیل، پوڈر، سرخی وغیرہ لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہیئے جس کی لپٹ سے مردوں کی توجہ ان کی طرف منعطف ہو جائے۔ وہ باہر نکلیں تو سادہ طریقہ پر نکلیں۔

⑤ ایسے باریک کپڑے عورتوں کو نہیں پہننے چاہئیں جس سے ان کا بدن جھلکتا ہو۔ اور بدن کے اعضاء نظر آتے ہوں۔ ایسا

لباس جو بدن کے لئے ساتر ہی نہ ہو اسے لباس کہنا ہی غلط ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی لباس کے متعلق فرمایا ہے:

سیکون فی اٰخر امتی کاسیات عاریات علیٰ رؤسھن کاسنمۃ البخت العنوھن فانھن ملعونات۔

(تنویر الحوالک للسیوطی ص ۱۰۳ ج ۳)

ترجمہ [میری امت کے آخر میں ایسی عورتیں ہوں گی جو کپڑے پہنے ہوئے بھی ننگی ہوں گی ان کے سروں پر (بالوں کے جوڑے اس طرح) بندھے ہوئے ہوں گے جیسے بختی اونٹوں کے کوہان۔ ایسی عورتوں پر لعنت بھیجو، کیونکہ وہ ملعون ہیں۔]

اس سلسلہ میں اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا (بجز اس زینت کے جو ظاہر ہو جاتی ہو) کی دو تفسیریں حافظ ابن کثیرؒ اور دیگر مفسرین نے نقل کی ہیں۔

(۱) اس سے مراد اوپر کے کپڑے یعنی چادر (جلباب) یا برقعہ ہے۔ کہ وہ تو ظاہر ہوتے ہی ہیں۔

(۲) اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ پاؤں ہیں۔ اس سلسلہ میں مفسرین اور اکثر فقہاء نے دوسری تفسیر ہی کو ترجیح دی ہے۔ اس موضوع پر علامہ محمد ناصر الدین البانی نے (جو عرب دنیا کے اس وقت ممتاز ترین محدث ہیں) جو بحث فرمائی ہے اس سے مسئلہ کی صورت سمجھنے میں آسانی ہوگی، موصوف فرماتے ہیں:

"اس آیت کی تفسیر میں سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں۔

کچھ حضرات اس کے قائل ہیں کہ اس سے مراد (اوپر کے) ظاہری کپڑے ہیں۔ اور کچھ حضرات اس کے قائل ہیں کہ اس سے مراد، سرمہ، انگوٹھی، کنگن اور چہرہ وغیرہ ہیں۔ ان اقوال کو ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں (ص ۸۴ ج ۱۸) بعض صحابہ اور تابعین سے نقل کیا ہے۔ پھر ابن جریرؒ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ اس استثناء سے مراد چہرہ اور دونوں ہاتھ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ اس بارے میں صحت سے قریب تر انہی حضرات کا قول ہے جنہوں نے اس سے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو مراد لیا ہے، جس میں سرمہ، انگوٹھی کنگن اور خضاب سب داخل ہیں۔ اور ہم نے اسے صحیح تر قول پوری امت کے اس اجماع کی وجہ سے قرار دیا ہے کہ ہر صلوٰۃ پڑھنے والے پر اپنے ستر کو چھپانا ضروری ہے۔ ستر کو چھپائے بغیر صلوٰۃ صحیح نہیں ہوتی۔ اور عورت کے لئے جائز ہی نہیں، ضروری ہے کہ وہ اپنی صلوٰۃ میں اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو کھلا رکھے اور اس پر واجب ہے کہ ان کے علاوہ باقی بدن کو چھپائے۔ لیکن نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے عورتوں کے لئے اپنے ہاتھوں کو بقدرِ نصف (یعنی کہنیوں تک) کھلا رکھنے کو مباح قرار دیا ہے۔ تو جب یہ بات تمام علماء کے اجماع سے ثابت ہے تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ عورت کے لئے یہ جائز ہے کہ جو حصہ اس کے جسم کا ستر نہیں ہے وہ اسے کھول سکتی ہے۔ جیسا کہ مردوں کے لئے اپنے ستر ہی کو چھپانا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ جو حصہ ستر نہیں ہے تو اس کا اظہار (کھلا رکھنا) بھی حرام نہیں ہو سکتا۔ اور جب چہرے، ہاتھوں اور

پیروں کا اظہار عورتوں کے لئے جائز ہے تو اس سے معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے اپنے قول اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (بجز اس زینت کے جو ظاہر ہو ہی جائے) سے اس کا استثناء فرمایا ہے۔ کیونکہ عورتوں کے یہ تمام حصے (کام دھام میں) ظاہر ہو ہی جاتے ہیں "

(حجاب المرأۃ المسلمہ فی الکتاب والسنۃ ص۱۷-۱۹ مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت طبع ثالث ۱۳۸۹ھ)

نیز حق تعالیٰ نے جہاں عورتوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں۔ اس سے پہلے مردوں کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے چنانچہ سورۂ نور ہی میں عورتوں کو یہ حکم دینے سے پہلے فرمایا گیا ہے

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ○ (۲۴/۳۰)

ترجمہ [اے پیغمبر اسلام! پیروانِ دعوت ایمانی سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ امر ان کے لئے پاکیزہ تر ہے۔ یقیناً جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے۔]

نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم مردوں کو اسی لئے تو دیا گیا ہے کہ غیر محرم عورتوں پر ان کی نگاہ نہ پڑے۔ اگر عورتیں مستقلاً سارے بدن کو چھپا کر نکلیں کہ نہ ان کا چہرہ کھلا ہو، نہ ہاتھ پاؤں، وہ ہر طرح ڈھکی چھپی ہوں تو مردوں کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دینے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ وہ اپنی نگاہیں اوپر بھی رکھیں

توکیا چیز انہیں نظر آسکتی ہے۔ اس حکم سے بھی اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کو اپنا چہرہ اور ہاتھ پاؤں کھلا رکھنے کی اجازت ہے اس لئے مرد اپنی نگاہیں نیچی رکھیں تاکہ ان سے کوئی لغزش سرزد نہ ہو جائے۔

چنانچہ علامہ محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں :۔

ابن عطیہؒ نے کہا ہے کہ آیت کے الفاظ کے حکم میں مجھے یہ بات نظر آتی ہے کہ عورت اس بات کی مامور ہے کہ وہ اپنی زینت کی تمام چیزوں کو چھپائے۔ اور ضروریات یومیہ اور اصلاح احوال کے لئے حرکت کی ضرورت کے ماتحت جو زینت ظاہر ہو ہی جاتی ہے اس کا آیت میں استثناء کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا جو زینت اس طور پر ظاہر ہو جائے جو عورتوں میں ضرورت کے ماتحت ہو اس کا اظہار معاف ہے۔"

قرطبی نے کہا ہے :۔

"میں کہتا ہوں کہ یہ قول بہتر ہے۔ لیکن چونکہ اکثر حالات میں چہرہ اور ہاتھ عادۃً اور عبادۃً کھل ہی جاتے ہیں۔ یہ صلوٰۃ ادا کرنے اور حج کے مناسک ادا کرنے میں ہوتا ہے تو یہ بات درست ہے کہ یہ استثناء چہرے اور ہاتھوں ہی کی طرف راجع ہو۔ اس پر وہ روایت بھی روشنی ڈالتی ہے جسے ابوداؤد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں جو باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے

منہ پھیر لیا اور ان سے فرمایا۔ اے اسماء! جب عورت اس عمر میں داخل ہو جائے کہ اسے ماہواری ایام ہونے لگیں تو اس کے لئے درست نہیں کہ سوائے اتنے حصے کے باقی جسم لوگوں کو نظر آسکے اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ تو یہ احتیاط کے پہلو سے زیادہ بہتر اور لوگوں کے فساد کی رعایت کے مناسب ہے تو عورت کو چاہیئے کہ وہ اپنی زینت کو سوائے اس کے جو اس کے چہرے اور دونوں ہاتھوں سے ظاہر ہو جائے بقیہ حصہ کو ظاہر نہ کرے ۔"

ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں کہ :۔

"یہ بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عورتوں کا عمل اسی پر رہا ہے کہ وہ اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کھلا رکھتی تھیں۔ حضورؐ کے دربار میں اسی طرح حاضر ہوتی تھیں اور آپ ان پر کوئی نکیر نہیں فرماتے تھے۔ اس سلسلہ میں بہت سی احادیث ہیں جن میں سے ہم چند کا ذکر کرتے ہیں کہ حضرت جابر ابن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلوٰۃ عید میں عید کے دن حاضر تھا۔ تو آپ نے خطبہ سے پہلے نماز پڑھائی جس میں نہ اذان تھی نہ اقامت۔ پھر بلالؓ کے سہارے ٹیک لگا کر آپ کھڑے ہوئے اور تقویٰ الٰہی کا حکم فرمایا اور لوگوں کو اللہ کی فرمانبرداری کی ترغیب دی اور لوگوں کو وعظ اور نصیحت فرمائی۔ پھر آپ گئے اور عورتوں کے پاس پہنچ کر انہیں نصیحت فرمائی، خدا کو یاد دلایا

اور فرمایا۔ صدقہ کرو، کیونکہ تم میں سے اکثر جہنم کی ایندھن ہیں تو ایک عورت نے جو عورتوں کے درمیان بیٹھی تھی اس کے رخساروں کا رنگ بدلا ہوا اور سیاہ پڑ گیا تھا۔ بولی۔ اے اللہ کے رسول! یہ کیوں؟ آپ نے فرمایا۔ کیونکہ تم کثرت سے شکایتیں کرتی ہو اور شوہروں کی ناشکری کرتی ہو۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ وہ اپنے زیورات کا صدقہ کرنے لگیں اور بلالؓ کے کپڑے میں اپنی بالیاں اور اپنی انگوٹھیاں ڈالنی شروع کر دیں۔

(مسلم، نسائیؒ، دارمی، بیہقی، احمد بن حنبل)

اس حدیث میں حضرت جابرؓ بتا رہے ہیں کہ جو عورت درمیان میں بیٹھی ہوئی تھی اس کے رخساروں کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور سیاہ ہو گیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ منہ کھولے ہوئے بیٹھی تھی کہ حضرت جابرؓ نے اس کے رخساروں کے رنگ متعلق یہ تبدیلی نوٹ کر لی اور پھر اس کو بیان بھی کر دیا۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ قبیلۂ خثعم کی ایک خاتون حجۃ الوداع میں قربانی کے دن (۱۰ ذی الحجہ کو) آپ سے کوئی مسئلہ پوچھنے آئی اور فضل ابن عباسؓ حضورؐ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور فضلؓ خاصے خوبصورت جوان تھے۔ (اسی حدیث میں ہے کہ) فضل ابن عباس اس خثعمی عورت کی طرف دیکھنے لگے اور وہ عورت بھی خاصی حسین تھی (اور ایک روایت میں ہے کہ وہ بہت خوبصورت تھی) اور وہ بھی فضلؓ کو دیکھنے لگی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فضلؓ کی ٹھوڑی کو پکڑ کر دوسری طرف موڑ دیا۔

اور اسی قصہ کو حضرت علیؓ ابن ابی طالب نے بھی بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ مسئلہ پوچھنے کے لئے قربان گاہ کے قریب حاضر ہوئی تھی جبکہ حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جمرہ کی رمی فرما چکے تھے۔ انہوں نے اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے حضرت عباسؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول آپ نے اپنے چچا کے بیٹے کی گردن کیوں موڑ دی؟ تو آپ نے فرمایا کہ میں نے ایک نوجوان مرد اور عورت کو دیکھا تو مجھے ان دونوں کے متعلق شیطان سے اندیشہ ہوا۔

(بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائیؒ، ابن ماجہ، مالک، بیہقی)

امام احمد کی ایک روایت میں خود فضل ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ:۔

حضورؐ نے میری طرف دیکھا اور میرا چہرہ اس کے چہرہ کی طرف سے دوسری طرف موڑ دیا۔ میں نے پھر اس کی طرف منہ موڑ لیا تو حضورؐ نے میرا چہرہ پھر اس کی طرف سے موڑ دیا۔ حتیٰ کہ آپؐ نے تین مرتبہ ایسا ہی کیا اور میں باز نہیں آرہا تھا۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں لیکن حدیث منقطع ہے۔ اس واقعہ میں بھی ظاہر ہے کہ اس خثعمی عورت رضی اللہ عنہا کا چہرہ کھلا ہوا تھا جسے حضرت فضل ابن عباسؓ بار بار دیکھتے تھے۔

حضرت سہل ابن سعدؓ سے مروی ہے کہ ایک عورت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول میں اپنا نفس آپ کو ہبہ کرنے کے لئے آئی ہوں۔

تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف دیکھا اور نظر اُٹھا کر دیر تک اسے دیکھتے رہے۔ پھر اپنا سر جھکا لیا۔ جب عورت نے یہ دیکھا کہ اس کے بارے حضورؐ نے کوئی ارادہ نہیں کیا تو وہ بیٹھ گئی۔ (بخاری، مسلم، نسائی، بیہقی)

(حجاب المرأۃ المسلمہ ص۲۶-۲۹)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مؤمن عورتیں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز فجر ادا کرنے کے لئے اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی حاضر ہوا کرتی تھیں۔ پھر اپنے گھروں کو لوٹتی تھیں جب صلوٰۃ فجر ادا کر لیتی تھیں اور کافی اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ پہچانی نہیں جا سکتی تھیں۔

(بخاری، مسلم، ابوداؤد)

مسند ابویعلیٰ میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ ہم میں سے بعض دوسری بعض عورتوں کے چہروں کو اندھیرے کی وجہ سے پہچان نہیں پاتی تھیں (ص ۲۱۴/۲) اس کی روایت صحیح سند سے ہوئی ہے۔

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عورتیں اپنے چہروں کو کھول کر خود بارگاہ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا کرتی تھیں اور آپ نے کبھی ان پر ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی آیت کریمہ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (بجز اس زینت کے جو ظاہر ہو ہی جاتی ہے) چہرے اور ہاتھوں کا استثناء مراد ہے۔

اور اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کا قول ہی صحیح ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور زہریؒ سے جو کچھ منقول ہے وہ احتیاط پر مبنی ہے، حکم الٰہی نہیں ہے۔

جلباب اور خمار قرآن کریم نے ایک جگہ سورۂ نور میں اوڑھنی اوڑھنے اور سینہ پر پیٹنے کو ضروری قرار دیا ہے۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ ۔ (۲۴/۳۱)

اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈال لیں۔

اور دوسری جگہ جلباب یعنی بڑی چادر اوڑھنے کو ضروری قرار دیا ہے۔

يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ۔ (۳۳/۵۹)

اپنی چادروں کو اپنے اوپر اوڑھ لیں۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ:۔

اس سے معلوم ہوا کہ جلباب گھر سے باہر نکلتے وقت مطلوب ہے۔ یعنی عورت کو بغیر جلباب (بڑی چادر کے جو سب کپڑوں کو چھپا لیتی ہے۔ اور میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ خمار یعنی اوڑھنی گھروں کے اندر اوڑھنی ضروری ہے اور چادریں گھر سے باہر نکلتے وقت۔ پردہ کے بارے میں ان دونوں آیتوں کی شرح میں نے یہی کی ہے۔ (فیض الباری ص ۳۸۸/ج ۱) اور اس سے پہلے علامہ انور شاہ کشمیری نے (ص ۲۵۶/ج ۱) پر بھی جلباب اور خمار کی یہی تشریح

فرمائی ہے۔

ہم کئی مرتبہ تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ عورت کا فریضہ اکتساب رزق نہیں ہے۔ اکتساب رزق کے لئے عملی جدوجہد کرنا مردوں کا فریضہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی قرآن کریم سے بتا چکے ہیں کہ اکتساب رزق کے لئے عملی جدوجہد عورتوں کے لئے ممنوع بھی نہیں ہے۔ چنانچہ عہدِ رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم میں اور اس کے بعد بھی عورتیں اکتساب رزق کی جدوجہد میں حصہ لیتی رہی ہیں۔ جیساکہ خود قرآن کریم نے اس کی اجازت دی ہے۔

چنانچہ سورۃ نساء میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے،

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَاسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ○

(۴/۳۲)

ترجمہ [تم میں سے بعض کو بعض پر جو اللہ نے فضیلت و برتری (قوت و صلاحیت کے اعتبار سے) دے رکھی ہے اس کی تمنائیں نہ کرو (کہ فلاں صلاحیت اور فلاں قوت مجھے کیوں نہ مل گئی) البتہ مردوں کے لئے اس میں حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لئے اس میں حصہ ہے جو وہ کمائیں۔ اور اللہ سے اس کا فضل (رزق کی فراوانی) طلب کرتے رہو۔ یقیناً اللہ ہر چیز کو خوب خوب جانتا ہے۔]

اکتساب کے معنے، صرف اکتساب رزق ہی کے نہیں ہیں بلکہ ہر اس عملی جدوجہد کے ہیں جو کچھ حاصل کرنے کے لئے کی جائے۔

گذشتہ اوراق میں ہم تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ عورت ہر میدان میں عملی حصہ لے سکتی ہے۔ ایسا کوئی میدان نہیں ہے جس میں مرد عملی حصہ لے سکتے ہوں اور عورت کے لئے اس میں عملی حصہ لینا ممنوع ہو۔ شہادت، تعلیم و تربیت، عبادات، اجتماعی و انفرادی عبادت، عملی جدوجہد، عسکری جدوجہد، سربراہی خانہ، مشاورت، تنقید و احتساب، ذمہ دارانہ مناصب سنبھالنا، قاضی اور جج بننا، امامت صغریٰ، سیاسی جدوجہد، سربراہی مملکت وغیرہ مستقل عنوانات کے ماتحت ہم گذشتہ اوراق میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ ان ذمہ داریوں کے سلسلہ میں عورتوں پر قرآن کریم نے پورا پورا اعتماد فرمایا ہے اور ہمارے اسلاف میں سے ان تمام مناصب پر فائز ہونے کو کچھ حضرات نے اس کے جواز پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام جدوجہد اور عملی سرگرمیاں منہ اور ہاتھ چھپا کر بالکل گھروں کی چار دیواروں میں بند رہ کر انجام دی جا سکتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسا سمجھنا صرف اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہی ہوگا۔ ان تمام سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت بھی دینا اور پھر ان پر مروجہ پردہ کی سخت ترین پابندیاں بھی عائد کرنا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسا کہ اسکولوں میں بچوں اور بچیوں کو ٹاٹ کی بوریوں میں کمر سے نیچے پیروں تک باندھ دیا جائے اور پھر ان سے کہا جائے کہ یہ اتنا بڑا میدان پڑا ہے۔ تم اس میں دوڑ سکتی ہو۔ اور انہیں واقعی دوڑایا جائے۔ وہ بھاگنے

کی سعی و کوشش کریں اور ہر دو قدم پر گر گر پڑیں ۔ اسکولوں میں ہم نے یہ کھیل بہت دیکھا ہے۔ اس طرح بندھ کر دوڑنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ یہی حال ہماری عورتوں کا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر میدان میں عملی جدوجہد میں حصّہ لے سکتی ہیں۔ لیکن دوسری طرف ان کو پابندیوں میں جکڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ ان کے ساتھ مذاق تو نہیں کیا جا رہا۔

بہرحال شرعی پردہ وہ نہیں ہے جو ہمارے ہاں دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی رائج کر لیا گیا ہے۔ شرعی پردہ وہی ہے جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہے۔

علامہ ابن رشد قرطبی فرماتے ہیں کہ:۔

"عورت میں ستر کی حد تو اکثر علماء کا یہی خیال ہے کہ چہرے اور دونوں ہاتھوں کے علاوہ عورت کا تمام بدن ستر (چھپانے کی چیز) ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا خیال ہے کہ اس کے قدم یعنی پاؤں بھی ستر نہیں ہیں۔ ابو بکر ابن عبدالرحمٰن اور امام احمد ابن حنبلؒ کی رائے میں عورت سب کی سب ستر ہے۔"

(بدایۃ المجتہد ص۱۱۵ ج۱ مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہٗ بمصر)

علامہ محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں کہ:۔

لہٰذا ثابت ہو گیا کہ چہرہ کو چھپانا ضروری نہیں ہے۔ یہی اکثر علماء کا مذہب ہے جیسا کہ ابن رشد نے بدایہ (ص۸۹) میں کہا ہے۔ ان میں امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ، امام شافعیؒ شامل ہیں، اور

امام احمدؒ سے بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے (المجموع صـــ ۱۶۹ ج ۳) امام طحاوی نے بھی شرح معانی الآثار صـــ ۹ ج ۲ میں امام ابو حنیفہؒ کے دونوں شاگردوں (صاحبین۔ امام محمدؒ و امام ابو یوسفؒ) اور شافعیہ کی کتابوں میں سے "المہمات" میں اسے جزم کے ساتھ نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہی صحیح ہے۔ اسے شیخ شربینیؒ نے "اقناع" (صـــ ۱۱ ج ۲) میں بیان کیا ہے۔

(حجاب المرأة المسلمة فی الکتاب والسنة صـــ ۴۱-۴۲)

ہم بھی ان فقہائے کرام کے قول کو ترجیح دیتے ہیں جو چہرہ ہاتھوں پیروں کے ستر ہونے کے قائل نہیں۔

واللہ اعلم

(والدین کا حق)

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت، حسن سلوک تعظیم و تکریم کا حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعتوں میں یکساں طور پر ضروری قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ تینوں شریعتوں میں ماں باپ کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے زیادہ بلند اور اہم قرار دیا گیا ہے

توراۃ میں ہے:۔

"تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تاکہ تیری عمر اس زمین پر

جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے، دراز ہو۔ (خروج ۲۰-۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے:-

تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے۔

(احبار ۱۹-۳)

حد یہ ہے کہ قانوناً یہ حکم نافذ کیا تھا کہ:-

جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعن کرے مار ڈالا جائے گا۔ اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے۔ اس کا خون اسی پر ہے۔

(احبار ۲۰-۹)

اور

وہ جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے۔

(خروج ۲۱-۷)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی تعمیل نہ کی جائے بلکہ ان کے روح اور معنی کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوا

کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں باپ پر لعنت کرے جان سے مارا جائے۔ پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب تھا سو خدا کی نذر ہوا اور اپنے باپ یا ماں کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کر دیا۔

(متی ۱۵-۴)

اس کے علاوہ (متی ۱۹-۱۹، مرقس ۷-۱۰ اور ۱۰-۱۹

لوقا ۱۸-۲۰) میں توراۃ کے الفاظ کو بعینہٖ دہرایا گیا۔

قرآن کریم نے بھی تورات و انجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت، اور ان کا احترام کرتے رہنے کی تاکید فرمائی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی ہے اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا ہے۔

ماں قرآن کریم نے بتایا کہ والدین میں سے باپ کے مقابلہ میں ماں کا درجہ بلند تر ہے۔ وہ نو مہینے تک بچہ کو پیٹ میں رکھتی ہے اور اپنے خون سے اسکی پرورش کرتی ہے۔ وضع حمل کی تکلیف جو شدید ترین تکلیف ہوتی ہے برداشت کرتی ہے۔ پھر دو سال تک اپنا خون جگر پلا پلا کر اسے پروان چڑھاتی ہے۔ وہ بیمار ہو جاتا ہے تو راتوں کو جاگ جاگ کر اس کی تیمارداری کرتی ہے۔ چھ سات سال تک اس کا بول و براز اپنے اوپر لیتی ہے اور ہر طرح سے اسے آرام و راحت پہنچا کر اس کی پرورش کرتی ہے اس کی گود بچہ کی اولین درسگاہ ہوتی ہے۔ وہ اس کی بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت کرتی ہے۔ ان تمام قربانیوں کا یہی صلہ ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ دلدہی اور غمخواری کی جائے۔

سورۂ لقمان میں ہے۔

وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیْكَؕ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ۝ (۳۱/۱۴)

ترجمہ [اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ (نیک سلوک

کی) وصیت فرمائی ہے۔ اس کی ماں نے شدید ضعف پر ضعف کے باوجود اسے (پیٹ میں) اٹھائے رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا۔ کہ میرا اور اپنے والدین کا شکر بجالاؤ۔ اور میری طرف ہی لوٹنا ہے۔]

ماں حمل کے زمانہ میں جو کچھ غذا کھاتی ہے اور اس سے جو کچھ خون اور کیلشیم وغیرہ ضروری اجزاء اسے حاصل ہوتے ہیں وہ بجائے ماں کے جسم کو تقویت پہنچانے کے جنین کی پرورش کرنے لگتے ہیں۔ اور سب اس طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ ماں کے جسم کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ جس کی وجہ سے وہ دن بدن کمزور و ناتواں ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ اس عرصہ میں اس کے تغذیہ کا سارا عمل اس کے جسم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ وہ سب کا سب بچہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبان بتاتے ہیں کہ جنین اپنی غذا حاصل کرنے کے سلسلہ میں انتہائی بے رحم ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ماں کتنی کمزور ہے۔ وہ اپنی پوری غذا حاصل کر لیتا ہے۔ ماں کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جائے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔

یہی بات قرآن کریم نے سورۂ احقاف میں بیان فرمائی ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ

(۴۶/۱۵)

ترجمہ[اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی

وصیت کی ہے۔ اس کی ماں اسے شدید تکلیف کے ساتھ (پیٹ میں) اٹھائے رہی اور سخت تکلیف کے ساتھ وضع حمل کیا۔ اس کا پیٹ میں اٹھائے رکھنا اور دودھ چھڑانا پورے تیس مہینے تک جاری رہا۔]

ان آیات میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس پر اس کی ماں کے بھی احسانات ہیں اور باپ کے بھی احسانات ہیں۔ لیکن باپ کے احسانات کا قرآن کریم نے کوئی تذکرہ نہیں فرمایا بلکہ خصوصیت کے ساتھ ماں ہی کے احسانات کو جتلانا ضروری سمجھا ہے جس سے ماں کے حق کا مقدم ہونا معلوم ہوگیا۔ اسی لئے جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے کسی صحابیؓ نے سوال کیا کہ سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا کون مستحق ہے۔ آپ نے فرمایا "تمہاری ماں" اس نے پوچھا کہ "اس کے بعد" تو آپ نے فرمایا کہ "تمہاری ماں" اس نے پھر سوال کیا کہ "اس کے بعد" آپ نے فرمایا کہ "تمہاری ماں" اس نے پھر پوچھا کہ "اس کے بعد" تو آپ نے فرمایا کہ "تمہارا باپ"

(صحیح بخاری، کتاب الادب جلد دوم)

اس سے بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ ماں کا حق باپ کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ مجھ سے ایک بہت بڑا گناہ ہوگیا ہے۔ کیا میرے لئے توبہ ہو سکتی ہے؟ آپ نے پوچھا کہ "تیری ماں زندہ ہے؟" اس نے نفی میں جواب دیا۔ تو آپ نے دریافت فرمایا کہ "تیری خالہ زندہ ہے؟" اس نے کہا۔

"ہاں" آپ نے فرمایا کہ "جا اور اپنی خالہ کے ساتھ نیک سلوک کر"
(جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ)

ایک اور صحابی نے آپ سے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ "تمہاری ماں زندہ ہے؟" اس نے کہا "ہاں" آپ نے فرمایا کہ "جاؤ اور ماں کی خدمت کرو۔ یہی تمہارا جہاد ہے" اور ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے"
(ترغیب و ترہیب منذری بحوالہ ابن ماجہ، نسائی و حاکم)

ان تعلیمات سے ثابت ہوا کہ جنس لطیف (عورت) ہی کی ایک شخصیت (یعنی ماں) کو سب سے بڑی برتری اور فوقیت حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کا مرہون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادّی علت ہیں وہ خالق اکبر کی علت فاعلی کے بعد ماں اور باپ ہی ہیں۔ لیکن باپ کی مادّی علت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں ہے مگر ماں وہ ہستی ہے جو اپنے خون جگر سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ نو مہینے تک ہزار سختیاں جھیل جھیل کر اسے اپنے پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہے اور وضع حمل کی ناقابل برداشت تکلیف اٹھا کر اسے جنم دیتی ہے اور پھر ہنسی خوشی اس مضغۂ گوشت کو چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کرکے اسے پلاتی اور پرورش کرتی ہے۔ پھر انتہائی غور و پرداخت کے ساتھ اپنی ہر راحت، ہر آرام ہر آسائش ترک کرکے، اپنی ہر خوشی اس پر قربان کرکے اسے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔ ان احسانات کو دیکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ

ماں سے زیادہ اس دنیا میں انسان پر (خدا کے بعد) کسی اور کا اتنا احسان نہیں ہے۔

باپ ماں کے بعد دوسرا درجہ باپ کا ہے۔ کیونکہ وہ بھی بچہ کی تولید و تکوین میں ماں کے ساتھ شریک ہے۔ بچہ کی نشوونما اور تربیت میں باپ ہی کی جسمانی اور مالی کوششیں شامل ہیں۔ اس لئے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے پروان چڑھ کر جوانی کی حدود میں قدم رکھتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ ان دونوں کی کوششوں سے حاصل کردہ قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت اور نیک سلوک کی صورت میں ادا کرے۔ ان کی عزت و تکریم کرے۔ ان کا ادب اور احترام کرے۔ تورات و انجیل کی طرح قرآن کریم نے بھی ان دونوں کی عزت و تکریم کا حکم دیا۔ ان کی خدمت۔ ان کی امداد۔ ان کی غمخواری اور دلدہی کو فرض کیا بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کے ساتھ نہ سختی سے پیش آؤ نہ گستاخی کرو۔ اگر وہ کبھی کوئی زیادتی بھی کریں تو تم ان کے سامنے اُف تک نہ کرو۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ (۱۷/۲۳)

ترجمہ [اے پیغمبر اسلام! تیرے رب کا یہ فیصلہ ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اگر

تمہارے پاس ان میں سے ایک یا دونوں کے دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کے سامنے اُف نہ کرو اور نہ انہیں جھڑکو بلکہ ان سے شریفانہ طور پر گفتگو کرو۔]

ان کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے۔ ان کی خوشنودی سے اللہ کی خوشنودی ہے۔ قرآن کریم میں والدین کے ساتھ حسن سلوک اور خدمت کی تاکید بارہ مختلف آیات میں وارد ہوئی ہے۔ اور اکثر موقعوں پر یہ تعلیم توحید اور حق تعالیٰ کی عبادت کے حکم کے بعد ہی آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی تخلیق کی علت فاعلی حق تعالیٰ کی ذات ہے اور دوسری علت مادّی والدین ہی ہیں۔

سورۂ بقرۃ میں تورات کے حکم کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (۲/۸۳)

ترجمہ [اور یاد کرو جب ہم نے اولادِ اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہیں کروگے اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کروگے۔]

اس آیت کریمہ میں اگرچہ تورات کے حکم ہی کا اعادہ کیا گیا ہے لیکن اس میں تورات کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور ان سے ڈرنے کے محدود الفاظ استعمال نہیں فرمائے گئے بلکہ نیک سلوک کرنے کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے جس میں بڑی وسعت ہے۔ اور ہر قسم کی خدمت، اطاعت اور عزت کا مفہوم اس میں داخل ہے اسی

سورت میں ذرا آگے چل کر والدین کی مالی خدمت اور امداد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ۔

(۲/۲۱۵)

ترجمہ [اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ تم (کار خیر میں) خرچ کرو تو ماں باپ اور رشتہ داروں کا حق ہے۔]

سورۂ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔

(۴/۳۶)

ترجمہ [اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔]

کفار و مشرکین نے اپنے وہم و خیال اور رسم و رواج کے مطابق حلال و حرام کے بہت سے مسائل گھڑ رکھے تھے اُنہیں خطاب کر کے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جو کچھ تم نے از خود بنا لیا ہے وہ کوئی بات حرام نہیں۔ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ اصل میں کون کونسی باتیں حرام ہیں:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ

حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط (۶/۱۵۱)

ترجمہ [اے پیغمبر کہہ دیجیے کہ آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں جو اللہ نے تم پر حرام کیا ہے۔ یہ ہے کہ (۱) تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور (۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو (بد سلوکی نہ کرو)، (۳) اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے قتل نہ کرو، رزق تو ہم ہی تمہیں بھی دیتے ہیں اور انہیں بھی اور (۴) بے حیائیوں کے پاس نہ پھٹکو، وہ ظاہر ہوں یا چھپی ہوئی ہوں، اور (۵) جس نفس کو اللہ نے قتل کرنا حرام کیا ہے، اسے قتل نہ کرو بجز اس کے اس کے قتل کی اس نے اجازت دی ہو (یہ پانچ چیزیں حرام ہیں)۔]

معراج کے احکام دوازدہ گانہ میں اللہ کی توحید کے بعد دوسرا حکم والدین کے ساتھ حسن سلوک ہی کا ہے جو نہایت ہی اہتمام کے ساتھ دیا گیا ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ط اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ○ (۱۷/۲۳-۲۴)

ترجمہ [اے پیغمبر! آپ کے پروردگار کا یہ فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ

جائیں تو انہیں اُف نہ کہو، نہ اُنہیں جھڑکو۔ دونوں سے بہت نرمی سے (شریفانہ) بات کرو۔ اور ان کے سامنے رحمت کی وجہ سے اطاعت کا بازو ہمیشہ جھکا رکھو اور دعائیں مانگو کہ اے میرے پروردگار ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے چھوٹے سے کو شفقت و محبت کے ساتھ پالا تھا۔]

بارگاہِ الٰہی میں سب سے بڑا جرم شرک ہے جس کی اس کے ہاں بخشش ہی نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو بھی ان کے ساتھ بد سلوکی کی اجازت نہیں ہے۔ ان کے ساتھ پھر بھی حسن سلوک کا حکم ہے البتہ اگر وہ تم سے بھی شرک اور کفر کی خواہش کریں تو حکم یہ ہے کہ ان کی یہ بات نہ مانی جائے۔ چنانچہ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ○ (۲۹/۸)

ترجمہ [اور ہم نے انسان کو وصیت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اگر وہ کوشش کریں کہ تم میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک بنا لو جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم ہی نہیں ہے تو ان کی بات نہ مانو۔ میری طرف ہی تم سب کو لوٹنا ہے اور میں تمہیں آخرت میں بتاؤں گا جو کچھ تم دنیا میں کرتے رہے ہو۔]

لیکن اس کے باوجود ان کے ساتھ خدمت اور حسن سلوک میں فرق نہیں آنا چاہیئے۔ جیسا کہ سورۂ لقمان میں فرمایا گیا ہے،

(سورۂ لقمان کی یہ آیت پہلے بھی گذر چکی ہے)

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ○ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۖ (۳۱/۱۴-۱۵)

ترجمہ [اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ (حسن سلوک کی) وصیت کی ہے۔ اس کی ماں نے اسے ضعف پر ضعف برداشت کر کے پیٹ میں اٹھائے رکھا۔ اور دو سال میں دودھ چھڑایا۔ کہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو۔ اور میری طرف ہی لوٹنا ہے۔ اور اگر ماں باپ کوشش کریں کہ تم میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک ٹھہراؤ جن کے متعلق تمہیں کچھ علم نہیں ہے تو ان کی بات نہ مانو اور (اس کے باوجود) دنیا میں ان کے ساتھ دستور کے مطابق (ادب و احترام سے) رہو۔]

والدین کے لئے مغفرت اور حسن خاتمہ کی دعائیں مانگنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ جو لوگ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں، ان کی خدمت بجا لاتے اور ان کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں حق تعالیٰ ان کی نیکی کے بدلے میں ان کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور اپنی رضا و خوشنودی کی نعمت ان کو عطا فرماتا ہے۔

سورۂ احقاف میں ہے:۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ

كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ
حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ
اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى
وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ
ذُرِّيَّتِيْ ؕ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ
نَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْۤ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ
الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ○ (۴۶/۱۵-۱۶)

ترجمہ [اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے اسے تکلیف کے ساتھ (پیٹ میں) اُٹھائے رکھا اور تکلیف کے ساتھ ہی اسے جنم دیا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مشقت پورے تیس مہینے تک قائم رہی حتیٰ کہ جب وہ اپنی جوانی کو پہنچ گیا اور چالیس سال کی عمر ہو گئی تو اس نے کہا۔ اے میرے پروردگار مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر فرمائی ہے اور میرے والدین پر فرمائی ہے اور مجھے اس کی بھی توفیق دے کہ میں صلاحیت بخش اعمال کروں جنہیں تو پسند کرتا ہو اور میری اولاد کو بھی صالح بنا اور میں اب تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں اور میں تیرے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بہترین اعمال کو ہم قبول کر لیتے ہیں اور ان کے بُرے اعمال سے ہم درگذر فرماتے ہیں۔ یہ لوگ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے۔ یہ ہمارا سچا وعدہ

ہے جو ایسے لوگوں سے کیا جاتا رہا ہے۔]

والدین کی اطاعت

قرآن کریم نے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کا شکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن صراحتہً کسی آیت میں بھی ان کی اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے۔ البتہ سورۂ عنکبوت اور سورۂ لقمان کی آیات میں (۲۹/۸ اور ۳۱/۱۵) یہ ہدایت ضرور دی ہے کہ اگر وہ کوشش کریں کہ تم خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرالو تو تم ان کی بات نہ مانو۔ اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ناجائز کاموں میں ماں باپ کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ البتہ مباحات میں ان کی اطاعت کی جانی چاہیئے۔ ہمارے معاشرہ میں ساس بہو اور خسر بہو کے تنازعات ہوتے رہتے ہیں اور ہمارے علماء نے ان آیات سے یہ استدلال فرمایا ہے کہ اگر ماں باپ اس پر اصرار کریں کہ بیوی بچوں کے حقوق ادا نہ کئے جائیں بلکہ بیوی کو طلاق دیدی جائے تو اولاد کا یہ فریضہ ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کی جائے اور بیوی کو طلاق دے دی جائے۔ کیونکہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جسے قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے جو ٹوٹ بھی سکتا ہے اور مٹ کر بدل بھی سکتا ہے۔ لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابل شکست اور ناقابل تغیر ہے۔ لہٰذا جب ماں اور بیوی میں تنازعہ ہو یا بیوی اور خسر میں مناقشہ ہو اور سوال کسی ایک کے ساتھ دینے کا ہو یعنی آپ ماں کا ساتھ دیں یا بیوی کا۔ آپ باپ کی بات مانیں یا بیوی کا خیال کریں تو لامحالہ ماں باپ کو ترجیح دینی چاہیئے۔ اور بیوی کو طلاق دے کر الگ کر دینا

چاہیئے۔ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی آ سکتی ہے۔لیکن ماں کی جگہ دوسری ماں اور باپ کی جگہ دوسرا باپ نہیں آ سکتا۔

اس سلسلہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ پیش کیا جاتا ہے کہ ان کی بیوی سے حضرت عمرؓ ناراض تھے اور انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن خود حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کو وہ بیوی پسند تھیں۔ اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کرلی، جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو صورتِ حال کا علم ہوا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے باپ کی اطاعت کریں اور بیوی کو طلاق دیدیں۔چنانچہ حضرت عبداللہؓ نے بیوی کو طلاق دیدی۔

لیکن ہمارے نزدیک قرآن کریم کا صریح حکم یہ ہے کہ:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَۚ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْاۚ وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝ (۴/۱۳۵)

ترجمہ: اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! انصاف کو پوری طرح قائم کرنے والے بنو (انصاف کے ذمہ دار اور کفیل بنے رہو) اور اللہ کے لئے نگران اور شاہد بنو۔خواہ وہ شہادت خود تمہارے اپنے والدین کے اور تمہارے قرابت داروں ہی کے خلاف کیوں نہ جائے اگر وہ شخص جس کے لئے گواہی دے رہے ہو دولت مند ہو یا فقیر ہو

(تو تمہیں دولت سے مرعوب اور کسی کے فقر و فاقہ سے متاثر نہ ہونا چاہیئے) کیونکہ اللہ ان کا (تم سے) زیادہ خیر خواہ ہے۔ لہٰذا تم انصاف برتنے میں خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ اور اگر تم زبان کو موڑو توڑو گے یا روگردانی اختیار کرو گے تو جو کچھ بھی تم کرتے رہے ہو حق تعالیٰ اس سے خوب خوب واقف ہیں۔]

پھر سورۂ مائدہ میں ارشاد الٰہی ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ط اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ز وَاتَّقُوا اللَّهَ ط إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○ (۵/۸)

ترجمہ [اے پیروانِ دعوت ایمانی! اللہ کے لئے انصاف کو پوری طرح قائم کرنے والے (عدل کے ذمہ دار اور کفیل) اور گواہی دینے والے (نگران) بنو اور تمہیں کسی قوم کی عداوت بھی اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم انصاف سے پہلو تہی کرنے لگو۔ انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ سے ڈرو۔ یقیناً اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھتا ہے۔]

ان دونوں آیاتِ کریمہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ تمام مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے تاکید فرمائی ہے کہ انصاف کو قائم کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر عدل و انصاف کو قائم کرو اور شہادتوں کو ادا کرو۔ عدل و انصاف کا تقاضا خواہ تمہارے خلاف جائے، خواہ والدین کے خلاف جائے خواہ اعزا و اقربا کے

خلاف جائے۔ اس کی قطعاً پروا نہ کرو تمہیں انصاف ہی قائم کرنا ہے۔ حتیٰ کہ دشمنوں سے بھی انصاف ہی کرنا ہے۔ کسی قوم کی عداوت تمہیں انصاف سے روگردانی پر مجبور نہ کردے۔ لہٰذا ساس، بہو یا خسر اور بہو میں کوئی تنازعہ یا مناقشہ اٹھ کھڑا ہو تو محض اس وجہ سے کہ ایک طرف تمہاری ماں، یا تمہارا باپ ہے اور دوسری طرف ایک کمزور و ناتواں عورت ہے جس سے تمہارا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے صرف عہدی رشتہ ہے۔ لہٰذا تمہیں لامحالہ ماں باپ ہی کا ساتھ دینا لازم ہے۔ قرآن کے اس صریح حکم کی خلاف ورزی ہے جو سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ کی مذکورہ بالا آیات میں تمام مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ معاملہ پر سنجیدگی سے غور کرو اور معلوم کرو کہ خطا اور زیادتی کس کی ہے؟ جو حق پر ہو اس کا ساتھ دو اور جو ناحق پر ہو اس سے ادب کے ساتھ معذرت کرلو کہ فریق ثانی کی کوئی خطا نہیں ہے۔ لہٰذا میں تمہارا ساتھ دینے سے معذور ہوں۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے واقعہ سے اس وقت تک استدلال نہیں کیا جا سکتا جب تک پورے واقعہ کی تفصیل معلوم نہ ہو۔ ہم نہیں سمجھتے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بلا کسی قصور کے حضرت عبداللہؓ کی بیوی کو طلاق دلوادی ہوگی۔ محض اس بات سے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اپنی بیوی سے راضی تھے اس کا بے خطا ہونا ثابت نہیں ہوسکتا جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ صحابہ میں نہایت زاہد و

عابد، نیکدل اور مرتاض صحابی تھے۔ ان کی عبادت و ریاضت کی تفصیلات کتب حدیث میں موجود ہیں۔ جو لوگ زاہد و عابد، نیک دل اور مرتاض ہوتے ہیں اُنہیں اپنے عیوب و نقائص پر غور و خوض کرنے سے ہی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ دوسروں کی خامیوں کو دیکھ سکیں۔ ایسے لوگ اتنے مشغول بہ حق ہوتے ہیں کہ اُنہیں مشغولیت بہ خلق کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ اولیاء کرام اور صوفیہ یک جہتی ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام مشغول بہ حق ہونے کے ساتھ مشغول بہ خلق بھی ہوتے ہیں۔ وہ قطعاً یک جہتی نہیں ہوتے۔ جو باریک بینی اور دقیقہ سنجی انبیاء کرام میں ہوتی ہے وہ صوفیہ اور اولیاء کو میسر نہیں آسکتی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نظر یقیناً حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی اہلیہ کی ان خامیوں پر گئی ہوگی جن کو حضرت عبداللہؓ محسوس نہیں کر سکتے تھے۔ اور حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کو بھی خصائص نبوت سے یقیناً کچھ حصہ ملا تھا۔ جب ہی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:۔

لَقَدْ کَانَ فِیمَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ نَاسٌ مُحَدَّثُوْنَ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَکُوْنُوْا اَنْبِیَاءَ فَاِنْ یَکُنْ فِیْ اُمَّتِیْ اَحَدٌ فَاِنَّہٗ عُمَرُ

(بخاری و مسلم)

ترجمہ [گذشتہ امتوں میں کچھ لوگ محدث ہوتے تھے۔ البتہ وہ نبی نہیں ہوتے تھے۔ اگر میری اُمت میں کوئی ایسا ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے۔]

اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

لَوْ كَانَ بَعْدِىْ نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ (طبرانی اوسط)

ترجمہ [اگر بالفرض میرے بعد کوئی نبی ہو سکتا تو عمرؓ ہوتے۔]

ویسے بھی حضرت عمرؓ عدل و انصاف کے اعتبار سے تاریخ اسلام میں ایک علامت (SYMBOL) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بلاوجہ محض اپنی ذاتی ناپسندیدگی کی خاطر اپنی بہو کو طلاق دلوانا چاہتے تھے۔ یقیناً ان میں کوئی ایسی کوتاہی ہوگی جس کی بناء پر حضرت عمرؓ نے یہ خواہش کی ہوگی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی تائید فرمائی ہوگی لیکن اس خامی کی طرف حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی نظر نہیں گئی جوان کے زہد و عبادت و ریاضت کا خاصّہ تھا۔ ہمارے محدثین کرام نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھا ہے اور اسی بناء پر انہوں نے زُہّاد و عُبّاد کی روایات کو قبول نہیں کیا۔ کیونکہ حسن ظن کی بناء پر وہ ہر کہ دمہ کی روایت کو قبول کر لیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ کون شخص اس قابل ہے کہ اس سے روایت لی جائے اور کون شخص اس قابل نہیں ہے۔

اسلام کی سہولت

حقوق والدین کے سلسلہ میں تورات اور انجیل کا یہ حکم ہم بیان کر چکے ہیں کہ جو کوئی اپنے ماں باپ پر لعنت کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ اسلام نے اس جرم کی سزا میں تخفیف فرما دی ہے۔ جو ماں باپ کی بے حرمتی اور بے ادبی کرے انہیں بُرا بھلا کہے، انہیں خدانخواستہ گالیاں دے تو یہ جرم انتہائی شدید ہے اور حق تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب

ہے۔ لیکن اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی سزا کے بجائے اُخروی سزا کا موجب قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گناہ توبہ واستغفار اور والدین کی معافی سے معاف بھی ہو سکتا ہے۔

قتل اولاد اگر کوئی ماں باپ اپنی اولاد میں سے کسی کو قتل کر دیں تو کیا ان سے قصاص لیا جائے گا؟ اس باب میں ہمارے فقہاء نے اختلاف کیا ہے کہ باپ کو بیٹے کے قصاص میں قتل کیا جائے گا یا نہیں۔ عام فقہاء کا خیال یہ ہے کہ باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا البتہ اس پر دیت (خون بہا) ادا کرنا واجب ہے چنانچہ فقہائے حنفیہؒ اوزاعیؒ، شافعیؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا قول یہی ہے۔ بلکہ یہ حضرات دادا کے متعلق بھی اسی کے قائل ہیں حسن ابن صالح بن حییؒ نے کہا ہے کہ دادا سے پوتے کا قصاص لیا جائے گا۔ اور اسی کے ساتھ ہی وہ پوتے کے حق میں دادا کی شہادت قبول کرنے کے حق میں ہیں جبکہ باپ کی شہادت بیٹے کے حق میں ان کے نزدیک بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔ عثمان بتیؒ نے کہا ہے کہ اگر باپ نے بیٹے کو عمداً قتل کیا ہے تو قصاص لیا جائے گا۔ امام مالکؒ کا قول بھی یہی ہے۔ بعض لوگوں نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر باپ نے بیٹے کو بے رحمی سے ذبح کیا ہے تو قصاص لیا جائے گا۔ اگر اس نے ویسے ہی اس پر تلوار پھینک کر ماری ہے تو اسے قتل نہیں کیا جائیگا۔

(احکام القرآن للجصاص الرازی ص ۱۶۸ ج ۱ مطبوعہ مصر)

شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس ضمن میں فرماتے ہیں:۔

میں کہتا ہوں کہ باپ سے بیٹے کا قصاص نہ لینا امام ابوحنیفہؒ
امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ دوسرے فقہاء نے اس کی
مخالفت فرمائی ہے، ان کا ارشاد ہے کہ قصاص، کتاب اللہ کی ظاہری
آیات سے اور ان احادیث سے جو قصاص کو واجب قرار دیتی ہیں
واجب ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے قتل میں دونوں
کو اسی طرح قتل کیا جائے جیسے اجنبیوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ اور
ظاہر آیات اور ان احادیث کا جواب یہ ہے کہ یہ ان روایات کی وجہ
سے مخصوص ہیں جو ہم نے بیان کی ہیں۔

اس سلسلہ میں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے دارقطنی
بیہقی اور ترمذی کی روایات حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عمرؓ
اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے نقل فرمائی ہیں کہ آنحضرت
صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باپ کو بیٹے کے بدلے میں قتل نہیں
کیا جائے گا اور فرمایا کہ :

ان روایتوں کو ابن عبدالبرؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ
حدیث مشہور ہے۔ اہل علم، حجاز اور عراق کے فقہاء میں مشہور ہے
اور اپنی شہرت، قبولیت اور ان کے مطابق عمل کی بناء پر سند سے
مستغنی ہوگئی ہیں۔ حتیٰ کہ ان جیسی احادیث کے بارہ میں سند
سے بحث کرنا محض تکلف ہے۔

(اعلاء السنن ص ۶ ج ۱۸ بحوالہ المغنی ص ۳۵۹ ج ۹)

مجھے نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرنے دیجئے کہ حافظ ابن
عبدالبر کا یہ ارشاد جو ابن قدامہ نے نقل کیا ہے ہماری فہم سے بالاتر

ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ جس حدیث کو ہمارے فقہا کے طبقہ میں شہرت اور قبولیت حاصل ہو جائے اور انہوں نے اس کے مطابق عمل بھی کر لیا ہو تو وہ مشہور ہو جاتی ہے اور اس کی سند کیسی ہی ہو اس سے کتاب اللہ کے عام کو خاص اور مطلق کو مقید کیا جا سکتا ہے جو ایک طرح کا نسخ ہے۔ چنانچہ عموماً ہمارے فقہاء خبر مشہور سے قرآن کو منسوخ کر دینے کے قائل ہیں۔ ہم اس موضوع پر آگے کتاب الوصیۃ اور کتاب الحدود میں تفصیل سے بحث کریں گے۔ یہاں آپ صرف اتنی سی بات پر غور فرمائیے کہ حدیث سند کے اعتبار سے کیسی ہی کیوں نہ ہو لیکن فقہاء کے قبول کر لینے کے بعد اگر وہ مشہور ہو جاتی ہے اور اس سے کتاب اللہ کے حکم کو منسوخ کیا جا سکتا ہے تو پھر محدثین کی ان تمام کوششوں اور کاوشوں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے جو انہوں نے صحیح، ضعیف موضوع احادیث کو الگ کرنے کے سلسلہ میں فرمائی ہیں نیز فن اسماء الرجال کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے جس پر تمام محدثین بلکہ تمام مسلمانوں کو اس قدر ناز ہے۔ کیونکہ مدار تو فقہاء کی پسند اور ناپسند اور رد و قبول پر ٹھہرا۔ وہ جس حدیث کو چاہیں قبول کر لیں اور اسے مشہور قرار دیدیں۔ اور اس سے کتاب اللہ کے جس حکم کو چاہیں منسوخ کر دیں۔ چاہے حدیث صحیح ہو حسن ہو ضعیف ہو یا موضوع ہو۔

واضح رہے کہ جمہور محدثین کے نزدیک احادیث کی صرف دو قسمیں ہوتی ہیں۔ حدیث[۱] متواتر اور خبر[۲] واحد۔ حدیث متواتر اس

حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی ہر زمانہ اور ہر طبقہ میں اتنے رہے ہوں جن کے جھوٹ پر اتفاق کر لینے کا کوئی امکان نہ ہو اور عقل اسے باور نہ کرے۔ اور خبر واحد اسے کہتے ہیں جو ایسی نہ ہو، جس میں صدق اور کذب دونوں کا احتمال ہو۔ خبر مشہور محدثین کے نزدیک کوئی حدیث نہیں ہوتی، یہ صرف فقہائے حنفیہ کی اپنی اصطلاح ہے جو محدثین کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر فقہائے حنفیہ کا یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو پھر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے کیا غلط کہا تھا کہ:۔

"اسلام کا مزاج عین نبوت کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے۔ جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ ان میں کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنت نبویہ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح، روحِ محمدی میں گم اور اس کی بصیرت، بصیرت نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے۔ مگر اس کے فیصلہ کا مدار اس

پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے، وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات حصہ اول ص۳۲۳-۳۲۴)

اور مرزا غلام احمد قادیانی صاحب نے کیا غلط کہا تھا کہ:

جو شخص حکم ہو کر آیا ہے اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے خدا سے علم پاکر قبول کرلے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پاکر رد کردے۔" (تحفہ گولڑویہ ص۱۰)

اور۔

حدیثوں کی کتابوں کی مثال تو مداری کے پٹارے کی ہے۔ جس طرح مداری جو چاہتا ہے اس میں سے نکال لیتا ہے۔ اسی طرح ان سے جو چاہو نکال لو۔

(الفضل قادیان بابتہ ۱۵ جولائی ۱۹۲۴ء)

مرزا صاحب تو خدا سے علم پاکر ہی حدیثوں کو قبول اور رد کرتے تھے۔ لیکن ہمارے علماء نے تو خود اپنی بصیرت اور مزاج شناسی پر ہی رد و قبول کا مدار ٹھہرا دیا ہے۔ یا للعجب۔

اگر یہ صحیح ہے تو مرزا غلام احمد قادیانی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے ارشادات سو فیصد صحیح ہیں۔ معلوم نہیں

کیوں ان دونوں کے خلاف ہمارے علمائے کرام نے شور مچا رکھا ہے۔

یاد رکھیئے بغیر کسی دلیل کے صرف اپنی خواہش اور مرضی کو منوانا تعبّدی اطاعت کہلاتا ہے اور یہ صرف حق تعالیٰ کو زیب دیتا ہے۔ ایک رسول کو بھی لوگوں سے اپنی خواہش اور مرضی کو منوانے کا حق نہیں ہوتا۔ اسے بھی اپنی دلیل اور سند میں اقوال الٰہی کو پیش کرنا ہوتا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ
وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۹)

کسی بشر کو اس کا حق نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب حکومت اور نبوت عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔

بے چون وچرا کسی کی مرضی کی اطاعت صرف حق تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ کسی اور کا حق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جگہ جگہ اقوامِ عالم سے خود ان کے دینی اور مذہبی عقائد اور مفروضات کے بارے میں دلیل و برہان کا مطالبہ فرمایا ہے۔

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

(۲/۱۱۱، ۲۱/۲۴، ۲۷/۶۴، ۲۸/۷۵)

اے پیغمبر اسلام! کہیئے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔

لہٰذا ہم اس مسئلہ میں امام مالکؒ، عثمان بتیؒ اور اصحابِ ظواہر

کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اس موضوع پر سیرت النبی کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں، احنافؒ اور شوافعؒ کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا، امام مالکؒ کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہے ورنہ نہیں اور ظاہریہ کے اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے اور یہی قرآن کا منشاء معلوم ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ باپ کے دفور شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلا قصد سمجھا گیا ہے۔ اس لئے اکثر فقہاء نے اس کو قتل خطا سمجھ کر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے۔ اِلّا یہ کہ دلائل و قرائن باپ کے سوء قصد کو ظاہر کرتے ہوں۔"

(سیرت النبی ج ۶ ص ۲۲۷ مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد)

مجھے خوشی ہے کہ مولانا ندوی مرحوم نے بھی عثمان بتی اور اصحاب ظاہر کے قول ہی کو منشائے قرآنی کے مطابق قرار دیا ہے۔ فقہائے حنفیہؒ اور شافعیہؒ کی طرف سے جو اعتذار انہوں نے پیش کیا ہے وہ اعتذار کی حد تک ہی ہے ورنہ واقعات اور قرآن کریم کی تصریحات اس کی تائید نہیں کرتیں۔ آئے دن اخبارات میں اس قسم کی خبریں آتی رہتی ہیں کہ بیٹے نے باپ کو قتل کر دیا، باپ نے

بیٹے پر گولی چلادی، بیٹے کو ذبح کر دیا اور خود قرآن کریم نے۔

لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ (۱۷/۳۱)

اپنی اولاد کو نقر و فاقہ کے اندیشہ سے قتل نہ کرو۔

اور۔

لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ (۶/۱۵۱)

اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کی وجہ سے قتل نہ کرو۔

محض تکلفاً ہی نہیں فرمادیا تھا۔ لوگ اپنے بچوں کو قتل کرتے تھے۔ جب ہی تو قرآن کریم کو اس شدت سے ممانعت کرنی پڑی اس کی ہزاروں مثالیں ملتی ہیں کہ لوگ اپنے بچوں کو چند سکوں کے عوض فروخت کر دیتے ہیں۔ قتل کر دیتے ہیں اور ان سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ مسئلہ کتاب الجنایات، باب القصاص سے تعلق رکھتا ہے ہم اس پر وہیں بحث کریں گے۔ لیکن یہاں مختصراً اتنا عرض کردوں کہ اس سلسلہ میں تین روایات ترمذی، دارقطنی اور بیہقی کی پیش کی جاتی ہیں جو حضرت عمرؓ اور ابن عباس سے نقل کی جاتی ہیں، سند کے اعتبار سے تینوں حدیثیں قوی نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے الفاظ۔

لَا يُقَادُ الْاَبُ مِنْ اِبْنِهٖ اور لَا يُقْتَلُ الْوَالِدُ بِالْوَلَدِ نقل کئے گئے ہیں۔

باپ سے بیٹے کی وجہ سے قصاص نہیں لیا جائے گا اور والد بیٹے کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔

الاب اور الوالد دونوں معرف باللام ہیں نکرہ نہیں ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ حکم کسی خاص اب اور اور کسی خاص والد کا بیان کیا گیا ہے ہر والد اور ہر اب کا نہیں لہٰذا ان احادیث کو کسی خاص واقعہ پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ عام حکم نہیں کہا جا سکتا۔ واللہ اعلم۔

اولاد کے حقوق

پچھلی شریعتوں میں والدین کے حقوق پر تو کافی زور دیا گیا ہے۔ لیکن والدین پر اولاد کا کوئی خاص حق نہیں بتایا گیا۔ اسلام ہی وہ پہلا دین ہے جس نے اولاد کے حقوق کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اسلام نے حقوق کے سلسلہ میں چھوٹوں اور بڑوں میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اگر اولاد کا یہ فرض ہے کہ وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے ان کا ادب اور احترام کرے تو والدین کا بھی یہ فریضہ ہے کہ وہ چھوٹوں کے ساتھ شفقت و رحمت سے پیش آئیں، ان کی تعلیم و تربیت بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش کریں۔

اولاد کی عظمت

یہ حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ اس چیز کی قسم کھاتا ہے جس کی عظمت اور حرمت اس کے دل میں جاگزیں ہوتی ہے یا جو اسے عزیز ترین ہوتا ہے۔ وہ اپنی شہادت میں اسی چیز کو پیش کرتا ہے جس کی عظمت و حرمت کا وہ خود بھی اور اس کے مخاطب بھی قائل ہوں اور سب کو عزیز ہوں۔

حقیر اور بے وقعت اور غیر متعلق چیز کی نہ کوئی قسم کھاتا ہے نہ اسے اپنی شہادت میں پیش کرتا ہے۔ حق تعالیٰ نے سورۂ بلد میں اولاد کی قسم کھا کر اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ اولاد حق تعالیٰ کے نزدیک ایسی ہی باعظمت ہے جیسا کہ ان کا باپ باعظمت ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝ (۹۰/۱-۳)

میں اس شہر (مکہ) کی قسم کھاتا (اسے شہادت میں پیش کرتا) ہوں۔ اور آپ اسی شہر میں تو رہتے ہیں۔ اور باپ کو اور اولاد کو بھی شہادت میں پیش کرتا ہوں (ان کی قسم کھاتا ہوں)۔

اس آیت کریمہ سے جہاں باپ اور والد کی عزت و عظمت اور محبت کا ثبوت ملتا ہے وہیں اولاد کی عزت و حرمت اور محبت ثابت ہوتی ہے۔ ماں اور باپ کی طرح اولاد بھی انسان ہوتی ہے اور اس کا شمار بھی اولادِ آدم میں ہوتا ہے اور قرآن کریم نے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)

اور ہم نے اولاد آدم کی عزت و حرمت عطا کی ہے۔

میں انسان کے ہر فرد کی عظمت و حرمت اور عزت و وقار کا اعلان فرمایا ہے جس میں جوان، بوڑھا، بچہ، مرد اور عورت سب ہی شامل ہیں۔

بچوں کے حقوق

عربی زبان کے بعض الفاظ کا جو اُردو میں بھی استعمال ہونے لگے ہیں مفہوم ہمارے ذہنوں میں وہی کچھ آتا ہے جس مفہوم میں وہ ہماری اپنی زبان میں مستعمل ہیں۔ حالانکہ عربی زبان میں اس کا صرف وہی مفہوم نہیں ہوتا۔ عربی زبان میں ان کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہوتا ہے جو ہماری زبان میں ہوتا ہے۔ اسی طرح کا ایک لفظ قَتْلٌ بھی ہے۔ ہمارے ہاں اس کا مفہوم ذبح کر دینا۔ زندگی کا خاتمہ کر دینا۔ جان نکال دینا ہوتا ہے مگر عربی زبان میں اس کا مفہوم صرف یہی نہیں ہوتا۔ امام راغب نے مفردات القرآن میں تصریح فرمائی ہے کہ اس کے معنے ذلیل و حقیر کرنے اور دھکا دینے کے بھی آتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے ذلیل کرنے اور مار ڈالنے کے ہیں۔ سورۂ عبس میں :۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَہٗ ۝ (۸۰/۱۷)

انسان پر ہزار پھٹکار وہ کیسا ناشکرا ہے۔

کے معنے تذلیل و تحقیر ہی کے ہیں۔ سورۂ توبہ اور سورۂ المنافقون میں ہے۔

قَاتَلَھُمُ اللّٰہُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ ۝ (۹/۳۰ ، ۶۳/۴)

اللہ انہیں ذلیل و رسوا کرے۔ وہ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔

سورۂ الذاریات میں ہے :۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝ (۵۱/۱۰)

اٹکل پچو باتیں کرنے والوں کا ستیاناس ہو۔

ان تینوں مقامات میں بھی تباہی بربادی، ذلت ونامرادی کے معنے ہیں۔ یہ تمام مثالیں دینے کے بعد امام راغب نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جو:-

لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (۱۷/۳۱)

اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کی وجہ سے قتل نہ کرو۔

اور۔

لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (۶/۱۵۲)

اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کی وجہ سے قتل نہ کرو۔

آیا ہے تو اس کے معنے صرف یہی نہیں ہیں کہ انہیں ذبح نہ کردو ان کی جان نہ لے لو۔ بلکہ انہیں علم و تربیت سے محروم رکھنا اور انہیں سامان نشوونما بہم نہ پہنچانا بھی قتل کرنے کے مفہوم میں شامل ہے۔

لہٰذا ان دونوں آیات (یعنی ۶/۱۵۲ اور ۱۷/۳۱) سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے بچوں کو صرف جان سے مار ڈالنے ہی سے منع نہیں کیا بلکہ ان کی تذلیل و تحقیر، تعلیم و تربیت سے بے اعتنائی خوراک اور لباس اور دیگر ضروریاتِ زندگی سے غفلت، بیماری آزاری میں علاج معالجہ سے تغافل، غرضکہ ان کے نشوونما اور پرورش اور غور و پرداخت میں تساہل اور سستی کی تمام چیزوں سے منع کیا ہے۔ ان کو مارنا پیٹنا، ذلیل و خوار کرنا ساری چیزیں قتل کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اپنے مفہوم کے اعتبار سے قتل کا لفظ ان تمام باتوں کو شامل ہے۔

والدین پر اولاد کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ جب خدا نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ انہیں بنایا ہے تو وہ بالقصد کسی انداز سے بھی ان کے نقش زندگی کو مٹانے یا اسے دھندلانے کا سبب نہ بنیں بلکہ ان کی حیات کی تکمیل اور ان کے نشو ونما کی ترقی کے وہ تمام ذرائع مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اسلام نے اپنے تو اپنے غیروں کے بچوں تک کی ہر ممکن خبرگیری کو ضروری قرار دیا ہے۔ یتامیٰ کے سلسلہ میں قرآن کریم میں خود یتیم کے لفظ سے تیئیس ۲۳ آیتیں آئی ہیں جن میں یتیموں کی خبرگیری کرنے، ان کی مالی امداد کرنے، ان کے اموال کی حفاظت کرنے، ان کو ذلیل نہ کرنے وغیرہ کے احکام دیئے گئے ہیں، جو مذہب غیروں کے بے آسرا اور بے سہارا بچوں کے متعلق اس شد و مد سے باصرار مسلمانوں کو تاکیدیں کرتا ہے اس کا منشا خود اپنے بچوں کے سلسلے میں کیا کچھ نہ ہوگا۔

اولاد کُشی عرب ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں اسلام سے پہلے مختلف سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگدلی کی ایک یہ رسم بھی جاری تھی کہ وہ اپنے معصوم بچوں کو مار ڈالتے تھے اور یہ کام ماں باپ اپنی مرضی اور خوشی سے خود اپنے ہاتھوں انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے مختلف اسباب ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک سبب تو مذہبی تھا کہ لوگ اپنے بچوں کو دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے خود ذبح کر کے مذہبی استھانوں پر چڑھاتے تھے۔ منتیں مانتے تھے کہ ہمارا فلاں کام ہو گیا تو ہم اپنے ایک بچے

کی قربانی دیں گے۔ رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں جس کا رومن لاء کے نام سے آج بھی قانون کی درسگاہوں میں بڑا چرچا ہے، باپ کو اولاد کے مار ڈالنے کا کلی اختیار تھا اور اس کی کوئی باز پرس نہیں تھی۔ ہندوستان میں بھی بتوں، دیوتاؤں دیویوں کی رضا اور خوشی کے لئے ان معصوموں کی جان کا نذرانہ پیش کرنا عام رواج تھا۔ دوسرا سبب جھوٹی عزت ووقار کا تھا۔ کچھ لوگ اسے بڑی عار کی بات سمجھتے تھے کہ کوئی ان کا داماد کہلائے۔ یعنی ان کی بیٹی کی عزت وعصمت کا خریدار بنے۔ لہٰذا وہ اپنی لڑکیوں کو قتل اور زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ تیسرا سبب معاشی تھا کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں خود ہی کھانے کو نہیں مل رہا ہے۔ اولاد پیدا ہوگی تو اسے بھی کھلانے پلانے اور پہنانے کے اخراجات کرنے پڑیں گے۔ لہٰذا اس بوجھ کو کیوں برداشت کریں۔

ساری دنیا کی طرح عربوں میں بھی یہ قبیح رسم جاری تھی اور اس کے یہی تین اسباب ان کے ہاں بھی ہوتے تھے۔ ہندوؤں میں ایک رسم ستی کی بھی تھی کہ لڑکی کا اگر خاوند فوت ہو جائے (واضح رہے کہ ہندوؤں میں بچپن میں شادیاں کر دینے کا رواج تھا) تو اسے بدشگونی اور خود بہو کی نحوست کا اثر سمجھا جاتا تھا اور اسے شوہر کی چتا کے ساتھ ہی جلنا پڑتا تھا۔ ستی ہونے والیاں کمسن بچیاں بھی ہوتی تھیں اور جوان لڑکیاں بھی۔

سورۂ انعام میں ہے:۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ○

(۶/۱۳۷)

(جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے دیوتاؤں نے اپنا حصہ لگا لیا ہے) اسی طرح بہت سے مشرکوں کو اُن کے دیوتاؤں نے یہ بات خوشنما کرکے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کردیں تاکہ یہ دیوتا ان کو ہمیشہ کے لئے ہلاکت میں ڈال دیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کردیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ تو ان مشرکوں کو اور جو کچھ وہ اللہ تعالےٰ پر افتراء کرتے ہیں (کہ ان کو خدا نے ایسا ہی حکم دیا ہے) اس کو چھوڑیئے۔

اسی سلسلہ میں ذرا آگے چل کر ارشاد ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ (۶/۱۴۰)

خسارہ میں ہیں وہ جنہوں نے نادانی اور حماقت سے بے جانے بوجھے اپنی اولاد کو قتل کردیا۔

• کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو فقر و فاقہ کے اندیشہ سے اس

ہولناک جرم کا ارتکاب کرتے تھے۔ اسلام نے ان کے ان غلط اندیشوں کا بیہودہ پن ظاہر کیا اور ان کو بتایا کہ رزق دینا تمہارا کام نہیں ہے۔ یہ حق تعالیٰ کا کام ہے۔

اگر کسی کی بیوی بیمار ہے یا رہن سہن میں تنگی ہے تو یہ احتیاط کی جا سکتی ہے بلکہ کی جانی چاہیئے کہ اولاد کے پیدا ہونے میں مناسب وقفہ ہو تاکہ بیمار بیوی، یا پہلے بچوں کی زندگی داؤ پر نہ لگے یا ان کی تعلیم و تربیت اور صحت وغیرہ میں کوتاہی نہ ہو لیکن اگر آنے والے بچے کے متعلق پہلے سے احتیاط نہیں کی یا احتیاط کے باوجود بچہ ہو گیا تو اب اس کے اسقاط یا قتل کی حرکت یقیناً سفاکانہ اور ظالمانہ ہے اور معاش کی آڑ میں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو مخلوق پیدا کی ہے۔ اس کا رزق بھی خود باری تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ وہی تمہیں بھی رزق دیتا ہے اور وہی انہیں بھی رزق دے گا۔ تم خواہ مخواہ اس غم میں دُبلے ہوتے ہو۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا

(۱۱/۶)

زمین پر کوئی جاندار نہیں، لیکن یہ کہ اسے روزی پہنچانا اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہوا ہے۔

حیوانات کی دنیا میں دیکھو جن کی تعداد بہ نسبت انسانوں کے کئی گنا زیادہ ہے۔ لیکن تم نے کسی حیوان کو رزق نہ ملنے کی وجہ سے مرتا ہوا نہیں دیکھا ہو گا۔ انسانوں کی دنیا میں اگر کہیں فقر و فاقہ نظر آتا ہے تو یہ خود تمہاری ہی اپنی خود غرضیوں اور

ذخیرہ اندوزیوں کا نتیجہ ہے حق تعالیٰ کی طرف سے رزق کی پیداوار میں کسی کوتاہی کا نتیجہ نہیں ہے۔ اسلام نے عرب کے جاہلوں کو بتایا۔

لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (۱۷/۳۱)

اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے اندیشہ سے قتل نہ کر ڈالو، ہم ہی ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔ یقیناً انہیں یوں قتل کر دینا بہت بڑی غلطی ہے۔

حق تعالیٰ نے اس جرم کو اتنی بڑی اہمیت دی ہے کہ اسے شرک کے پہلو بہ پہلو بیان فرمایا ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (۶/۱۵۰)

اے پیغمبر اسلام! آپ کہہ دیجئے کہ آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے کیا کیا چیزیں حرام کی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کی وجہ سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی تو تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

اولاد کُشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ ہولناک بھیانک اور قابلِ افسوس تھی وہ دختر کُشی کی رسم تھی یعنی اُنہیں زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کا پیدا ہونا انتہائی شرم اور عار کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ بڑے صدمہ سے کہنا پڑتا ہے کہ اگرچہ آج لڑکیوں کو زندہ دفن تو نہیں کیا جاتا لیکن باوجود تہذیب و تمدن اور علم و فن کی ترقی کے آج بھی لڑکیوں کے پیدا ہونے کو کچھ اچھا شگون نہیں سمجھا جاتا، ہاں کسی کے ہاں لڑکا پیدا ہو جائے تو بڑے اہتمام سے خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ جن گھروں میں لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنے والدین کے لئے سوہانِ روح بن جاتی ہیں۔ ان کے لئے بَر تلاش کرنا ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ شرمناک حد تک لڑکے والے بیٹوں کا سودا کرتے ہیں۔ ہزاروں کے جہیز مانگے جاتے ہیں۔ یہ لڑکوں کی قیمت ہوتی ہے۔ لیکن یہ عجیب قیمت ہے کہ قیمت ادا کر کے لڑکی والا لڑکے کو خریدتا نہیں بلکہ اپنی لڑکی کو بیچتا ہے۔ چنانچہ وہ زرخرید لونڈی سمجھی جاتی ہے۔ متمدن، مہذب، تعلیم یافتہ متقی پرہیزگار، حافظ، حاجی، علماء فضلاء، ہر طبقہ کے گھرانوں میں یہی حال ہے اور اس حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔ کیا یہ اسی جاہلی رسم دختر کُشی کے باقیات السیئات نہیں ہیں؟ ہم اس پر "حقوق الزوجین" کے باب میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔ یہاں انہی اشارات پر اکتفاء کرتے ہیں۔

سورۂ زخرف میں ہے کہ:۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ

مَثَلاً ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ○

(۴۳/۱۷)

اور جب ان میں کسی کو لڑکی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے جس کی وہ رحمت والے اللہ پر تہمت باندھتے ہیں (کہ اللہ کی بیٹیاں فرشتے ہیں) تو اندر ہی اندر غم و غصہ کے مارے اُن کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس شرم و عار کے مجسمہ کو ماں باپ زندہ دفن کر دینے ہی میں عافیت سمجھنے لگے۔

سورۂ نحل میں ہے:۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ○ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○

(۱۶/۵۸-۵۹)

جب ان میں کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ غم و غصہ سے سیاہ پڑ جاتا ہے۔ وہ غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ذلت برداشت کر کے اسے زندہ رہنے دے یا اسے مٹی میں دفن کر دے دیکھو، کتنا بُرا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

یوں تو یہ رسمِ بد تھوڑی بہت تمام عربوں میں رائج تھی مگر

قبیلۂ بنو تمیم میں اس کا رواج سب سے زیادہ تھا۔ جس طرح گو تمام ہندوستان میں یہ رسم تھی مگر زیادہ رواج راجپوتوں میں تھا[1]۔

بنو تمیم کے رئیس قیس ابن عاصم رض نے خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے اعتراف کیا کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں آٹھ یا دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے (ابن جریر، ابن کثیر، درمنثور سیوطی بحوالہ سنن بیہقی، مسند بزار و مصنف عبدالرزاق زیر تفسیر سورۃ تکویر) یہ رسم جس شقاوت اور سنگدلی کے ساتھ انجام دی جاتی تھی اس کا نقشہ ایک صحابی نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے روبرو اپنی آپ بیتی سنا کر یوں کھینچا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم آب دیدہ اور بے چین ہو گئے۔

سنن دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بارگاہ میں بیان کیا کہ اے اللہ کے رسول ہم لوگ جاہلیت والے تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے، اولاد کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ میرے ایک لڑکی تھی جب میں بلاتا تو وہ دوڑ کر میرے پاس آتی۔ ایک دن وہ میری آواز پر خوشی خوشی دوڑی ہوئی آئی۔ میں آگے بڑھا وہ میرے پیچھے پیچھے آتی رہی، میں آگے بڑھتا چلا گیا، جب ایک کنویں کے قریب پہنچا جو میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا اور لڑکی بھی اس

---

[1] مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران ص۳۴۵ و مجمع الامثال میدانی ج۲ ص۲۸۴ مطبعہ خیریہ مصر زیر مثل اضل موؤدۃ۔

کے قریب پہنچ گئی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنویں میں ڈال دیا۔ وہ ابا ابا پکارتی رہی۔ یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔ رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم یہ پر شقاوت اور سنگدلانہ افسانہ سن کر اپنے آنسو ضبط نہ فرما سکے۔ ایک صحابی نے ان صاحب کو ملامت کی کہ تم نے یہ دردناک کہانی سنا کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو غمگین کر دیا"۔ آپ نے فرمایا" اسے چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے"۔ پھر اُن صاحب سے آپ نے فرمایا" ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر سناؤ"۔ انہوں نے سارا واقعہ پھر بیان کیا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر اتنا اثر ہوا کہ روتے روتے ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر ارشاد فرمایا "جاؤ جاہلیت کے تمام گناہ اسلام لانے کے بعد دھل گئے۔ اب نئے سرے سے اپنا کام شروع کرو"۔

بنو تمیم ہی کے رئیس قیس ابن عاصمؓ جب اسلام لے آئے تو انہوں نے عرض کیا کہ " اے اللہ کے رسول! میں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں دفن کی ہیں"۔ آپ نے فرمایا" ہر لڑکی کے عوض بطور کفارہ کے ایک غلام آزاد کرو"۔ انہوں نے عرض کیا کہ" غلام تو میرے پاس نہیں ہیں۔ البتہ اونٹ موجود ہیں"۔ آپ نے فرمایا" اچھا ہر لڑکی کے عوض ایک اونٹ کی قربانی کرو۔

(ابن جریر بروایت قتادہ وابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق، بزار و درمنثور۔ سیوطی بحوالہ مسند بزار وحاکم و بیہقی زیر تفسیر سورۃ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ)

کس قدر حیرت ناک بات ہے کہ عورتیں بھی اس جرم میں مردوں سے کچھ کم نہیں تھیں۔ وہ اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لئے پیش کیا کرتی تھیں۔

ابن العربی نے جاہلیت کے ایک شاعر کا یہ شعر سنایا ہے ؎

وَمَا لَقِيَ الْمَوْءُودُ مِنْ ظُلْمِ اُمِّهٖ

كَمَا لَقِيَتْ ذُهْلٌ جَمِيْعًا وَعَامِرٌ

زندہ دفن ہونے والے بچوں نے اپنی ماؤں کے ظلم سے وہ تکلیف نہیں اٹھائی ہوگی جو پورے بنو ذہل اور بنو عامر نے اٹھائی ہے۔

طبرانی کے حوالے سے در منثور نے کچھ لوگوں کے متعلق مثلاً فرزدق شاعر کے دادا صعصعہ اور حضرت زید بن عمرو بن نفیل (حضرت عمرؓ کے چچا) کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ ایسی لڑکیوں کو ان کے ماں باپ سے خرید کر اپنی آغوش شفقت میں لے کر ان کی پرورش کیا کرتے تھے چنانچہ صعصعہ نے (۳۶۰) لڑکیوں کو اور حضرت زید بن عمرو ابن نفیل نے بے شمار بچیوں کو موت کے آغوش میں جانے سے بچایا لیکن یہ انفرادی کوششیں تھیں۔ اسلام نے درحقیقت اس رسم قبیح کو بند کرایا۔ چنانچہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں

لہ یہ حضرت زید بن عمرو، حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے چچا اور ان کے بہنوئی حضرت سعید بن زیدؓ (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) کے والد ہیں۔ حضور اکرمؐ ان کی توحید پرستی اور اخلاقی عظمت سے بہت متاثر تھے۔ آنحضرت نے نہ صرف ان کے جنتی ہونے کی بشارت دی ہے بلکہ فرمایا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک امت کے برابر ہیں۔ (طبقات ابن سعد و اصابہ)

کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا ترغیب و تحریص کے لئے بے حساب اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا۔ کہیں یہ ارشاد فرمایا کہ جن بچیوں کی محبت و مہربانی کے ساتھ پرورش کی جاتی ہے وہ عذاب جہنم سے ماں باپ کے لئے حجاب بن جاتی ہیں۔ (صحیح بخاری کتاب الادب و صحیح مسلم کتاب البر)

کبھی فرمایا کہ جو آدمی دو[۲] لڑکیوں کی پرورش کرے گا وہ قیامت میں اس طرح میرے قریب ہوگا جیسے میری دو انگلیاں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ (صحیح مسلم کتاب الادب، باب فی الشفقۃ علی الخلق)

اس کے علاوہ آپ نے مردوں اور عورتوں سے جو اسلام کی بیعت لی ان میں یہ عہد بھی لیا کہ وہ اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔ فتح مکہ کے روز جب لوگ جوق در جوق بیعت کر رہے تھے تو آپ نے خاص طور پر عورتوں سے یہی عہد لیا۔ عید کے اجتماعات میں آپ نے عورتوں سے یہی عہد و میثاق لیا۔ دوسرے موقعوں پر جب خواتین اسلام خدمت اقدس میں حاضر ہوتیں تب بھی آپ ان سے دیگر عہدوں کے علاوہ یہ عہد بھی لیا کرتے تھے۔ بیعت عقبہ کے موقعہ پر جب آپ نے قبیلۂ انصار سے پہلا عہد لیا تو ان میں یہ عہد بھی شامل تھا۔[۱]

---

[۱] دیکھیئے صحیح بخاری صفحہ ۷۲۶ ج ۲ تفسیر سورۂ ممتحنہ و صحیح مسلم باب بیعت النساء۔ و صحیح بخاری صفحہ ۱۳۲ ج ۱ باب موعظۃ الامام النساء یوم العید، و ترمذی، نسائی و ابن ماجۃ باب مصافحۃ النساء و مسند امام احمد حدیث امیمہ بنت رقیقہ و سلمیٰ بنت قیس و تفسیر ابن کثیر صفحہ ۱۴۴ ج ۹ برحاشیہ فتح البیان بحوالہ ابن ابی حاتم و مستدرک حاکم صفحہ ۶۲۴ ج ۲ علی شرط مسلم۔

ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآن کریم کی ایک مختصر ترین آیت نے عربوں کی تمام قساوتوں، تمام سنگدلیوں، اور تمام سفاکیوں کو یکدم مٹا ڈالنے میں وہ کام کیا کہ آج بڑی بڑی تصنیفات، اقوام متحدہ کی بڑی بڑی قرار دادیں، قوموں اور ملکوں کے تمام دساتیر و قوانین نہیں کر سکتے۔ ذرا ذہن میں اس نقشہ کو لائیے کہ مردے اپنی اپنی قبروں سے اُٹھ کر میدانِ حشر میں جمع ہیں، حساب وکتاب ہو رہا ہے، اعمال نامے تُل رہے ہیں۔ میزانِ عدل لگی ہوئی ہے۔ دانائے غیب وحضور، قاضی الحاجات والخصومات اپنی کرسئ عدالت پر جلوہ افروز ہے۔ غضب الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت سے جھلسے ڈال رہا ہے۔ کسی بڑے سے بڑے پیغمبر اور رسول کو لب کشائی کی جرأت نہیں ہو رہی۔ سب مخلوق کے حواس گم ہیں۔ نہ ماں باپ کو اولاد کی، نہ اولاد کو ماں باپ کی نہ بیوی کو شوہر کی نہ شوہر کو بیوی کی خبر لینے کا ہوش ہے، دودھ پلانے والی ماں کو اپنے بچہ کا ہوش نہیں، حاملہ عورتیں اس منظر کی دہشت سے اپنے حمل ضائع کر رہی ہیں۔ پوری مخلوق حواس باختہ ہے، نہ نشہ ہے نہ خمار مگر حواس بالکل غائب ہیں۔ یہ منظر ہے کہ ایک طرف سے ننھی ننھی بے زبان معصوم بچیاں خون سے لت پت بارگاہِ الٰہی میں پیش ہو کر فریاد کرتی ہیں۔ شہنشاہِ جلال وجبروت اپنی پوری قہاری سے سوال فرماتے ہیں کہ اے ننھی منی معصوم جانو! تمہیں کس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا۔

وَاِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ

قُتِلَتْ ۝ (۸۱/۸-۹)

اور تصور کرو جب زندہ درگور لڑکیوں سے پوچھا
جائے گا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی تھیں۔

خیال فرمائیے کتنا مؤثر اور بلیغ انداز بیان ہے۔ اس کا یہ اثر تھا کہ صدہا سال کی رواج یافتہ رسم پورے عرب سے ختم ہوگئی جتنی کہ پوری دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ اور حالت یہ ہوگئی کہ اب وہی قوم بارگاہِ الٰہی میں یوں دعائیں مانگنے لگی۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا
وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ۔ (۲۵/۷۴)

اور (اللہ کے نیک بندے) وہ ہیں جو دعائیں مانگتے ہیں کہ
اے ہمارے پروردگار ہمارے ازواج (شوہر اور بیویوں)
سے اور ہماری اولاد و ذریت (لڑکے اور لڑکیوں) سے
ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان فرما دے۔

آیت کریمہ بالا میں ذُرِّیّت میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو آنکھوں کی ٹھنڈک بتایا گیا ہے۔ لڑکوں کو کسی قسم کی ترجیح نہیں دی گئی۔ چنانچہ عربوں میں لڑکیوں کی عظمت و وقار میں اتنا اضافہ ہوا کہ ایک بدوی شاعر کو طنزاً یہ کہنا پڑا ؎

غَدَا النَّاسُ مُذْ قَامَ النَّبِيُّ الْجَوَارِيَا

جب سے پیغمبر اسلام کی بعثت ہوئی ہے ہر جگہ لڑکیاں
ہی لڑکیاں نظر آتی ہیں۔

رضاعت و حضانت

قرآن کریم نے بچوں کو دودھ پلانے کی ذمہ داری ماں پر ڈالی ہے اور بچوں کو اگر مائیں دودھ نہ پلا سکیں تو دوسری کسی عورت سے بچوں کا باپ انہیں دودھ پلوائے۔ اگر بچہ کی ماں کو طلاق دی جا چکی ہے تو ماں بچوں کو دودھ پلائے گی اور اس کے تمام اخراجات کی کفالت باپ پر ہو گی۔ اسی طرح بچوں کے دوسرے تمام اخراجات کا کفیل بھی باپ ہو گا۔ رضاعت و حضانت کے دونوں ابواب فقہ القرآن جلد دوم میں آ چکے ہیں۔ ان کو وہاں دیکھ لیں۔ البتہ یہاں ایک نکتہ پر غور فرماتے چلیں کہ اسلام ہی دنیا کا وہ پہلا مذہب اور دین ہے جس نے بچوں کی پرورش اور غور و پرداخت کو خاص اہمیت دی ہے۔ حتیٰ کہ شیر خوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ اگر کوئی دوسری عورت بچہ کو دودھ پلا دے اور بچہ کی زندگی کا سہارا بن جائے تو قرآن کریم نے اس کا درجہ ماں کے برابر قرار دیدیا ہے اور اس کی اولاد کو بچہ کے بہن بھائی قرار دے کر ان سے مناکحت کے رشتہ کو حرام قرار دیدیا ہے۔

سورۂ نساء میں ہے:

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ ۔

(۴/۲۳)

اور وہ مائیں بھی تم پر حرام ہیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو اور دودھ شریک بہنیں بھی۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں ننھے منے

بچوں کی نشوونما اور پرورش کی اتنی اہمیت اور عزت و حرمت ہے کہ اس کی وجہ سے غیر بھی حقیقی رشتہ داروں کی طرح قریبی عزیز بن جاتے ہیں۔

تعلیم و تربیت

ظاہری اور جسمانی نشوونما کے بعد اولاد کی باطنی، اخلاقی اور روحانی تربیت و تزکیہ کا درجہ ہے۔ قرآن کریم نے اسے بھی بڑی اہمیت دی ہے۔ اولاد کے اس ضروری حق کا بیان قرآن کریم نے نہایت ہی جامع انداز سے چند فقروں میں ادا کر دیا ہے جس کی تفصیل و تشریح میں ہمارے علمائے کرام نے دفتر کے دفتر لکھ دیئے ہیں۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ۔ (٦٦/٦)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اپنے نفسوں کو اور اپنی آل و اولاد کو جہنم کی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسانوں اور پتھروں کو بننا ہے۔

قرآن کریم نے اپنی اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچانے کی ذمہ داری سربراہِ خانہ کی ذمہ داری قرار دی ہے۔ یہ آگ جہنم کی آگ ہے جس سے مقصود ان تمام برائیوں، خرابیوں، بداخلاقیوں اور ہلاکتوں سے ان کی حفاظت کرنا ہے۔ کیونکہ ان سب کا آخری نتیجہ بالآخر دوزخ کی آگ کا مستحق بناتا ہے۔ اس طرح گھر کے ذمہ دار اور سربراہ پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دینی و دنیاوی تعلیم

اور نگہداشت کا فریضہ عائد کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف و توصیف فرمائی ہے جو اپنی اولاد اور بیوی بچوں کے حسنِ عمل اور خوبیٔ کردار کی تمنائیں اور آرزوئیں اپنے دلوں میں رکھتے ہیں اور اسی لئے بارگاہِ الٰہی میں اپنی ان تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں کہ بارالٰہا تو ان کو ظاہر و باطن کے حسنِ صورت و خوبیٔ سیرت اور دین و دنیا کی بھلائی اور خیر و صلاح عطا فرما کہ ان سے میری آنکھوں کی ٹھنڈک حاصل ہو سکے۔ (۲۵/۴) (آیت مذکورہ اوپر گذر چکی ہے)۔ نیز وہ بارگاہِ الٰہی میں ہر وقت یوں دست بدعا رہتے ہیں۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰہُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ (۴۶/۱۵)

اے میرے پروردگار! مجھے اپنے انعامات کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما جو تو نے مجھ پر فرمائے ہیں اور میرے والدین پر فرمائے ہیں اور مجھے اعمال صالحہ کی توفیق دے جنہیں تو پسند فرماتا ہے اور میرے لئے میری اولاد میں صلاحیت بخش اور میں تیری ہی طرف رجوع ہوتا ہوں اور میں تیرے مطیع اور فرماں برداروں میں سے ہوں۔

ظاہر ہے کہ آدمی دعاؤں اور اپنی تمناؤں کا اظہار اس وقت کرتا ہے جب وہ آرزوئیں اور تمنائیں اس کے دل میں گھر کی ہوئی ہوں۔ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہم کسی سے کوئی چیز خواہ مخواہ

مانگیں اور اس کے کوئی خواہش ہمارے دلوں میں نہ ہو۔ یا ہم خدا سے دعا، تو مانگیں اپنی شکم سیری کی۔ مگر گھر میں جو رزق موجود ہو اسے آگ میں جھونک کر تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوتے ہوں جب ہم حق تعالیٰ سے یہ دعائیں کرتے ہیں کہ اے اللہ! میری اولاد کو نیک اور صالح بنا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہماری تمنا اور خواہش ہے کہ ہماری اولاد صلاحیت بخش کام کرے اور ہم اس کیلئے کوشش بھی کرتے ہیں اور حق تعالیٰ سے اپنی اس کوشش میں امداد چاہتے ہیں کہ وہ ہماری ان کوششوں کو بار آور کرے۔

علاوہ ازیں قرآن کریم کا یہ خاص انداز بیان ہے کہ وہ خبر کے صیغے استعمال کرتا ہے لیکن ان سے مراد حکم دینا ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں ہم اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم کا ایک مقصد ان آیات سے یہ تعلیم دینا بھی ہے کہ اے مسلمانو! ہماری بارگاہ میں اس طرح دعائیں مانگا کرو۔ اور جب یوں دعائیں مانگو تو اس کے مطابق اپنے دلوں میں اس کی تمنائیں بھی رکھو اور اس کے لئے کوشش بھی کرو۔ کیونکہ ایسا تو کبھی نہیں ہوتا کہ تم دوسروں سے کسی کے ساتھ بھلائی کی درخواستیں کرو اور خود اسی کے ساتھ برائیاں کرنے پر تلے رہو۔

عدم امتیاز اولاد میں کسی قسم کا امتیاز برتنا۔ یعنی خوراک لباس اور دیگر ضروریات میں مثلاً لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دینا یا کسی خاص بیٹے کے ساتھ امتیازی سلوک کرنا بھی غیر اسلامی فعل ہے۔ قرآن کریم نے والدین پر جو اولاد

کے حقوق بتائے ہیں، ان میں اس نے لڑکوں اور لڑکیوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا۔ ذُرِّیّت کا لفظ اور اَھْلِیْکُمْ کا لفظ جیسا کہ لڑکوں کے لئے بولا جاتا ہے ایسے ہی لڑکیوں کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس کے لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے۔ نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو حق تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائیں گے۔ (سنن ابو داؤد۔ کتاب الادب، باب من عال یتیماً۔)

اسلامی شریعت میں دیگر دساتیر کے خلاف لڑکوں میں بھی باہم امتیاز برتنا اور چھوٹے، بڑے بیٹوں میں فرق وا متیاز کرنا قرآن کے خلاف ہے۔ اسلام میں بڑے اور پہلوٹے کے کچھ امتیازی حقوق نہیں۔ جبکہ دنیا میں اکثر شریعتوں اور بیشتر قومی قوانین میں یہ امتیاز رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم واضح طور پر بتا دیا ہے کہ:۔

یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ (۴/۱۱)

اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت فرماتا ہے (چھوٹا ہو یا بڑا) مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہوگا۔

اور:۔

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا ○

(۴/۷)

جو کچھ والدین اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ مریں اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور ایسے ہی عورتوں کا بھی حصہ ہے۔ تھوڑا ہو یا بہت۔ ایک مقرر حصہ ہے۔

پہلوٹے اور بڑے بیٹے اور دیگر بیٹوں میں قرآن نے کوئی فرق نہیں کیا۔ چنانچہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلا وجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسروں کو نہ ملا ہو تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے ظلم سے تعبیر فرمایا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے اپنے لڑکوں میں سے ایک خاص بیٹے کو ایک غلام ہبہ کیا اور چاہا کہ اس پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہو جائے۔ انہوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا تم نے اپنے سب بیٹوں کو ایک ایک غلام دیدیا ہے؟ انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ نہیں اے رسول اللہ؛ آپ نے فرمایا کہ میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہیں بن سکتا۔

(ابوداؤد، کتاب البیوع، باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل)

اس سے اس قانون کی اصلاح ہو گئی جو اسرائیلیوں، رومیوں ہندوؤں اور دوسری قدیم قوموں میں صدیوں سے رائج چلا آرہا تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا بیٹا جائداد کا مالک تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کا ترجیحی حق ہوتا ہے چھوٹا ہو یا بڑا سب ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں اور بیٹے ہونے کی حیثیت سے سب کو اپنے باپ سے یکساں تعلق ہے تو جو چھوٹے ہیں ان کی حق تلفی کیوں کی جائے

کیا چھوٹا ہونا ان کا کوئی جرم ہے؟

حقوق الزوجین

ہم نے کتاب النکاح (فقہ القرآن جلد اول) میں تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ معاہدۂ ازدواج کا مقصد کیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے تین مقصد بتائے ہیں۔

(اوّل) باہمی مودّت اور سکون و اطمینان کا حصول۔

سورۂ روم میں ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً

(۳۰/۲۱)

اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بات ہے کہ اس نے خود تمہارے نفسوں ہی سے تمہارے جوڑے پیدا کئے ہیں تاکہ تمہیں ان کی طرف سکون و اطمینان حاصل ہو سکے اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی ہے۔

اس کے علاوہ سورۂ اعراف میں ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (۷/۱۸۹)

اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنا دیا تاکہ اسے اس کی طرف سکون و اطمینان

حاصل ہو سکے۔

اور سورۂ بقرۃ میں ہے:۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط (۲/۱۸۷)

وہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

بہر حال پہلا مقصدِ ازدواج تو یہ ہے کہ ایک کی دوسرے سے تکمیل ہو۔ جو کمزوریاں ایک میں ہیں ان کی تلافی دوسرے کی صلاحیتوں سے ہو جائے اور آپس میں مودّت اور رحمت پیدا ہو اور ایک کو دوسرے سے سکون و اطمینان حاصل ہو سکے (تفصیل ان مباحث کی جلد اوّل میں گذر چکی ہے)۔

(دوم) دوسرا مقصدِ ازدواج اخلاق اور عفت و عصمت کی حفاظت ہے۔ تاکہ ایک کو دوسرے سے حفاظت حاصل ہو سکے۔ عورت مرد کو بے راہ روی سے بچا سکے اور مرد عورت کو لغزشوں سے محفوظ رکھ سکے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے احصان کا لفظ اختیار کیا ہے۔ کہ ایک دوسرے سے مل کر قلعہ بند ہو جاتا ہے اور حصار عافیت میں آجاتا ہے۔ شادی کر لینے کے بعد مردِ محصن (قلعہ بند) ہو جاتا ہے اور عورت بھی محصنہ (قلعہ بند) ہو جاتی ہے۔ چونکہ جنسی جذبہ ایک فطری جذبہ ہے جس کی تسکین ضروری ہے۔ اگر اس کی تسکین کے لئے کوئی جائز راستہ نہیں ہوگا تو لامحالہ مرد بھی اور عورت بھی اس جذبہ کی تسکین کے لئے ناجائز راہیں تلاش کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

(سوم) تیسرا مقصدِ ازدواج افزائش نسل ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہے:۔

فَالْئٰنَ بَاشِرُوْھُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ط

(۳/۱۸۷)

تو اب تم اپنی بیویوں کے پاس جاؤ اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے مقدر کر دیا ہے (یعنی اولاد) اسے طلب کرو۔

ازدواج کے یہ تین موٹے موٹے بڑے مقصد ہیں۔ نکاح سے لامحالہ یہ مقاصد حاصل ہونے چاہئیں۔

اسلام نے ازدواجی زندگی کے لئے جو ہدایات دی ہیں ان سب میں انہی مقاصد کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ زوجین ایک دوسرے کے ساتھ رہیں تو صلح و آشتی، مودت و رحمت، دلجمعی اور یکجہتی کے ساتھ رہیں۔ ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں اور آپس کے تعلقات میں فیاضانہ برتاؤ کو ملحوظ خاطر رکھیں۔

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ط (۲/۲۳۷)

اور اپنے درمیان فیاضی کے برتاؤ کو فراموش نہ کرو۔

اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو ان کی یکجائی بے مقصد اور بے سود ہے۔ مودت و رحمت کی روح نکل جانے کے بعد وہ ایک بے جان لاشہ ہے۔ جسے اگر دفن نہ کر دیا گیا تو وہ سارے معاشرہ کو عفونت سے بھر دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بار بار۔

فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ط

(۲/۲۲۹)

یا تو دستور کے مطابق (خوش اسلوبی سے) روک لینا ہے یا

حسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔

پر زور دیا ہے۔ رکھنا ہے تو خوش اسلوبی کے ساتھ رکھو، رخصت کر دینا ہے تو حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرو۔

یہی وجہ ہے کہ مشرکین کے ساتھ رشتۂ ازدواج قائم کرنے کی قرآن کریم نے اجازت نہیں دی۔ کیونکہ ایک مسلمان اور ایک مشرک کے نظریۂ حیات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ اگرچہ قرآن کریم نے اس تعلق کی اجازت دی ہے لیکن پسند اسے بھی نہیں کیا۔ قرآن کریم نے اس کی ترغیب کہیں نہیں دی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اسے ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی مسئلہ کفارت کو بھی اسلام نے غیر اہم قرار نہیں دیا۔ اگر غیر کفو میں نکاح کرنے سے سکون واطمینان اور مودت ورحمت حاصل نہ ہوسکے تو اس سے احتراز ہی کرنا چاہیئے (ان مسائل پر ہم "فقہ القرآن" جلد اول اور جلد دوم میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں)۔

قَوَّامُ گھر کا نظم ونسق قائم رکھنے کے لئے نیز مرد کو بیوی بچوں کے نفقہ کا ذمہ دار قرار دینے کے لئے شوہر کو گھر کا قَوَّامُ فرمایا گیا ہے ورنہ حقوق وفرائض کے اعتبار سے مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہے :-

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط (۲/۲۲۸)

اور عورتوں کے حقوق ایسے ہی ہیں جیسے ان کے فرائض (مردوں کے حقوق کے بارے میں) ہوتے ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک گونہ برتری حاصل ہے۔

اس کی تفسیر سورۂ نساء کی اس آیت میں فرما دی گئی ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ

(۴/۳۴)

مرد عورتوں کے اخراجات کے کفیل اور ذمہ دار ہیں کیونکہ اللہ نے (سب انسانوں کو قوت اور صلاحیت میں یکساں نہیں بنایا) بعض انسانوں کو دوسرے بعض انسانوں پر (مختلف صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک دوسرے پر برتری دی ہے اور کیونکہ وہی اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔

خانگی زندگی کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لئے بہر حال زوجین میں سے ایک کا صاحب امر اور سربراہِ خانہ ہونا ضروری تھا۔ اگر دونوں مختار مطلق اور مساویانہ اختیارات کے حامل ہوں تو گھر میں بدنظمی کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ مرد ہی چونکہ بیوی بچوں کے اخراجات کا ذمہ دار اور کفیل ہوتا ہے اس لئے اسلام نے جو ایک فطری مذہب ہے مرد ہی کو گھر کا سربراہ (HEAD OF THE FAMILY) مقرر کیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو مسلمانوں کے گھر بھی اسی بدنظمی کا شکار ہو جاتے جیسا کہ یورپین ممالک میں مساواتِ مزعومہ کے نتیجہ میں ہو رہے ہیں۔

مہر اسی قوامیت کے نتیجہ میں پہلا فریضہ جو مرد پر عائد ہوتا ہے وہ عورت کو مہر کا ادا کرنا ہے جو خالصۃً ایک تحفہ اور ہدیہ ہے جو عورت کی کسی خدمت کا معاوضہ نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اسے بالکل واضح کر دیا ہے۔

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ (۴/۴)

اور عورتوں کو ان کے مہر بطور عطیہ بے معاوضہ کے دو۔

اس عطیہ کو دینا جو کسی بھی خدمت کا معاوضہ نہیں ہوتا فریضۂ الٰہی ہے جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ (۴/۲۴)

اور عورتوں کو ان کے مہر بطور فریضہ کے ادا کرو۔

مہر کے متعلق ہم جلد اول میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

نفقہ اکتساب رزق کی ذمہ داری عورت کی نہیں ہے۔ بلکہ مرد کی ذمہ داری ہے۔ گزشتہ آیت قرآنی میں اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (۴/۳۴) میں اسی کو بیان کیا گیا تھا کہ مرد ہی عورتوں کے معاشی کفیل اور ذمہ دار ہوتے ہیں (قَوَّامٌ پر تفصیلی بحث اسی جلد میں گذر چکی ہے) مرد کو قَوَّامٌ بنانے کی وجہ ہی یہ بتائی گئی ہے:۔

وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ

اس وجہ سے کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

بیوی کو اس کے مہر کی رقم ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ضروریاتِ زندگی کے لئے بھی اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شوہر

عورت کو نفقہ ادا نہ کرے تو عورت کو قانونی حق حاصل ہے کہ عدالت سے چارہ جوئی کر کے وہ شوہر کو نفقہ کی ادائیگی پر مجبور کرے۔
بصورت انکار یا بصورت عدم استطاعت عدالت اس کا نکاح فسخ کر سکتی ہے۔ لیکن نفقہ کی مقدار کا تعین عورت کی خواہشات پر مبنی نہیں ہے بلکہ مرد کی استطاعت کو دیکھا جائے گا۔ قرآن کریم نے اس کے بارہ میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا ہے عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مالدار آدمی پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ واجب ہے اور تنگدست آدمی پر اس کی وسعت کے مطابق۔ ایسا نہیں ہے کہ مفلس اور نادار آدمی سے وہ نفقہ ادا کرنے کو کہا جائے جو وہ ادا بھی نہ کر سکتا ہو۔

ظلم سے اجتناب

مرد کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی بیوی پر کوئی ظلم اور زیادتی نہ کرے۔ ظلم کی متعدد صورتیں ہیں۔ اول تو یہی کہ عورت کی اس کی ضروریات کے مطابق باوجود وسعت کے نفقہ نہ دیا جائے۔ یا اس میں تنگی کی جائے اسے اپنے ماں باپ، بھائی بہن اور دیگر رشتہ داروں سے ملنے نہ دیا جائے۔ وہ اگر اس قابل ہے کہ کچھ کما سکے اور اپنی آمدنی سے اپنے رشتہ داروں کی مدد کر سکے تو اسے اس کی اجازت نہ دی جائے اگر ملک میں ہنگامی حالات ہیں اور ملکی قانون نے ضرورتِ وقت کے ماتحت تعدد ازدواج کی اجازت دے رکھی ہے جس کے ماتحت کسی شخص نے دوسری شادی کر لی ہے تو مثلاً دوسری بیوی کے ساتھ وہ ترجیحی سلوک کرے اور اس غریب کو درمیان میں لٹکی

ہوئی چھوڑ دے (فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ) یا اس کی جنسی خواہشات کی تکمیل سے پہلوتہی کی جائے جس سے اندیشہ ہو کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے دیگر ناجائز راستے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے (اس کی بحث ایلاء کے باب میں گذر چکی ہے) ایلاء کی بحث میں ہم نے بتایا تھا کہ قرآن کریم نے ایلاء (پاس نہ جانے کی قسم کھا لینا) کے سلسلہ میں یہ حکم دیا ہے کہ چار مہینے کی مہلت شوہر کو دی جا سکتی ہے اس مدت میں یا تو وہ قسم کا کفارہ ادا کر کے اس ظلم کی تلافی کرے ورنہ وہ اسے طلاق دیدے۔ ہم نے وہاں یہ بھی بتایا تھا کہ قسم کھا کر ایسا کرنے اور بغیر قسم کھائے ایسا کرنے میں ہمارے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے کہ قسم کھا کر کوئی یہ بے انصافی کرے تو اسے بے انصافی کہا جائے اور بغیر قسم کھائے اگر کوئی ایسا کرے تو اسے بے انصافی نہ کہا جائے۔ اس سلسلہ میں ہم نے فقہائے مالکیہ کے قول کو ترجیح دی تھی کہ اگر شوہر بیوی کو تکلیف دینے کی نیت سے اس کے پاس آنا جانا ترک کر دے تو اس پر بھی ایلاء کا حکم لگایا جائے گا۔

ضرار و تعدی بیوی سے رغبت نہ ہو، وہ اسے رکھنا نہیں چاہتا مگر محض ستانے اور زیادتی کرنے کے لئے اسے طلاق بھی نہ دے یا طلاق دے کر پھر رجوع کر لے تاکہ وہ کہیں اور نکاح نہ کر سکے۔ قرآن کریم نے اسے سختی سے منع فرمایا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ

ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ
اللّٰهِ هُزُوًا ؗ (۲/۲۳۱)

اور بیویوں کو (رجوع کرکے) اس لئے نہ روکو کہ تم انہیں تکلیف پہنچانا چاہو تاکہ ان پر زیادتیاں کر سکو۔ جو ایسا کرے گا وہ خود اپنے نفس پر ہی ظلم کرے گا۔ اور اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بنالو۔

کہ قانون کے الفاظ کی آڑ میں قانون کی روح کو مجروح کر کے اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کی سبیلیں نکالنے کی کوشش کرو۔ ضرار اور تعدی کے الفاظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے نہایت وسیع ہیں۔ اس کی شکلیں مختلف طبقات میں مختلف ہو سکتی ہیں نچلے طبقہ کے آدمی گالم گلوچ، مار پیٹ کی صورت میں اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اونچے طبقہ کی مہذب سوسائٹی میں دوسرے طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ تذلیل و توہین، طرح طرح کے الزام لگانا، بدنام کرنا، قرآن کریم کے یہ الفاظ سب کو شامل ہیں۔

ازواج میں عدل نہ کرنا

عدل نہ کرنا ظلم میں داخل ہے جس کا بیان آچکا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت ہمارے معاشرہ میں زیادہ ہے۔ اس لئے اس کو ہم مستقل طور پر الگ بھی بیان کر رہے ہیں۔ کتاب النکاح (فقہ القرآن جلد اول) میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسلام تعدد ازدواج کا حامی نہیں ہے۔ لیکن ہنگامی حالات میں اس نے اس کی اجازت دی ہے لیکن اس اجازت کے ساتھ ہی اس نے یہ شرط لگا دی ہے کہ:۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ (۴/۳)

تو اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم (ایک سے زیادہ بیویوں میں) عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو یا اس پر اکتفا کرو جو تمہاری مِلکِ یمین ہو۔ یہ اس سے قریب تر ہے کہ تم حق سے تجاوز نہ کر سکو۔

یعنی ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے کہ:۔

فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ط

(۴/۱۲۹)

پس ایک بیوی کی طرف پوری طرح جھک نہ جاؤ کہ دوسری بیوی کو ادھر میں لٹکا ہوا چھوڑ دو۔

معاشی و معاشرتی معاملات میں سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنا ضروری ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ کام بہت ہی مشکل ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ط

(۴/۱۲۹)

زیادہ بیویوں میں تم عدل نہیں کر سکو گے خواہ تم اس کے کتنے ہی حریص کیوں نہ ہو۔

یعنی طبعی میلان، محبت اور دلچسپی وغیرہ میں تو عدل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ تو کم از کم معاشی اور معاشرتی اعتبار سے عدل کرنے کی کوشش کرو۔ واضح رہے کہ تعدد ازدواج کی

اجازت عام نہیں ہے۔ صرف ہنگامی حالات میں اس کی اجازت دی گئی اور اس میں عدل کی شرط لگی ہوئی ہے۔

مرد کے ظلم کی یہ وہ صورتیں ہیں جن میں قانون مداخلت کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ میاں بیوی میں باہمی تعلقات کے لحاظ سے بیشمار معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جو باہمی مودت و رحمت، اطمینان و سکون کے منافی ہوتے ہیں، ان میں اگرچہ قانون مداخلت نہیں کر سکتا تاہم قرآن کریم نے عام اخلاقی ہدایات دیدی ہیں کہ عورتوں کے ساتھ فیاضانہ اور شریفانہ سلوک کرنا ضروری ہے۔

عَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ○

(۴/۱۹)

ان کے ساتھ دستور کے مطابق ہی گذران کرو۔ تو اگر تم اُنہیں ناپسند بھی کرتے ہو تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کر رہے ہو اور اللہ نے اسی میں تمہارے لئے بہت سی بھلائیاں رکھدی ہوں۔

اور۔

فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ط

(۲/۲۲۹)

تو روکنا ہے (اپنے ساتھ رکھنا ہے) تو دستور کے مطابق روکنا ہوگا اور رخصت کر دینا ہے تو بھی حسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کرنا ہوگا۔

اور۔

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ط (۲/۲۳۷)

اور باہم فضل و احسان کرنے کو نہ بھولو۔

دن رات بھکا فصیحتی کے ساتھ زندگی گذارنا شریفوں کا کام نہیں ہے۔ اگر بیوی کو رکھنا ہے تو شریفانہ طور پر رکھو ورنہ اس غریب کو حسنِ سلوک ہی کے ساتھ رخصت کر دو۔ ظاہر ہے کہ ہر بات کے لئے قانون نہیں بنایا جا سکتا اور نہ ہر بات میں قانونی مداخلت ممکن ہے۔ انسانوں کی اپنی شرافت و نجابت کا بھی کچھ نہ کچھ تقاضا ہے۔ انسان کو انہیں بھی ادا کرنا چاہیئے۔

قرآن نے گھریلو نظم و نسق قائم رکھنے کے لئے شوہر کو قَوَّامٌ یعنی معاشی ذمہ دار اور گھر کا سربراہ (صدر) بنایا ہے۔ نظم و نسق جب ہی قائم رہ سکتا ہے کہ سربراہ کی اطاعت کی جائے۔ اس کی بات کو مانا جائے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب کہیں سفر کرو یعنی دو تین آدمی ساتھ سفر کریں تو وہ بھی اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیا کریں۔ زندگی کے سفر میں گھر وہ پہلا اجتماعی ادارہ ہے جس سے اجتماعیت کی ابتداء ہوتی ہے۔ لہٰذا گھر کے افراد کو جن میں بیوی سرِفہرست ہے اپنے امیر، سربراہ کی جائز اطاعت و فرماں پذیری کرنی چاہیئے۔

حفظ لِلغیب

چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ط (۴/۳۴)

تو نیک بیبیاں وہ ہوتی ہیں جو احکامِ الٰہی کی مطیع و فرماں بردار ہوتی، پیٹھ پیچھے (گھر کے ساز و سامان اور اپنی عفت و عصمت کی) حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔ اور اصل حفاظت تو اللہ ہی کی ہے۔

اس آیت کریمہ میں حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بڑا ہی جامع لفظ ہے اس میں ہر اس چیز کی حفاظت آجاتی ہے جو شوہر کی ہو۔ گھر کے ساز و سامان کی حفاظت، اس کے نطفے کی حفاظت۔ نسب کی حفاظت، عزت و آبرو کی حفاظت، اس کے رازوں کی حفاظت۔ سب چیزیں اس میں شامل ہیں۔ بہر حال بیوی کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ شوہر کی عدم موجودگی میں اس کے پورے گھر کی اور تمام ضروری امور کی محافظ و نگراں ہو۔

شوہر کی اطاعت

مذکورہ بالا آیت میں نیک بیبیوں کا پہلا وصف قٰنِتٰتٌ بتایا گیا ہے۔ یعنی وہ احکامِ الٰہی کی فرماں بردار اور مطیع ہوتی ہیں سرکش اور نافرمان نہیں ہوتیں۔ اس کی تفسیر حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمائی ہے اس میں یہ چند چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔

الا ان لکم علیٰ نسآئکم حقا ولنسآئکم علیکم حقا علیھن ان لا یوطئن فرشکم من تکرھون ولا یأذن فی بیوتکم لمن تکرھون الا وحقھن علیکم ان تحسنوا الیھن فی کسوتھن وطعامھن۔

(الترمذی عن عمرو ابن الاحوص رضؓ)

دیکھو تمہارا تمہاری بیویوں پر بھی حق ہے اور تمہاری بیویوں کا بھی تم پر حق ہے۔ ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر ان لوگوں کو نہ لٹائیں جنہیں تم پسند نہیں کرتے اور تمہارے گھروں میں ان لوگوں کو آنے کی اجازت نہ دیں جنہیں تم پسند نہیں کرتے اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کے لباس میں اور کھانے پینے میں حسنِ سلوک سے کام لو۔

دوسرا حق یہ ہے کہ شوہر کی جنسی خواہشات کو پورا کرنے میں ٹال مٹول سے کام نہ لے۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضرت صفوان بن معطلؓ کی بیوی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس شوہر کی شکایت لے کر آئیں کہ میں صلوٰۃ پڑھتی ہوں تو وہ مجھے ڈانٹ دیتے ہیں۔ میں روزہ رکھتی ہوں تو اسے تڑوا دیتے ہیں اور طلوع آفتاب تک سوتے رہتے ہیں۔ فجر کی صلوٰۃ قضا پڑھتے ہیں۔ وہاں صفوان بھی موجود تھے۔ آپؐ نے ان سے پوچھا تو انہوں نے عرض کیا کہ وہ اپنی صلوٰۃ میں دو دو (لمبی سورتیں پڑھتی ہے) میں نے اسے اس سے منع کیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ سب لوگوں کو ایک سورت کافی ہو جاتی ہے (دو دو سورتیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے) رہ گئی یہ بات کہ میں اس کے روزے تڑوا دیتا ہوں تو جب یہ روزے رکھنے شروع کرتی ہے تو روزے ہی رکھے چلی جاتی ہے اور میں جوان آدمی ہوں۔ زیادہ صبر نہیں کر سکتا تو حضورؐ نے فرمایا کہ کوئی عورت[1] شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ نہ رکھے۔ رہ گئی

[1] اسی طرح بیوی کی جنسی تسلی کرنا مردوں کا فرض ہے۔ اگر وہ اسی طرح مسلسل روزے

یہ بات کہ میں صبح کی صلوٰۃ قضا پڑھتا ہوں تو ہم ایسے گھر والے ہیں (جو محنت مزدوری کرتے ہیں) صبح سویرے نہیں اٹھ پاتے۔ تو حضورؐ نے فرمایا۔ اب آئندہ سویرے اٹھا کرو۔ اے صفوان۔ (ابو داؤد)

یہ غالباً اس زمانہ کی بات ہے جبکہ رات کو سونے کے بعد عورتوں سے مباشرت ممنوع تھی۔ سونے سے پہلے پہلے وقت کم ہوتا تھا۔ حضرت صفوان کی بیوی صلوٰۃ نفل پڑھتی تھیں تو لمبی لمبی سورتیں اور وہ بھی دو دو ہر رکعت میں پڑھتی تھیں۔ روزے رکھنے شروع کرتی تھیں تو روزوں پہ روزے رکھتی چلی جاتی تھیں۔ حضرات صحابہ کرامؓ کو عبادات کا انتہائی شوق تھا۔ یہی حال مردوں کا بھی تھا چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ایسی ہی شکایت ان کی بیوی نے فرمائی تھی۔ بہرحال مردوں اور عورتوں، دونوں کو جنس مخالف کے جذبات و خواہشات کا احترام کرنا چاہیئے۔

حضرات صحابہ اور صحابیات رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ عبادات کا ذوق و شوق اور زہد و ریاضت کا مبالغہ ہی تھا جس کی بناء پر مرد عورتوں کے اور عورتیں مردوں کے جذبات و خواہشات سے بے اعتنائی کے مرتکب ہوتے تھے۔ دینداری کا جذبہ عورتوں میں کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ زہد و ریاضت اور عبادت کا ذوق و شوق عورتوں میں کچھ زیادہ ہی تھا جو تقشف کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ حتیٰ کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمانا پڑا۔

اس کی بغیر اجازت رکھتا اور اس کی حق تلفی کرتا ہے تو یہ اس کے لئے بھی ممنوع ہے جیسا کہ ابن عمرؓ کی روایت سے واضح ہے۔

اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ کوئی مرد اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کردے تو وہ ذات جو آسمان میں ہے اس سے اس وقت تک ناراض رہتی ہے جب تک اس کا شوہر اس سے راضی نہ ہو جائے۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ جب کوئی عورت شوہر کے بستر کو چھوڑ کر راتیں گذارے تو فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں جبتک وہ اس سے باز نہ آجائے۔

(بخاری، مسلم، ابو داؤد عن ابی ہریرۃؓ)

آج کل بہت سی خواتین اپنے حسن وجمال کی حفاظت کے لئے اسی طرزِ عمل کی مرتکب ہوتی ہیں۔ شریعت کی نظر میں یہ عمل بھی قابل تعریف نہیں ہے۔ دونوں صنفوں کو صنف مخالف کے جذبات وخواہشات کا بہر حال احترام ضروری ہے۔ کیونکہ شادی کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ عورتوں میں کونسی عورت اچھی ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو عورت شوہر کا دل خوش کردے جب شوہر اسے دیکھے اور جب اسے کسی کام کو کہے تو اس کی فرماں برداری کرے اور اپنے نفس اور مال کے معاملہ میں اس کی مخالفت نہ کرے جو شوہر کو ناگوار گذرے۔

(نسائی عن ابی ہریرۃؓ)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک مؤمن آدمی کو اللہ کے تقویٰ کے بعد نیک بیوی سے بہتر کوئی خیر حاصل نہیں ہو سکتی کہ اگر

شوہر اسے کوئی بات کہے تو وہ اس کی فرمانبرداری کرے اور وہ اس کی طرف دیکھے تو اس کا دل باغ باغ ہو جائے اور اگر وہ اس کے بارے میں کوئی قسم کھا بیٹھے تو وہ اس کو پورا کر کے رہے اور اگر وہ کہیں چلا جائے تو وہ اس کے پس پشت بھی اپنے نفس کے بارے میں اس کی خیر خواہ رہے۔

(قزوینی عن ابی امامۃؓ وطبرانی اوسط عن ابی ہریرۃؓ)[1]

وعظ و نصیحت ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ مردوں یا عورتوں کی طرف سے بے اعتنائی اور نافرمانی کا صدور اس وجہ سے ہوتا ہے کہ بیوی شوہر کو اپنے سے کم تر سمجھتی ہے یا شوہر بیوی کو اپنے قابل نہیں سمجھتا اور وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس کو قرآن کریم نے نشُوز سے تعبیر فرمایا ہے (اس پر بحث کتاب الطلاق میں نشوز کے عنوان کے تحت فقہ القرآن جلد دوم صـ۱۸۵ـ پر گذر چکی ہے۔ وہاں دیکھ لیں) بہر حال اگر بیوی کی طرف سے نافرمانی اور بد سلوکی کا اندیشہ ہو تو شوہر کو چاہیئے کہ وہ بیوی کو نصیحت کرے، اُسے سمجھائے۔ اگر اس سے بات نہ بنے تو کچھ عرصہ اسے خوابگاہ میں تنہا چھوڑ دے اور اس سے بے تعلق ہو جائے۔ اگر وہ پھر بھی راہِ راست پر نہ آئے تو اسے معمولی سزا دی جا سکتی ہے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ

---

[1] اس باب کی روایات ہم نے جمع الفوائد صـ۲۷۶ـ تا صـ۲۷۹ـ جلد اول سے نقل کی ہیں۔ مطبوعہ مطبع خیریہ میرٹھ انڈیا۔

فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ۔ (۴/۳۴)

اور جن عورتوں سے بدسلوکی اور نافرمانی کا اندیشہ ہو تو
تم اُنہیں نصیحت کرو۔ اُنہیں خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ
دو اور معمولی طور پر جسمانی سزا دو۔

اس کی تفسیر خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمادی ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا تھا۔

"عورتوں کے بارے میں میری عمدہ وصیت کو یاد رکھو، وہ اپنی جوانی تم پر لٹا کر ادھیڑ ہو جاتی ہیں (حدیث میں عَوَانٌ کا لفظ آیا ہے اور عَوَانٌ کے معنے ادھیڑ کے ہوتے ہیں دیکھیے آیت ۲/۶۸) تمہیں اس صورت میں کہ وہ کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوں۔ اس سے زیادہ کا ان پر کوئی حق نہیں کہ اُنہیں خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دو۔ اور انہیں ایسی جسمانی سزا دو جو زیادہ اذیت رساں نہ ہو، پھر اگر وہ تمہاری فرماں برداری اختیار کرلیں تو ان پر زیادتی کی راہیں تلاش نہ کرو۔ دیکھو، تمہاری بیویوں پر تمہارے کچھ حقوق ہیں اور تمہاری بیویوں کے تم پر بھی کچھ حقوق ہیں۔ تو تمہارا حق بیویوں پر تو یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر ان آدمیوں کو براجمان نہ ہونے دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھروں میں ایسے لوگوں کو نہ آنے دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو۔ اور دیکھو، ان کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ ان کے لباس اور کھانے پینے میں حسن سلوک سے کام لو۔"

(اس روایت کو ترمذی نے عمرو ابن الاحوص رضؓ سے اور

بخاری و مسلم نے ابن عمرؓ سے بیان کیا ہے۔ جمع الفوائد کتاب الایمان احکام اللعان وذکرا لبیعۃ وغیر ذلک ج ۱ ص ۱۴۲)

اس روایت سے پوری وضاحت ہو جاتی ہے کہ آیت مذکورہ بالا میں نُشُوزَہُنَّ سے کیا مراد ہے۔؟ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا ہے کہ خوابگاہوں میں تنہا چھوڑنے اور معمولی جسمانی سزا دینے کا حق مردوں کو صرف اس وقت ہے جبکہ عورتوں کی طرف سے کھلی بے حیائی کا ارتکاب ہو رہا ہو۔ اس صورت کے علاوہ مردوں کو ان پر کسی زیادتی کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کی مزید وضاحت آپؐ نے آگے چل کر فرما دی ہے کہ مردوں کا حق عورتوں پر کیا ہے؟ وہ حق یہ ہے کہ ناپسندیدہ لوگوں کو تمہارے بستروں پر جگہ نہ دیں اور انہیں تمہارے گھروں میں نہ آنے دیں کیونکہ انہی باتوں سے شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں اور شوہر کے دل میں یہ اندیشے پیدا ہونے لگتے ہیں کہ بیوی کا تعلق کسی اور سے بھی ہے یا اسے کسی اور کی طرف رغبت ہے۔

اس آیت میں دوسری توجہ طلب بات یہ بھی ہے کہ یہاں خطاب میاں بیوی کو نہیں ہے بلکہ جماعت کو ہے۔ لہٰذا گھر کا بڑا بزرگ، خاندان کا سربراہ، حاکم وقت، باپ بھائی ______ سب ہی اس میں آجاتے ہیں کہ وہ اول عورت کو نصیحت کریں، اسے اس کے سونے کے کمرے میں تنہا چھوڑ دیں، ان باتوں سے اصلاح نہ ہو تو ایسی جسمانی سزا دیں جو اذیت رساں نہ ہو۔ بشرطیکہ معاملہ کھلی بے حیائی کا ہو۔

اللہ کے نیک بندوں اور بندیوں کی خواہش اور تمنا تو ہردم یہی ہوتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۞ (۲۵/۷۴)

اور اللہ کے (نیک) بندے تو ہر وقت یہی دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے جوڑوں (ازواج) سے اور ہماری اولاد سے ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان عطا فرما اور ہمیں متقی اور پرہیزگاروں کا پیشرو بنادے۔

بارگاہِ الٰہی میں آدمی انہی باتوں کی دعائیں مانگتا ہے جس کی اسے انتہائی خواہش اور قلبی تمنّا ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت یہی دعا کرتے ہیں یعنی اس کی شدید خواہش اور تمنّا رکھتے ہیں کہ اُنہیں اپنے جوڑوں سے یعنی مردوں کو اپنی بیویوں سے اور بیویوں کو اپنے شوہروں سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب ہو، نیز اپنی اولاد سے بھی ان کو مسرت و شادمانی حاصل ہو۔ تو ظاہر ہے کہ جب ہر جوڑے کی یہی آرزو اور تمنّا، یہی خواہش اور طلب ہوگی تو وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ تمام ذرائع بھی تلاش کریں گے جن سے ان کی مقصد برآری ہو سکے۔ وہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا احترام کریں گے۔ ایک دوسرے کو آرام

پہنچانے اور سکون و اطمینان پیدا کرنے کی سعی بھی کریں گے۔ اور اس طرح وہ اپنے گھر کو مسرت و شادمانی کا گہوارہ بنانے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ جب طرفین کی یہی خواہش اور یہی تمنا ہوگی تو باہمی اختلافات پیدا ہی نہیں ہوں گے اور وہ مسرت و شادمانی کے گہواروں میں ہمیشہ جھولتے رہیں گے۔ اور اس طرح باہمی تعلق استوار تر اور مستحکم تر ہوتا چلا جائے گا۔

شریعت مطہرہ کا منشا یہی ہے کہ تعلق اندواج میں کسی قسم کی کوئی تلخی اور شکایت پیدا نہ ہو تاکہ یہ تعلق طرفین کے لئے مودّت و رحمت، محبت و شفقت کا موجب بنے۔ لیکن اگر طرفین کی تمام کوششوں کے باوجود یہ تعلق باعث اطمینان و سکون نہیں بنتا۔ اور باہم ایسے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں جن کی خلیج کو پاٹنا ان کے بس کی بات نہیں رہی۔ وہ بجائے رحمت کے زحمت اور بجائے مودّت و محبت کے نفرت و خفارت بنتا جا رہا ہے تو وہ مسیحیت اور دیگر ادیان کی طرح اس رشتہ کو باندھے رکھنے پر اصرار نہیں کرتا۔ اگر وہ حدود الٰہی کو ادا نہیں کر سکتے۔ اگر وہ محبت و الفت کے ساتھ یکجا نہیں رہ سکتے تو اس رشتہ کو قطع کر دینا چاہیئے۔

طلاق

انسان جو کام بھی کرتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی غرض و غایت اور مقصد ہوا کرتا ہے۔ اگر اس کام سے وہ مقصد حاصل ہوتا ہے تو وہ اس کام کو جاری رکھتا ہے اور اگر وہ مقصد حاصل نہیں ہو رہا تو اسے ترک کر دیتا ہے۔ آپ کسی سے

معاہدہ کرتے ہیں کہ میں تمہارا فلاں کام کروں گا۔ اور اس کے معاوضہ میں دوسرا شخص مثلاً آپ کو ایک ہزار روپئے ماہوار تنخواہ دے گا۔ آپ اپنا مفوضہ کام انجام دیتے ہیں۔ لیکن دوسرا آدمی ایک ہزار روپئے تو کیا آپ کو ایک ہزار پیسے بھی نہیں دیتا۔ مہینے پر مہینے گذر جاتے ہیں آپ کو ایک پیسہ کی آمدنی نہیں ہوتی۔ آپ کے بیوی بچے ہیں۔ آپ کو ان کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری کرنی ہیں اس کے لئے آپ کو روپیہ کی ضرورت ہے۔ لیکن دوسرا شخص آپ کو آپ کی تنخواہ نہ آج دیتا ہے نہ کل۔ حتیٰ کہ چھ ماہ گذر جاتے ہیں۔ فرمائیے آپ اس معاہدہ کو قائم رکھیں گے یا اسے توڑ دیں گے۔ کچھ لوگ آپ کو مشورہ دیتے ہیں کہ لگی لگائی ملازمت کو نہ چھوڑنا چاہیئے۔ ملازمت چھوڑ کر بے کار ہو جاؤ گے۔ خبر نہیں کب تک دوسری ملازمت ملے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ "بیکار مباش کارے بکن"۔ میاں! بیکاری سے تو اچھا ہے کہ ایک حیلہ سے لگے ہوئے ہو۔ اس مشورہ پر آپ کان دھریں گے؟ آپ سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ آپ کا مقصد بیت اللہ پہنچ کر حج کرنا ہے۔ آپ چلے جا رہے ہیں۔ چلے جا رہے ہیں۔ لوگوں سے آپ پوچھتے ہیں کہ مجھے مکہ معظمہ جانا ہے۔ مگر مکہ معظمہ نہیں آرہا۔ لوگ آپ سے کہتے ہیں کہ ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

حضرت یہ راستہ تو ترکستان جاتا ہے۔ اس راہ پر چل کر آپ مکہ معظمہ نہیں پہنچ سکیں گے۔ فرمائیے آپ کیا کریں گے؟ کیا اس

غلط راہ پر چلتے جائیں گے یا اپنا راستہ تبدیل کر لیں گے ؟

معاہدۂ ازدواج کے بھی شریعت نے کچھ مقاصد متعین کئے ہیں۔ دیکھنا چاہیئے کہ اس معاہدہ سے وہ مقاصد حاصل ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ مقاصد حاصل ہو رہے ہیں تو معاہدہ بالکل صحیح ہے اور فائدہ مند ہے اسے باقی رہنا چاہیئے۔ لیکن اگر معاہدہ کے مقاصد ہی حاصل نہیں ہو رہے ہیں بلکہ ان مقاصد کے برعکس نتائج سامنے آرہے ہیں تو پھر یہی بہتر ہے کہ معاہدہ کو ختم کر دیا جائے۔

اسلام یہی چاہتا ہے کہ تعلق ازدواج کو امکانی حد تک مستحکم بنایا جائے اور جو دو فرد (مرد وزن) اس بندھن میں بندھ چکے ہیں وہ بندھے رہیں انہیں باہم ایک دوسرے سے وابستہ رہنے کی انتہائی کوشش کی جائے مگر جب ان کے درمیان محبت اور موافقت کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور رشتۂ ازدواج میں ان کے بندھے رہنے سے اس معاہدہ کے اصل مقاصد ہی فوت ہو رہے ہوں تو ان کو نفرت، کراہت، ناپسندیدگی اور جبر کے ساتھ ایک دوسرے سے چمٹے رہنے پر اصرار کرنا ان کے لئے اور پورے معاشرہ کے لئے نقصان کا باعث ہوگا۔ پھر تو یہی مناسب ہے کہ اس بندھن کو کھول دیا جائے۔

اس معاملہ میں اسلامی شریعت نے انسانی فطرت، تمدنی مصالح معاشرہ کے بہبود کے درمیان ایسا توازن قائم کیا ہے جس کی مثال دنیا کے دوسرے کسی قانون میں نہیں ملتی۔ ایک طرف وہ اس رشتہ

کے استحکام اور استواری پر زور دیتا ہے لیکن ایسا استحکام بھی نہیں جیساکہ ہندو مت اور عیسائیت میں ہے کہ طرفین کے لئے یہ رشتہ کتنی ہی شدید اذیت کا باعث کیوں نہ بن جائے مگر نجات کی کوئی صورت نہیں۔ دوسری طرف وہ علیحدگی کے راستوں کو کھولتا ہے۔ لیکن نہ اتنی آسانی کے ساتھ کہ وہ روس، امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی طرح اباحت کی سرحدوں سے مل جائے۔

اسلام نے علیحدگی کی تین صورتیں رکھی ہیں۔

(۱) مرد کی طرف سے طلاق۔

(۲) عورت کی طرف سے خلع۔

(۳) اور اگر کوئی فریق اس کے لئے آمادہ نہ ہو تو قاضی کی طرف سے طلاق یعنی فسخ۔

باہمی منازعت کی شکل میں اول باہم افہام و تفہیم سے کام لیا جائے۔ اس سے بھی کام نہ چلے تو خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دیا جائے اور اس طرح عملاً اپنی شدید ناگواری کا اظہار کیا جائے اس سے بھی بات نہ بنے تو عدالت سے رجوع کیا جائے اور وہ خاوند اور بیوی کے خاندانوں سے ایک ایک حَکم مقرر کر دے۔ وہ دونوں کے بیانات سنیں اور جس کی زیادتی ہو اسے سمجھائیں۔ قائل کریں۔ تاکہ وہ اپنی زیادتی سے باز آجائے۔ اگر یہ مرحلہ بھی ناکام رہے تو پھر وہ حاکم مجاز اور عدالت کو جس نے انہیں مقرر کیا تھا معاملہ کی پوری رپورٹ دیں۔ اور حاکم مجاز اپنے اختیارات سے کام لے کر زیادتی کرنے والے فریق کو مجبور کرے۔ اگر پھر بھی مقصد برآری

نہ ہو تو وہ مرد کی زیادتی کی صورت میں اسے مجبور کرے کہ وہ بیوی کو طلاق دیدے اور اس کا مہر اسے ادا کرے اور اگر زیادتی عورت کی ہو تو وہ اسے مجبور کرے کہ وہ خلع لے لے اور مہر کا کچھ حصہ شوہر کو واپس کرے۔ اگر فریقین اس پر بھی راضی نہ ہوں تو قاضی یعنی حاکم مجاز اپنے اختیارات سے کام لے اور نکاح کو فسخ کر دے۔ طلاق اور خلع کے ابواب میں اس کی پوری تفصیلات گذر چکی ہیں۔ اس لئے ہم تفصیلات سے گریز کرتے ہیں۔ تفصیلات متعلقہ ابواب میں دیکھ لی جائیں۔

یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ معاہدۂ نکاح کے نسخ کو خواہ وہ طلاق کی صورت میں ہو یا خلع کی صورت میں یا قضائے قاضی کی صورت میں اسلام نے پسند نہیں کیا۔ اسے اس نے "میثاق غلیظ" قرار دیا ہے۔ یعنی پختہ قسم کا معاہدہ۔ لہٰذا حتی الامکان اسے قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر اندیشہ ہو کہ باہم صلح و صفائی کا امکان ہی نہیں ہے۔ اور اگر اس تعلق کو قائم رکھا گیا تو طرفین ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کر سکیں گے اور وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو علیحدگی کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ ورنہ بقول آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے:-

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى اَلطَّلَاقُ۔

(ابوداؤد عن ابن عمرؓ)

اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔

اور۔

تَزَوَّجُوْا وَلَا تُطَلِّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ
الذَّوَّاقِیْنَ وَالذَّوَّاقَاتِ۔ (بزار وطبرانی کبیر واوسط)

شادیاں کرو۔ طلاقیں نہ دو، کیونکہ حق تعالیٰ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں فرماتا۔

یہ کوئی شریفانہ طرزِ عمل نہیں ہے۔ کہ ایک عورت یا ایک مرد نے جب ایک دوسرے کا مزہ چکھ لیا تو دوسری عورت یا دوسرے مرد کی تلاش شروع کر دی۔

عَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ کَرِھْتُمُوْھُنَّ
فَعَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّیَجْعَلَ اللّٰہُ فِیْہِ
خَیْرًا کَثِیْرًا ○ (۴/۱۹)

عورتوں کے ساتھ دستور کے مطابق (اچھی طرح) گذارہ کرو۔ تو اگر تم اُنہیں ناپسند ہی کرتے ہو تو ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کر رہے ہو لیکن اللہ نے اسی میں بڑی بہتری رکھ دی ہو۔

لیکن اگر مفاہمت کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے تو بدرجہ مجبوری دونوں علیحدہ ہو جاؤ۔ اور اللہ نے علیحدگی کا جو طریقہ (PROCEDURE) رکھا ہے اس کے مطابق الگ الگ ہو جاؤ۔

وجوہِ نزاع

اس کے متعلق کوئی قانون بنا دینا مشکل ہے کہ طلاق، خلع، یا قضائے قاضی سے تعلق ازدواج کو کن وجوہ سے توڑا جا سکتا ہے اور کن وجوہ سے نہیں

توڑا جا سکتا۔ انسانوں کی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض لوگ ایک عیب کو برداشت کر لیتے ہیں اور بعض لوگ برداشت نہیں کر سکتے۔ دراصل اس کا مدار ان ہی تین مقاصد پر رکھنا چاہیئے جو قرآن کریم نے ازدواج کے گنائے ہیں۔ سب سے اول مقصد تو

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ
اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً
وَّرَحْمَةً ؕ (۳۰/۲۱)

اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بات ہے کہ اس نے خود تمہارے نفسوں سے تمہاری جوڑیاں پیدا کیں تاکہ تمہیں ان کی طرف سکون و آرام حاصل ہو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت و مہربانی پیدا کر دی۔

جن جوڑوں میں ایک کو دوسرے سے سکون، راحت، آرام اور اطمینان حاصل نہ ہو سکے اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ انہیں شادی سے جو مقصد تھا وہ حاصل نہیں ہو سکا۔ اس کی وجوہ مختلف ہو سکتی ہیں۔ جسمانی عیوب بھی ہو سکتے ہیں۔ اخلاقی عیوب بھی ہو سکتے ہیں۔ کان، ناک، آنکھ، ہاتھ، پاؤں، زبان میں کوئی عیب ہو۔ کان کٹا ہوا ہو، ناک کٹی ہوئی ہو۔ آنکھ میں کوئی عیب ہو، بھینگا ہو یا کانا ہو، لونجا ہو، لنگڑا ہو، گونگا ہو یا عورت میں اس قسم کے عیوب ہوں۔ اور فریق مقابل اس عیب کو برداشت نہ کر سکے تو ان کو جدائی کا حق دینا چاہیئے۔ یہ عیب مرد میں بھی ہو سکتے ہیں اور عورت میں بھی ہو سکتے ہیں۔ گندہ ذہن

ہونا۔ آدمی کے پسینہ میں ناقابلِ برداشت بو ہونا بھی اسی میں شامل ہے۔ اور اس کے علاوہ مزید عیوب بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً پیٹ بڑا ہونا۔ ٹانگیں چھوٹی چھوٹی ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی مرد یا عورت کو یہ جسمانی عیوب اس قدر ناپسندیدہ ہوں کہ وہ ان کو برداشت نہ کر سکے اور اس کی وجہ سے وہ فریقِ ثانی کے حقوق کو ادا نہ کر سکے یعنی اللہ کی حدود کو قائم نہ کر سکے تو اسے علیحدگی اختیار کر لینے کی اجازت دینی ہوگی۔ البتہ اجازت دینے سے پہلے انہیں سمجھانا بجھانا۔ نصیحت و فضیحت کرنا ضروری ہے۔ دونوں طرف سے خاندانی حَکَم مقرر کرنا ضروری ہے اس کے بعد حاکم مجاز بھی اپنے اختیار و اقتدار سے کام لے کہ ہر ممکن حد تک اُنہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کرے لیکن اگر کامیابی کی کوئی صورت نہ نکل سکے تو علیحدگی کی اجازت دیدینی چاہیئے۔ قرآن کریم نے :-

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ ۔ (۲/۲۲۹)

اے جماعتِ مؤمنین! تو اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو میاں بیوی پر کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ عورت کچھ (فدیہ) دے دلا کر اپنی جان چھڑا لے۔

عورت کے لئے یہ سہولت قرآن نے دی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سہولت صرف عورتوں ہی کے لئے ہے۔ مردوں کے لئے یہ سہولت نہیں ہے۔ بعینہٖ یہی سہولت مردوں کے لئے بھی ہے۔

اگر مرد سمجھتا ہے کہ بیوی کے اس قسم کے عیوب کے ساتھ وہ گذارہ نہیں کرسکتا اور وہ ان کو برداشت نہیں کرسکتا یعنی حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکتا تو عدالت اسے بھی طلاق کی اجازت دے گی۔

یہی حال اخلاقی کمزوریوں کا بھی ہے۔ بعض اخلاقی کمزوریاں ایسی ہوتی ہیں جو فریق ثانی کے لئے قابل برداشت نہیں ہوتیں مثلاً بدزبان، جھگڑالو ہونا، گالیاں اور کوسنے دینے کی عادت ہونا۔ مارپیٹ کرتے رہنا، شرابی کبابی ہونا، چور ڈاکو ہونا وغیرہ وغیرہ۔ یہ نقائص مردوں میں بھی ہوسکتے ہیں اور عورتوں میں بھی ہوتے ہیں۔ بچوں کو مارنا پیٹنا، گالم گلوچ کرنا بعض عورتوں میں بھی ہوتا ہے اور مردوں میں بھی ہوتا ہے۔ بعض مرد عورتوں یعنی اپنی بیویوں تک پر ہاتھ اُٹھانے سے نہیں کتراتے۔ یہ سارے نقائص ایسے ہیں کہ ایک شریف مرد اور ایک شریف عورت کی برداشت سے باہر ہوتے ہیں۔ ان نقائص اور کمزوریوں کی وجہ سے ایک فریق کو دوسرے فریق سے کراہت اور نفرت ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔ لہٰذا مرد طلاق کا اور عورت خلع کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حضرت زینبؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو طلاق دینے کا ارادہ فرمایا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی تو انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی یہی شکایت فرمائی تھی کہ وہ تیز زبان ہیں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی تیز زبانی ظاہر ہے کہ گالم گلوچ اور کوسنے کاٹنے کی حد تک تو ہونے سے رہی وہ لامحالہ معمولی سے تیز زبانی ہی ہوگی جو بے ادلاد ہونے

اور جنسی ناآسودگی (روایات کے مطابق) کی وجہ سے عورتوں میں ایک طرح کے چڑچڑے پن کی صورت میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس شکایت پر حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ سے یہ نہیں فرمایا کہ تمہیں اس شکایت کی وجہ سے طلاق دینے کا حق نہیں ہے۔ بلکہ حاکم وقت اور ایک بزرگ خاندان کی حیثیت سے اُنہیں وہی نصیحت کی جو کرنی چاہیئے تھی کہ طلاق مت دو۔

اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ۔

اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو۔

حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اس کے باوجود طلاق دیدی اور آپؐ نے اس پر کوئی غصہ یا ناگواری ظاہر نہیں فرمائی کہ تم نے ایک ناجائز کام کیا ہے جس کا تمہیں حق نہیں تھا۔ اس سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی معمولی سی تیز زبانی طلاق کی وجہ جواز بن سکتی ہے تو جو کمزوریاں ہم نے گنائی ہیں وہ بدرجہ اولیٰ علیحدگی کی وجہ جواز ہونی چاہئیں۔ (قصہ زیدؓ و زینبؓ کی تفصیل کے لئے دوسری جلد ملاحظہ ہو)۔

بدصورتی آدمی کا بدصورت ہونا، اس کے جسم کا بے ڈول ہونا بھی خلع یا طلاق اور فسخ نکاح کی وجہ جواز بن سکتا ہے۔ چنانچہ صدرِ اول میں ہمیں اس کی نظائر ملتی ہیں۔

عبداللہ بن ابی ابن سلول کی بہن جمیلہؓ بنت ابی ابن سلول کا نکاح حضرت ثابتؓ بن قیس سے ہوا تھا۔ جمیلہؓ نہایت حسین عورت تھیں اور ثابتؓ بن قیس خوبصورت نہیں تھے۔ چنانچہ جمیلہؓ بنت ابی ابن

سلول نے بارگاہِ رسالت میں خلع کے لئے مرافعہ کیا۔ ابن جریر طبری نے ان کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔

"اے اللہ کے رسول میرے اور اس کے سر کو کبھی بھی کوئی چیز ایک جگہ جمع نہیں کر سکتی (یعنی اس کے ساتھ ایک بستر پر لیٹنا گوارہ نہیں کر سکتی) میں نے اپنا گھونگھٹ جو اُٹھایا تو وہ سامنے سے چند آدمیوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان سب سے زیادہ سیاہ فام اور سب سے زیادہ کوتاہ قد اور سب سے زیادہ بدصورت تھا۔" (ابن جریر طبری)

حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

"موطا امام مالکؒ میں ہے کہ حبیبہؓ بنت سہل انصاریہ حضرت ثابت ابن قیس ابن شماسؓ کی بیوی تھیں۔ آنحضرت ایک دن صبح کی نماز کے لئے اندھیرے میں نکلے تو دیکھا کہ دروازہ پر حضرت حبیبہؓ کھڑی ہیں۔ آپؐ نے پوچھا "کون ہے؟" کہا کہ "میں حبیبہؓ بنت سہل ہوں۔" فرمایا، کیا بات ہے؟" کہا "حضورؐ! میں ثابت ابن قیس کے گھر میں نہیں رہ سکتی۔ یا وہ نہیں یا میں نہیں۔" آپ سن کر خاموش رہے۔ جب حضرت ثابت آئے آپ نے فرمایا۔ تمہاری بیوی صاحبہ کچھ کہہ رہی ہیں۔" حضرت حبیبہؓ نے کہا۔ "حضورؐ! میرے خاوند نے مجھے جو کچھ دیا ہے وہ سب میرے پاس ہے اور میں اسے واپس کرنے پر آمادہ ہوں۔" آپ نے حضرت ثابتؓ سے فرمایا "سب لے لو۔" چنانچہ انہوں نے لے لیا اور حضرت حبیبہؓ آزاد ہو گئیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ثابتؓ نے انہیں مارا تھا اور اس مار سے ان کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ حضورؐ نے جب انہیں یہ فرمایا، اس وقت انہوں نے دریافت کیا کہ "کیا میں یہ مال لے سکتا ہوں؟" آپ نے فرمایا "ہاں"۔ کہا "میں نے اسے دو باغ دیئے ہیں، یہ واپس دلوا دیجیے" چنانچہ مہر کے وہ دونوں باغ واپس کئے گئے اور جدائی ہو گئی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حبیبہؓ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ:۔

"میں اس کے اخلاق اور دین داری میں کوئی عیب گیری نہیں کرتی۔ لیکن میں اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں" چنانچہ مال لے کر حضرت ثابتؓ نے طلاق دیدی۔ بعض روایات میں ان کا نام جمیلہ بھی آیا ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ "مجھے اب غیض و غضب کی برداشت کی طاقت نہیں رہی"۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا "جو دیا ہے وہ لے لو، زیادہ نہ لینا"۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت حبیبہؓ نے فرمایا تھا "وہ صورت میں بھی کچھ حسین نہیں"۔ ایک روایت میں ہے کہ یہ عبداللہ ابن ابی کی بہن تھیں۔ اور یہ سب سے پہلا خلع تھا جو اسلام میں ہوا۔ ایک وجہ یہ بھی بیان کی تھی کہ:۔

"حضرت میں نے ایک مرتبہ خیمہ کے پردہ کو جو اٹھایا تو دیکھا کہ میرے خاوند چند آدمیوں کے ساتھ آرہے ہیں۔ ان تمام میں وہ سیاہ فام چھوٹے قد والے اور بدصورت تھے"۔ حضورؐ کے اس فرمان پر کہ "اس کا باغ واپس کر دو"۔ حبیبہؓ نے کہا تھا کہ "آپ

فرمائیں تو میں کچھ اور بھی دینے کو تیار ہوں"۔ اور روایت میں ہے کہ حبیبہؓ نے یہ بھی کہا تھا کہ "حضور! اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو میں اس کے منہ پر تھوک دیا کرتی"۔

(تفسیر ابن کثیر ص۹۹ پارہ دوم مطبوعہ نور محمد آرام باغ کراچی)

مسند عبدالرزاق میں ہے کہ حضرت حبیبہؓ نے یہ کہا تھا کہ:

"اے اللہ کے رسول! میں جیسی خوبصورت ہوں وہ آپ دیکھ رہے ہیں اور ثابتؓ ایک بدصورت آدمی ہیں"۔ (بحوالہ فتح الباری)

معلوم ہوتا ہے ثابت ابن قیس کی دونوں بیویوں حبیبہؓ اور جمیلہؓ نے یکے بعد دیگرے ان سے خلع لیا ہے (یعنی یہ دونوں واقعے ایک ہی عورت کے نہیں ہیں)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک عورت اور مرد کا مقدمہ پیش ہوا۔ آپ نے عورت کو نصیحت کی اور شوہر کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیا۔ عورت نے قبول نہ کیا اس پر آپ نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا جس میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ تین دن قید رکھنے کے بعد آپ نے اسے نکالا اور پوچھا کہ کیسی گذری۔ اس نے کہا خدا کی قسم مجھ کو اپنی راتوں میں راحت نصیب ہوتی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر کو حکم دیا کہ "تیرا ناس ہو اسے خلع دیدے خواہ اس کی کان کی بالیوں کے عوض ہی میں کیوں نہ ہو۔

(ایضاً ابن کثیر بحوالہ مذکور و کشف الغمہ جلد دوم)

ان تمام روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے خلع کے مطالبہ کے لئے اس بات کو کافی سمجھا ہے کہ ان کا شوہر بدصورت ہے اور وہ انہیں پسند نہیں۔ آپ نے انہیں خوبصورتی اور بدصورتی کے فلسفے پر کوئی لیکچر نہیں دیا۔ چونکہ آپ کی نظر شریعت کے مقاصد پر تھی۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ بیوی کو شوہر پسند نہیں ہے اور وہ اس سے نفرت کرتی ہے تو چونکہ مودت و رحمت اور سکون و اطمینان کا حصول جو ازدواج کا اولین مقصد تھا اس کے حصول کی کوئی توقع نہیں رہی اس لئے آپ نے ان کی درخواست قبول فرمالی۔ کیونکہ نفرت و کراہت کے ساتھ ایک عورت کو شوہر کے دامن سے باندھے رکھنے سے دین، اخلاق۔ تمدن اور معاشرت کے لئے اس کے نتائج نہایت تباہ کن ہو سکتے تھے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ طلاق اور خلع کا حکم نافذ کرنے کے لئے محض اس بات کا ثابت ہوجانا کافی ہے کہ مرد اور عورت اپنے شوہر یا بیوی کو پسند نہیں کرتے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے۔ وہ فریق ثانی سے نفرت کرتے ہیں۔ نفرت و کراہت کے اسباب کا کھوج لگانا اور ان اسباب کے مناسب اور نامناسب ہونے کا فیصلہ کرنا قاضی کا کام نہیں ہے۔ عورت کو اپنے شوہر سے یا شوہر کو اپنی بیوی سے۔ بہت سے ایسے اسباب کی بنا پر نفرت ہو سکتی ہے جن کو کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یا اگر بیان کیا جائے تو سننے والا ان اسباب نفرت کو کافی نہ سمجھے۔ لیکن جسے ان اسباب سے رات دن سابقہ رہتا ہے وہ اس کے دل میں نفرت و حقارت

پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ لہٰذا قاضی کا کام صرف اس بات کی تحقیق کرنا ہے کہ عورت یا مرد کے دل میں فریق ثانی کے خلاف نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا اس کا کام نہیں کہ جو وجوہ وہ بیان کر رہے ہیں وہ معقول ہیں یا قابلِ قبول نہیں ہیں۔

قاضی عورت اور مرد کو وعظ و نصیحت کر کے ساتھ رہنے کا مشورہ تو دے سکتا ہے مگر ان کی مرضی کے خلاف اُنہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خلع اور طلاق عورت اور مرد کا حق ہے جو اللہ نے اور اللہ کی شریعت نے ان کو دیا ہے۔ اگر وہ اس امر کا اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ وہ فریق ثانی کے حقوق کو ادا نہیں کر سکیں گے اور اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو کسی کو ان کے اندیشہ کے غلط اور غیر معقول ثابت کرنے کا حق نہیں ہے اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کے معنے یہی تو ہوں گے کہ تو شوق سے اللہ کی حدود کو توڑتی رہ۔ شوہر کے حقوق تجھ سے ادا نہیں ہوتے ہیں تو کوئی حرج نہیں مگر تو اس شوہر کے دامن سے چمٹی رہ اور اس سے الگ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور ہی کس قدر غلط ہے۔

خلع کے مسئلہ میں یہ سوال کہ عورت آیا جائز ضرورت کی بنا پر خلع طلب کر رہی ہے یا محض نفسانی خواہشات کے ماتحت خلع کا مطالبہ کر رہی ہے قاضی یا جج کی دردسری نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین کے سامنے خلع کے جتنے مقدمات پیش ہوئے ہیں ان میں انہوں نے اس قسم کی تنقیحات پر کبھی زور

نہیں دیا۔ نہ کسی عورت سے اس کے مطالبہ کے جواز پر کوئی دلیل طلب کی۔ دراصل خلع عورت کا ایسا ہی قانونی حق ہے جیسا کہ مرد کا قانونی حق طلاق ہے۔ اگر مرد سے یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ طلاق کے جواز پر دلائل پیش کرو تو عورت سے یہ سوال کیسے کیا جا سکتا ہے؟

سوچنے کی بات ہے کہ عورت اگر خلع کا مطالبہ کرتی ہے تو دو صورتیں ہی ہو سکتی ہیں۔ یا تو اس کے پاس اس مطالبہ کے لئے جائز وجوہ موجود ہیں یا وہ محض خواہشات نفسانی کے ماتحت بلا کسی وجہ جواز کے ایسا مطالبہ کر رہی ہے۔ اگر اس کے پاس واقعی وجوہ جواز موجود ہیں تب تو قاضی کو اس کا مطالبہ تسلیم کرنا ہی چاہیئے اور اگر اس کے پاس اس کی کوئی وجہ جواز موجود نہیں ہے اور وہ محض خواہش نفسانی کے ماتحت ایسا کر رہی ہے کیونکہ اس کی بدفطرتی اور بدطینتی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ نئے سے نئے مردوں کے بڑے چکھتی پھرے تو اگر قاضی اس کے مطالبہ کو پورا نہیں کرتا تو گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ تو اپنی بدطینتی اور بدفطرتی کے تقاضے جائز طریقہ سے تو نہیں البتہ ناجائز طریقوں سے پورے کر۔ ایسا کرنا معاشرہ میں ایک شدید بگاڑ کو رواج دینے کی کوشش ہی کہا جائے گا۔

بڑی معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ عموماً خلع کی وجہ عورت کی جنسی ناآسودگی ہوا کرتی ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ برسرعدالت عورتیں اسے بیان نہیں کر سکتیں اور خود عدالت کے لئے بھی مناسب

نہیں ہے کہ وہ عورتوں سے اس قسم کی باتیں عدالت میں کہلوائے لہٰذا مناسب یہی ہے کہ عدالت ان تنقیحات میں اپنے آپ کو ڈالے ہی نہیں اس کا کام صرف یہ ہونا چاہیئے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ عورت اس شوہر کے ساتھ گذارہ نہیں کرسکتی۔ یہ بات خلع کا فیصلہ صادر کرنے کے لئے اس کے واسطے کافی ہے۔ دیگر باریکیوں میں اسے نہیں پڑنا چاہیئے۔

اگر عورت خلع کا مطالبہ کرے اور شوہر اس پر راضی نہ ہو تو عدالت اسے مجبور کرے کہ وہ طلاق دیدے اگر وہ پھر بھی طلاق نہ دے تو عدالت خود نکاح کو فسخ کردے۔ خلع کے جس قدر مقدمات حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے سامنے پیش ہوئے ان میں ان سب حضرات نے شوہر کو یہی حکم دیا ہے کہ تم بیوی سے کچھ مال لے کر اسے طلاق دیدو۔ شریعت میں قاضی کی حیثیت ایک مشیر کی نہیں ہے بلکہ حاکم کی ہے۔ وہ بزور اپنے حکم کو منوائے گا۔ ورنہ خود مداخلت کرکے فیصلہ دے دیگا۔

ہمارے ہاں جو یہ خیال کرلیا گیا ہے کہ خلع دینا یا نہ دینا قطعاً شوہر کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ چاہے تو خلع دے اور چاہے تو نہ دے سراسر قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ اسلام نے عورت اور مرد کے تعلق ازدواج کے درمیان نہایت ہی صحیح توازن قائم کیا تھا۔ لیکن ہم نے اپنی غلطی سے اس توازن کو درہم برہم کردیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے عورت سے عملاً خلع کے حق کو

سلب ہی کر لیا ہے اور خلع دینا یا نہ دینا بالکل مرد کی مرضی پر موقوف ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر کوئی عورت خلع حاصل کرنا چاہے اور مرد اپنی شرارت یا خود غرضی سے نہ دینا چاہے تو عورت بالکل لاچار ہو کر رہ گئی ہے۔ اسلام کا منشا یہ ہرگز نہیں تھا کہ معاہدۂ نکاح کے ایک فریق کو بالکل بے بس بنا کر اس کی قسمت دوسرے فریق کے ہاتھ میں دیدے۔

قرآن کریم نے جس آیت کریمہ میں خلع کا حکم بیان فرمایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ط (۲/۲۲۹)

ترجمہ:۔ اور (اے جماعت مسلمین!) اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو دونوں (یعنی زوجین) پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ (یعنی عورت) کچھ فدیہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔

اس آیت میں خود زوجین کا ذکر تو غائب کے صیغوں میں کیا گیا ہے۔ لہٰذا خِفْتُمْ (اگر تمہیں اندیشہ ہو) کے مخاطب زوجین تو نہیں ہو سکتے۔ اب لامحالہ یہ ماننا پڑے گا اس کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں۔ اور حکم الٰہی کا منشا یہ ہے کہ اگر خلع پر زوجین میں باہمی رضامندی حاصل نہ ہو تو اولوالامر کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے جو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین

کے سامنے خلع کے مطالبے لے کر خواتین کا آنا، آپ کا ان کی سماعت کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ جب زوجین کے درمیان خلع پر راضی نامہ نہ ہو سکے تو عورت عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی۔

اب اگر فی الواقع قاضی اس معاملہ میں صرف سماعت کا حق تو رکھتا ہو مگر مرد کے راضی نہ ہونے کی صورت میں اپنا فیصلہ اس سے منوانے کا اختیار و اقتدار نہ رکھتا ہو تو قاضی کو درمیان میں لانا ہی فضول ہے۔ کیونکہ اس کے پاس جانے کے بعد بھی نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہے گا۔ لیکن احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قاضی اس معاملہ میں بے اختیار نہیں ہے؟ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ نے اس سلسلہ میں جتنے فیصلے فرمائے ہیں ان سب میں بصیغۂ امر طَلِّقْهَا (اسے طلاق دیدو) فَارِقْهَا (اس سے الگ ہو جاؤ) خَلِّ سَبِيْلَهَا (اس کے لئے راستہ خالی کر دے) کے الفاظ آئے ہیں۔ بلکہ ابن جریر طبری نے ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا (پھر آپ نے ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی) اور یہی الفاظ اس روایت میں بھی آئے ہیں جو خود جمیلہؓ بنت ابی ابن سلول سے منقول ہے۔ اس کے بعد یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ قاضی یا جج خلع کے معاملہ میں شوہر کو مجبور کرنے یا خود اپنا حکم صادر کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

لہٰذا ہماری قطعی رائے ہے کہ عدالت اس سلسلہ میں مشیر کا کردار ادا نہیں کرے گی بلکہ وہ اپنے اقتدار و اختیار سے کام

لے کر شوہر کو مجبور کرے گی کہ وہ عورت کو خلع دے اور اگر اس کے باوجود شوہر عدالت کے حکم کو نہ مانے تو وہ خود اپنے اختیارات تمیزی سے کام لے کر زوجین کے درمیان تفریق کر دے۔

هذا ما رأيته، والله اعلم

(شوہر کی اجازت)

ہمارے فقہاء و علماء کا خیال ہے کہ بیوی پر اپنے شوہر کی اطاعت بھی فرض ہے۔ اسے کوئی فعل اس کی اجازت کے بغیر نہیں کرنا چاہیئے۔ حتیٰ کہ شوہر کی اجازت کے بغیر اسے گھر سے نکلنا بھی جائز نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رح فرماتے ہیں:-

"مردوں کو اپنی بیویوں کو گھر سے باہر جانے سے منع کرنے کا اختیار ایک ثابت شدہ بات ہے"

(فتح الباری ص ۲۳۶ ج ۲)

نیز فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:-

"فقہاء نے کہا ہے کہ عورت کے لئے جائز نہیں ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر وہ گھر سے باہر نکلے البتہ چند گنے چنے معاملات مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً وہ ایسے گھر میں مقیم ہو جس کے اس کے اوپر گر پڑنے کا اندیشہ ہو۔ نیز کسی علمی مجلس میں جانے کی ضرورت پیش آجائے کہ اس پر کوئی ضرورت آپڑے اور اس کا شوہر

نفقہ نہ ہو تو وہ مسئلہ دریافت کرنے کے لئے کسی علمی مجلس میں جا سکتی ہے۔ یا فرض حج ادا کرنا ہو اور اسے کوئی محرم میسر آجائے نیز والدین کی زیارت، والدین کی تعزیت اور عیادت نیز قریبی رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے وہ بغیر اجازت بھی جا سکتی ہے
(فتاوی قاضی خاں ص ۴۴۳/۱ج)

اس کی دلیل میں قرآن کریم کی وہی آیت کریمہ پیش کی جاتی ہے جس کا ذکر کئی مرتبہ آچکا ہے۔ یعنی:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ۔ (۴/۳۴)

ترجمہ: مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں۔

نیز اسی آیت میں آگے چل کر یہ فقرات بھی آگئے ہیں۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۔

(۴/۳۴)

ترجمہ: پس نیک عورتیں تو مطیع و فرماں بردار ہوتی ہیں۔ پیٹھ پیچھے بھی شوہر کی ہر چیز کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں اللہ کی حفاظت کے ساتھ۔

ان کو بھی اپنی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ قَوّٰمُوْنَ کے متعلق ہم کئی مرتبہ تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ اس لفظ کے معنے "معاشی کفیل، نان و نفقہ کا ذمہ دار، محافظ وغیرہ" ہیں۔ اس کے معنے حاکم اور داروغہ کے نہیں ہیں کہ اس سے عورت کی محکومیت ثابت کی جا سکے۔ رہ گیا قٰنِتٰتٌ کا لفظ تو اس کے معنے مطیع و فرمانبردار کے ضرور ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس کے مطیع و فرمانبردار؟

سورۂ احزاب میں آیا ہے کہ :۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ الآیہ (۳۳/۳۵)

ترجمہ :۔ یقیناً مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ، مطیع و فرماں بردار مرد اور مطیع و فرماں بردار عورتیں۔

تو یہاں اَلْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ کے معنے کیا ہیں ؟ مطیع و فرماں بردار عورتیں اگر اپنے شوہروں کی اطاعت و فرماں برداری کریں گی تو مطیع و فرماں بردار مرد کیا اپنی بیویوں کی اطاعت و فرماں برداری کریں گے ؟ اگر اس آیت میں قنوت سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے تو سورۂ نساء کی آیت کریمہ میں اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کیوں مراد نہیں ؟

ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ عورتوں کو اپنے شوہروں کا مطیع و فرماں بردار بھی ہونا چاہیئے۔ لیکن اطاعت ، اطاعت میں فرق ہے۔ ایک اطاعت محکومانہ اور غلامانہ ہوتی ہے جو ایک جابر اور مطلق العنان حاکم کی کی جاتی ہے اور ایک اطاعت رضا کارانہ اور مساویانہ ہوتی ہے جو ایک مشفق و محب صادق کی کی جاتی ہے۔ آخر بڑے سے بڑے جمہوری معاشرہ میں بھی انتظامیہ کے افراد کی اطاعت کی جاتی ہے۔ بہرحال ہم محکومانہ اور غلامانہ اطاعت کا انکار کر رہے ہیں۔ قرآن کریم نے تعلق ازدواج کو پُر مودّت و رحمت ، اور باعثِ سکون و اطمینان قرار دیا ہے۔ اس میں جبر اور مطلق العنانیت کا شائبہ نہیں

ہونا چاہیئے۔ گھر میں بچے اور نوکر چاکر خاتونِ خانہ یا باپ کی اطاعت وفرماں برداری کرتے ہیں جو جبر اور ظلم کے ماتحت نہیں ہوتی۔ ایسی ہی اطاعت خاتونِ خانہ کو اپنے شوہر کی بھی کرنی چاہیئے۔ حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ جب دو تین آدمی ایک ساتھ سفر کرو تو اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر بنالو۔ اس امیر کی اس کے ساتھی اطاعت وفرماں برداری کریں گے۔ کیونکہ اس کے بغیر نظم وضبط اور ڈسپلن قائم نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ اطاعت قطعاً رضا کارانہ ہوتی ہے۔ آمرانہ اور حاکمانہ نہیں ہو سکتی یہی حال بیوی کی اطاعت وفرماں برداری کا بھی ہے۔ وہ قطعاً رضا کارانہ، مساویانہ اور دوستانہ ہوتی ہے آمرانہ اور حاکمانہ نہیں ہوتی۔

ہمیں اس تصور سے بھی اختلاف ہے جو ہمارے علمائے کرام نے خواتین کے طبقہ میں پیدا کرنا چاہا ہے بلکہ پیدا کر دیا ہے۔ کہ انہوں نے عورت کو ایک ایسی کبوتری سمجھ لیا ہے جو ایک ایسے جنگل میں چھوڑ دی گئی ہے جہاں درختوں پر باز، شہباز اور طرح طرح کے شکاری پرندے بیٹھے ہیں کہ اگر وہ ذرا بھی اپنے کابک سے باہر نکلی تو وہ سب کے سب اس پر جھپٹ پڑیں گے اور اس کا تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ یا ایک معصوم بے زبان دبنی ہے جسے ایک بن میں چھوڑ دیا گیا ہے جہاں ہر طرف شیر، چیتے، بھیڑیئے اور طرح طرح کے درندے منڈلا رہے ہیں کہ اگر اس نے اپنے باڑے سے قدم باہر رکھا تو اس کی خیر نہیں۔ سب اس پر جھپٹ پڑیں گے اور اس کا شکار کر لیں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ تصور نہ مردوں کے لئے کچھ خوش آئند ہے نہ

عورتوں کے لئے قابل فخر ہے۔ اس موضوع پر ان حضرات نے ایک حدیث بھی بنا ڈالی ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ :-

المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشیطان ۔ (ترمذی، ابواب الرضاع، باب (بغیر عنوان))

ترجمہ :- یعنی یہ عورت پوشیدہ رکھے جانے والی مخلوق ہے۔ اس نے ذرا قدم گھر سے باہر نکالا کہ شیطان نے اسے تاک لیا۔

یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ :-

النساء عورة فاستروها بالبیوت (عیون الاخبار ج۴ ص۷۶)

ترجمہ :- یعنی عورتیں پوشیدہ رکھے جانے والی مخلوق ہیں۔ لہذا انہیں گھروں میں چھپائے رکھو۔

چنانچہ ان کے نزدیک اکتساب رزق کے لئے عورت کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

علامہ ابن نجیم رح فرماتے ہیں کہ :-

له ان یمنعها من الاعمال کلها المقتضیة للکسب لانها مستغنیة عنه بوجوب کفایتها علیه وکذا من العمل تبرعا۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۹۶)

ترجمہ :- شوہر کو حق ہے کہ وہ بیوی کو ایسے تمام کاموں سے روک دے جو کسب معاش کے لئے کئے جاتے ہیں کیونکہ شوہر پہ اس کا نان نفقہ فرض ہونے کی وجہ سے اسے کمانے کی ضرورت

نہیں ہے۔ اسی طرح بطور نفل و ثواب کے وہ کسی کا کوئی
کام کرنا چاہے تو وہ اس پر بھی پابندی لگا سکتا ہے۔

قرآن کریم کی ہدایت لیکن ہمیں قرآن کریم میں کوئی ایسا حکم نہیں ملا جس میں عورت کو گھر سے نکلنے کی بغیر شوہر کی اجازت کے ممانعت ثابت کی جا سکے۔ قرآن کریم کا اصولی حکم ہمیں تو یہ ملتا ہے کہ :-

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ
مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ط وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِن فَضْلِهِ ط (۴/۳۲)

ترجمہ: مردوں کے لئے اس سے حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لئے اس سے حصہ ہے جو وہ کمائیں۔ اور اللہ سے اس کا فضل (رزق کی فراوانی) طلب کرتے رہو۔

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے عورتوں کو اکتساب رزق کی اجازت دی ہے اور بتایا ہے کہ جو کچھ بھی عورتیں کمائیں وہ ان ہی کی ملکیت ہے۔ اس پر شوہر اپنا قبضہ نہیں جما سکتے۔ وہ اسے اپنی مرضی سے جہاں چاہیں خرچ کریں۔

اس کے برعکس علامہ ابن نجیم رح کا یہ ارشاد ہے کہ :-

"شوہر کو حق ہے کہ وہ بیوی کو ایسے تمام کاموں سے روک دے جو کسب معاش کے لئے کئے جاتے ہیں"

قرآن کریم کی اس نص صریح کے خلاف ہے۔ شوہر کے ذمے بیوی کا نان و نفقہ ضرور ہے۔ لیکن ایک انسان کی ضروریات صرف نان و نفقہ ہی کی تو نہیں ہوتیں۔ بیوی کے ماں باپ ہیں جو ضعیف

ہیں۔ اس کے چھوٹے بھائی بہن ہیں جو کمانے دھمانے کے قابل نہیں ہیں۔ شوہر کے ذمے ان کا نان و نفقہ تو نہیں ہے۔ عورت چاہتی ہے کہ کچھ کما کر اپنے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بھائی بہنوں کی مدد کرلے۔ یا خود عورت کی اپنی کچھ ایسی ضروریات ہیں جنہیں پورا کرنا شوہر کی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ اپنی ان ضرورتوں کے لئے کچھ کمانا چاہتی ہے قرآن کریم نے جب عورتوں کو اکتساب رزق کی اجازت دی ہے تو کسی کو کیا حق ہے کہ وہ اسے اس کے حق سے محروم کردے۔ اور کیا اکتساب رزق کا عمل گھر سے نکلے بغیر ہی ہو سکتا ہے؟ گھر میں ایسا کوئی درخت تو لگا ہوا نہیں جس پر نوٹوں کے پتے لگتے ہوں کہ وہ گھر سے قدم نکالے بغیر اس درخت سے نوٹوں کی گڈیاں توڑتی رہے۔ اکتساب رزق کی حق تعالیٰ نے اجازت دی ہے تو لازماً گھر سے باہر نکلنے کی بھی اجازت ہوگی۔

گھر سے نکلنے کی اجازت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پردہ کا حکم نازل ہو جانے کے بعد کا واقعہ نقل فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا باہر گئی ہوئی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھ لیا۔ اور اس پر تنقید فرمائی تو وہ خاموشی سے گھر واپس چلی آئیں اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ فرمایا۔ اس کے فوراً بعد آپ پر نزول وحی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ نے فرمایا۔

اِنَّهٗ اَذِنَ لَكُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِكُنَّ۔

(بخاری کتاب التفسیر سورۃ الاحزاب۔ باب قولہ لاتدخلوا بیوت النبی ؐ و

مسند احمد صفحہ ۵۶ ج ۲)

ترجمہ:۔ بیشک حق تعالیٰ نے تمہیں اپنی ضروریات کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔

یہ حدیث بخاری اور مسند احمد ابن حنبل کی ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر نہیں گئی تھیں۔ اجازت لے کر جاتیں تو وہ وہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتاتیں کہ میں حضورؐ کی اجازت سے آئی ہوں اور پھر خود حضورؐ سے پوچھنے کے لئے اور یہ واقعہ بتانے کے لئے نہ آتیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں اپنی ضرورتوں کے لئے بغیر اجازت بھی نکل سکتی ہیں۔

مسجد میں بلا اجازت جانا

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ:۔

اِذَا اسْتَاذَنَتْ اِمْرَأَةُ اَحَدِكُمْ اِلَى الْمَسْجِدِ فَلَا يَمْنَعْهَا۔ (فتح الباری صفحہ ۲۳۶ ج ۲)

ترجمہ:۔ جب کوئی عورت تم میں سے کسی سے مسجد میں جانے کی اجازت مانگے تو وہ اسے منع نہ کرے۔

ہمارے فقہاء کے نزدیک عورتوں پر جماعت سے کوئی صلوٰۃ ادا کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک یہ محض مباح ہے۔ بلکہ

ہمارے متاخرین فقہاء نے تو اسے مکروہ ہی لکھا ہے۔ لیکن ایک مباح امر کے لئے بلکہ متاخرین علماء کے مطابق ایک ناپسندیدہ کام کے لئے بھی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے عورت کو باہر نکلنے سے منع کرنے کی اجازت عطا نہیں فرمائی تو واقعی اور اہم ضرورتوں کے لئے ان کو کس طرح منع کرنا جائز ہو گا۔

سورۂ احزاب میں ارشاد الٰہی ہے:۔

يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳/۵۹)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر اسلام! اپنی ازواج مطہرات، اپنی صاحبزادیوں اور تمام مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی بڑی چادریں اپنے اوپر ڈال لیا کریں یہ بات اس سے قریب تر ہے کہ وہ پہچان لی جائیں اور انہیں ایذاء نہ دی جائے۔ اور اللہ بڑا مغفرت فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

یہ لمبی چادریں گھر کی چار دیواری کے اندر تو عورتیں اپنے اوپر لازماً نہیں ڈالیں گی کہ جن سے ان کی پہچان ہو جائے کہ شریف عورتیں جا رہی ہیں کہ انہیں ایذاء نہ دی جا سکے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہم پہلے بھی نقل کر چکے ہیں کہ:۔

"اس سے معلوم ہوگیا کہ لمبی چادر گھر سے باہر نکلنے کے وقت مطلوب ہے۔ یعنی عورتوں کو لمبی چادر اوڑھے بغیر باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔ جلباب اس لمبی چادر کو کہتے ہیں جو سر سے لے کر پیروں تک عورت کے جسم کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اور میں یہ بات پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اوڑھنیاں گھر کے اندر اوڑھنے کا حکم ہے اور بڑی چادریں باہر نکلنے کے وقت اور حجاب سے متعلق دونوں آیتوں کی یہی شرح میں نے کی ہے یعنی وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ اور دوسری آیت يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ کی تفسیر"

(فیض الباری ص ۳۸۸ ج ۱ و ص ۲۵۶ ج ۱)

اگر عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں ہے تو اس حکم کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ لمبی چادریں اوپر ڈال لیا کریں پھر قرآن کریم نے یہاں شوہروں کی اجازت کی کوئی شرط بھی نہیں لگائی۔ اگر شوہروں کی اجازت ضروری مانی جائے تو قرآن کریم کو اسے یہاں بیان کر دینا تھا۔ کیونکہ موضع بیان میں سکوت کلام کا نقص مانا جاتا ہے۔ تو کیا معاذ اللہ حق تعالیٰ کے کلام میں اس نقص کو تسلیم کیا جائے گا؟

سورۂ نور میں ہے :-

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۔ (۲۴/۳۰)

ترجمہ :- اے پیغمبر! مؤمنوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت

کریں یہ بات ان کے لئے پاکیزہ تر ہے۔

اگر عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں ہے تو مسلمانوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم کس لئے دیا جا رہا ہے۔ جب عورتیں باہر ہی نہیں نکل سکتیں اور وہ ایسے پردہ کی چیز ہیں کہ بقول علماٗ انہیں گھروں کے اندر چھپائے رکھنا چاہیئے۔ تو مردوں کے لئے اندیشہ ہی کیا باقی رہا کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ نیز اگر عورتوں کے باہر نکلنے کے لئے شوہروں کی اجازت درکار ہے تو یہ موضع بیان تھا۔ حق تعالیٰ کو یہ قید لگا دینی چاہیئے تھی۔ مگر حق تعالیٰ نے اس کا کوئی بیان نہیں کیا۔ نہ یہاں نہ کسی دوسری جگہ۔ تو کیا اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ قرآن کریم کا منشاء ہرگز یہ نہیں ہے کہ بلا وجہ عورتوں کو پابند بنا دیا جائے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس عورت نے عطر لگایا ہو اور عطر لگا کر کسی گروہ کے پاس سے گذرے کہ لوگ اس کی خوشبو کو محسوس کر لیں تو وہ عورت زنا کار ہے۔

(نسائی صـ۲۸۳ ج ۲، ابو داؤد صـ ج ۱۹۲/۲، ترمذی مع شرح مبارک پوری صـ ج ۱۷/۴، حاکم صـ ج ۳۹۶/۲، احمد صـ ج ۴۱۳-۴۰۰/۴ ابن خزیمہ و ابن حبان)

حضرت زینب ثقفیہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی مسجد جانے لگے تو خوشبو نہ لگائیے۔ (مسلم و ابو عوانہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ جس عورت نے خوشبو لگائی ہو تو ہمارے ساتھ صلوٰۃ العشاء میں شریک نہ ہو۔

(مسلم و ابو عوانہ)

موسیٰ ابن یسار حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک عورت ان کے سامنے سے گذری، خوشبو کی لپٹ اس سے آرہی تھی تو ابوہریرہؓ نے کہا کہ اے خدا کی بندی! کیا مسجد جا رہی ہے؟ اس نے کہا "ہاں" آپ نے فرمایا "کیا تو نے خوشبو لگا رکھی ہے؟" اس نے کہا "ہاں" تو ابوہریرہؓ نے کہا۔ لوٹ جاؤ اور غسل کرو، میں نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ کوئی عورت مسجد کی طرف نہیں نکلتی کہ اس سے خوشبو کی لپٹیں آرہی ہوں اور خدا اس کی صلوٰۃ کو قبول فرمالے تا آنکہ وہ لوٹ کر اس خوشبو کو دھو نہ ڈالے۔

(منذری ترغیب صفحہ ۹۴ ج ۳ وابن خزیمہ فی صحیحہ و بیہقی)

یہ تمام احادیث بتلا رہی ہیں کہ عورتیں گھروں سے باہر نکل سکتی ہیں، مسجدوں میں باجماعت صلوٰۃ کے لئے جا سکتی ہیں۔ لیکن انہیں خوشبو اور عطر لگا کر نہیں جانا چاہیئے۔ بغیر تصنع کے باوقار انداز میں انہیں باہر آنا جانا چاہیئے۔

حسنِ معاشرت

بہر حال میاں بیوی کا تعلق حاکم و محکوم اور آمر و مامور یا جابر و مجبور کا نہیں ہے بلکہ یہ تعلق رفاقت، مصاحبت اور مودت و رحمت کا ہونا چاہیئے مردوں کو حق تعالیٰ نے خاص طور پر مخاطب کر کے فرمایا ہے:۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ

فَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَهُوۡا شَیۡئًا وَّ یَجۡعَلَ اللّٰهُ فِیۡهِ
خَیۡرًا کَثِیۡرًا ۝ (۴/۱۹)

ترجمہ: اور عورتوں کے ساتھ دستور کے مطابق گذران کرو۔ تو اگر تم انہیں ناپسند بھی کرتے ہو تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کر رہے ہو لیکن اللہ نے اسی میں بڑی بھلائی رکھدی ہو۔

حق تعالیٰ نے اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ مردوں ہی کو مخاطب فرمایا ہے۔ حالانکہ حسن معاشرت کی مامور عورتیں بھی ایسی ہی ہیں جیسے مرد ہیں۔ لیکن چونکہ عام طور پر اس معاملہ میں زیادتی مردوں کی طرف سے ہوتی ہے اس لئے انہی کو خطاب خصوصیت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

شوہر کی اجازت کے بغیر

عورت اور بچوں کا نان و نفقہ مرد کے ذمے ہے۔ لیکن بعض مرد طبعًا بخیل اور خسیس ہوتے ہیں۔ وہ نفقہ کے سلسلہ میں تنگی برتتے ہیں اور عورتوں کو مناسب خرچہ نہیں دیتے۔ ایسی صورت میں عام قاعدہ یہی ہے کہ صاحبِ حق کو اپنا حق وصول کر لینے کا حق ہوتا ہے لہٰذا وہ شوہر کی لاعلمی کے ماتحت اپنا حق اس کے مال میں سے وصول کر سکتی ہیں۔ اور اس طرح وصول نہ کر سکیں تو عدالت کے ذریعہ سے بھی ان کو اپنا حق حاصل کر لینے کا حق ہے۔ فتح مکہ کے دن حضرت ابو سفیانؓ (جو حضور اکرمؐ کے خسر بھی ہیں) کی بیوی ہند بنت عتبہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا

کہ اے اللہ کے رسول! ابو سفیان کی طبیعت میں بخل ہے وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضروریات کے مطابق خرچ نہیں دیتے۔ لہٰذا میں ان کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لیلوں تو اس کی اجازت ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ تم قاعدہ اور دستور کے مطابق اتنا لے سکتی ہو جو تمہیں اور تمہارے بچوں کے لئے کافی ہو۔

(بخاری باب اذالم ینفق الرجل)

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند مختصر فقروں میں بتا دی گئی ہے جن کی تفصیل کے لئے دفتر درکار ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور اپنی رعایا کا نگہبان ہے۔ تم میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت بازپرس ہوگی۔--------- مرد اپنے بیوی بچوں کا رکھوالا ہے۔ اس سے اس کی پوچھ ہوگی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے اس سے اس کی پوچھ ہوگی۔"

(بخاری صفحہ ۷۷۹ جلد ۱ باب قوا انفسکم واہلیکم)

لسانِ نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

نصف مہر یا متعہ

اگر کسی نے ایک عورت سے نکاح کیا اور نکاح کے بعد اس سے پہلے ہی کہ اس سے زن و شو کے تعلقات قائم ہوں شوہر اسے (عدالت سے اجازت لے کر) طلاق دیدے۔ تو یہ نکاح محض نام ہی کا نکاح ہے۔ اس سے شوہر نے کچھ بھی استمتاع نہیں کیا لیکن حسنِ معاشرت کا یہ تقاضا ہے جس کا مسلمان مردوں کو حکم دیا گیا ہے

کہ اگر اس کا کچھ مہر مقرر کر دیا گیا تھا تو نصف مہر اس کو ادا کر دے اور اگر مہر مقرر ہی نہیں کیا گیا تھا تو کچھ ساز و سامان (متاع) دے کر اسے رخصت کرے۔ ساتھ ہی عورت سے حق تعالیٰ نے اپیل فرمائی ہے کہ اگر عورت مہر معاف ہی کر دے تو بہتر ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہے :-

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ○ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ (۲/۲۳۷)

ترجمہ :- اور تم پر کوئی مضائقہ نہیں عورتوں کو ہاتھ لگانے اور ان کے لئے کوئی مہر مقرر کرنے سے پہلے ہی انہیں طلاق دیدو۔ انہیں کچھ ساز و سامان دیدو۔ وسعت والے آدمی پر اس کے بقدر اور تنگدست آدمی پر اس کے بقدر۔ یہ ساز و سامان دستور کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یہ نیکوکاروں پر فرض ہے۔ اگر تم نے انہیں طلاق دیدی اور تم ان کا مہر مقرر کر چکے تھے تو جتنا مہر مقرر کیا تھا اس کا نصف ان کو ادا

کردو اِلاّیہ کہ عورتیں مہر معاف کردیں یا وہ شخص مہر معاف کردے (جو عورت کا نمائندہ تھا اور) جس کے ہاتھ میں نکاح کا بندھن تھا۔ اور یہ کہ تم معاف ہی کردو، تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور باہمی احسان کرنا فراموش نہ کرو۔

ان دونوں صورتوں میں باوجودیکہ مرد نے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی حسنِ معاشرت کا یہ تقاضا ہے کہ عورت کو کچھ نہ کچھ ضرور دیا جائے۔ نکاح کرنے کے بعد طلاق مرد دے رہا ہے جس میں عورت کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لہٰذا کچھ تو اس کی اشک شوئی ہونی چاہیئے۔

نان و نفقہ و سکنیٰ کی سال بھر تک وصیت

اسی حُسنِ معاشرت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ شوہر مرتے وقت اپنے ورثہ کو یہ وصیت کر جائے کہ اس کی بیوی کو کم از کم ایک سال تک نان و نفقہ دیا جائے اور خانہ بدر نہ کیا جائے۔ اسے گھر میں رہنے کا حق ہونا چاہیئے اِلاّیہ کہ وہ نکاح ثانی کرکے خود ہی گھر چھوڑ دیں۔

سورۂ بقرہ ہی میں ہے،

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ (۲/۲۴۰)

ترجمہ: اور جو تم میں سے مرنے لگیں اور وہ بیویاں چھوڑ رہے ہوں

تو انہیں اپنی بیویوں کے لئے یہ وصیت کرجانی ضروری ہے
کہ سال بھر تک اُنہیں نان و نفقہ دیا جائے اور گھر سے نہ
نکالا جائے۔ پھر اگر وہ خود ہی نکل جائیں تو تم پر اس میں
کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ اپنے نفسوں کے بارے میں دستور
کے مطابق کچھ کرلیں۔

ہمارے علمائے کرام نے وراثت کی آیت سے اس حکم کو منسوخ قرار دیدیا ہے کہ اسے وراثت کے ذریعہ سے اپنا حق مل گیا ہے لہٰذا اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ صرف عدت کے زمانے تک ورثہ پر نان و نفقہ اور سکنیٰ مہیا کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ان کا کوئی حق نہیں رہا۔ ہمارے علمائے کرام نے قرآن حکیم یعنی حسنِ معاشرت کے حکم کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ ہم بارہا عرض کر چکے ہیں کہ جو کچھ بھی آج قرآن کریم کے دفتین میں محفوظ ہے اس میں سے ایک نقطہ اور ایک شوشہ بھی منسوخ نہیں ہے آج سارا قرآن کریم محکم ہے۔ اگر کچھ منسوخ ہونا تھا تو وہ منسوخ ہو چکا اور اس کا کوئی جزو آج قرآن کریم کا حصہ نہیں ہے۔

جہیز کی رسم

جب کسی فرد یا جماعت کو کسی مقصد کے لئے تیار کرتے ہیں تو اسے اس کے مقصد کے مطابق ضروری ساز و سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ بچے اسکول جاتے ہیں تو ان کے لئے قلم، دوات، کاغذ، کاپی، کورس کی کتابیں اس کے ساتھ کر دی جاتی ہیں۔ کوئی آدمی سفر پہ جا رہا ہو تو اس کے ساتھ اس کا بستر، سوٹ کیس، ناشتہ دان تیار کر کے کر دیا جاتا

ہے۔ کوئی شخص جہاد پر جا رہا ہو تو اس کے لئے گھوڑا، اونٹ اسلحہ اور سامانِ خوراک کر دیا جاتا تھا۔ کوئی آدمی مر گیا ہو تو اس کے لئے کفن دفن کا انتظام کرنا، لڑکی رخصت ہو کر شوہر کے گھر جا رہی ہو تو کچھ ضروری سامان تیار کر کے اس کے ساتھ کر دیا جاتا ہے۔ اس کو عربی میں تجہیز کہتے ہیں اور جو سامان تیار کر کے ساتھ کیا جائے اسے جَہَازٌ (جیم کے فتح اور کسرہ کے ساتھ) کہتے ہیں۔ اس جَہَازٌ یا جِہَازٌ سے اردو میں جہیز بنا لیا ہے۔

اتنی بات ذہن میں رکھیئے کہ یہ ساری تیاریاں سوائے چھوٹے بچوں کے جو اسکول جا رہے ہوں خود جانے والے کے مال سے کی جاتی ہیں۔ گھر والے یا رشتہ دار صرف تیار کرتے ہیں مگر چیزیں اسی کی ہوتی ہیں جو برسرِ سفر ہو۔ حتیٰ کہ مردہ کو جو قبر کے لئے تیار کرتے ہیں اور اس کے کفن دفن کا سامان کرتے ہیں وہ بھی مردہ ہی کے ترکہ میں سے کرتے ہیں۔ اِلّا یہ کہ اس نے کوئی ترکہ ہی نہ چھوڑا ہو۔ یا اس کی اولاد میں سے کوئی شخص برضا و رغبت اپنی جیب سے کر دے مگر شریعت نے یہ خرچ خود میت کے ترکہ پر ڈالا ہے۔

لڑکی جب رخصت ہو کر اپنے شوہر کے گھر جاتی ہے تو عربوں میں اس کے لئے کسی قسم کے ساز و سامان کرنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ حد یہ ہے کہ اس کے لئے عربی زبان میں کوئی لفظ ہی نہیں تھا۔ البتہ لڑکی کو اچھے کپڑے پہنانا۔ اس کی مانگ چوٹی کرنا۔ زیب و زینت کرنا ہی جَہَازٌ یا جِہَازٌ کہلاتا تھا۔ اسلام سے پہلے ساری دنیا میں عورتوں کو ماں باپ کے ترکہ سے کچھ حصہ نہیں ملتا

تھا۔ اس لئے جو کچھ مہذب قومیں تھیں ان میں یہ رواج تھا کہ لڑکی رخصت ہو رہی ہے۔ اب اس کا نان نفقہ اس کے شوہر کے ذمے ہوگا۔ ماں باپ سے اس کا کوئی مالی تعلق باقی نہیں رہے گا۔ حتیٰ کہ ماں باپ مر جائیں تو ان کے ترکہ میں سے بھی اسے کچھ نہیں ملے گا۔ اس لئے جاتے ہوئے اسے کچھ نہ کچھ دیدیا جائے۔ چنانچہ ہندوستان میں جب لڑکی رخصت ہوتی تھی تو "کنّیا دان" کے نام سے اسے کچھ سازو سامان دیا جاتا تھا جس نے آگے چل کر جب ہندوستان میں مسلمانوں نے قدم جمالئے اور عربی زبان کے بہت سے لفظ مقامی آبادی نے بھی قبول کر لئے تو اس کا نام جہیز پڑ گیا۔ کیونکہ مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی "کنّیا دان" کی رسم اپنا لی تھی اور انہوں نے اس کا نام عربی زبان سے مشتق کر کے جہیز ہی رکھ دیا تھا۔ ویسے قدیم عربی زبان میں جہیز یا جہاز کا لفظ اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا۔ عجمی اثرات کے ماتحت اب عربوں میں یہ رسم رواج پذیر ہو گئی ہے تو انہوں نے اس کے لئے جدید عربی زبان میں "بائنۃ" کا لفظ بنا لیا ہے۔ لیکن یہ لفظ مولّد ہے۔ یعنی قدیم زبان میں یہ لفظ اس معنے میں موجود نہیں تھا۔ بعد میں اس کا اضافہ کیا گیا ہے جیسے لاؤڈ اسپیکر کے لئے مِذْیَاعٌ اور بلڈ وزر کے لئے مُدَمِّرَۃٌ لفظ اختراع کر لیا گیا ہے۔

قرآن کریم اور سنت رسول نے ازدواجی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کے لئے ہدایات دی ہیں۔ مثلاً مہر۔ تعدد ازدواج اور متعدد بیویوں کی صورت میں عدل و قسط۔ رضاعت کی اجرت

مسکن۔ نان ونفقہ۔ حسن سلوک۔ دیگر حقوق زوجین۔ حلال وحرام رشتے۔ عدت۔ عقد ثانی۔ اولاد کے حقوق۔ حضانت وغیرہ۔ لیکن جس چیز کا اشارۃً بھی کہیں ذکر نہیں ملتا وہ جہیز کی رسم ہے۔ انتہا یہ ہے کہ فقہ کی بنیادی کتابوں میں بھی اس کا کوئی باب موجود نہیں ہے جبکہ ہماری فقہیں زیادہ تر عرب میں نہیں بلکہ عجم ہی میں مرتب ہوئی ہیں جہاں یہ رسم موجود تھی۔ متاخرین کے فتاویٰ میں کہیں کہیں اس کا تذکرہ مل جاتا ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

جہیز کے متعلق سنت رسول ہونے کی غلط فہمی سنن نسائی کی ایک روایت سے پیدا ہوئی ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ:۔

جھز رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی خمیل وقربۃ ووسادۃ حشوھا اذخر۔

(نسائی صفحہ ۷۷ مطبوعہ کراچی)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب فاطمہؓ کو تیار کرکے روانہ کیا ایک چادر، ایک مشکیزہ اور ایک تکئے کے ساتھ جس میں اذخر گھاس بھری ہوئی تھی۔

اس سے یہ مطلب نکالا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چیزیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بطور جہیز دی تھیں۔ سنن ابن ماجہ میں بھی اسی مفہوم کی ایک روایت آئی ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:۔

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اتی علیا و فاطمۃ وھما فی خمیل لھما قد کان رسول اللّٰہ

صلی اللہ علیہ وسلم جھزھما بھما ووسادۃ حشوۃ اذخر وقربۃ۔

(ابن ماجہ کتاب الزہد باب معاش آل محمد ص۱۳۹ حدیث نمبر ۵۲ ج ۲ طبع عیسی البابی الحلبی)

ترجمہ: حضورؐ حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اس وقت ان دونوں کے پاس ایک چادر تھی جو حضورؐ نے ان دونوں کو مہیا فرمائی تھی۔ نیز ایک تکیہ بھی جس میں اذخر گھاس بھری ہوئی اور ایک مشکیزہ بھی۔

ابن ماجہ کی اس حدیث میں "جَھَّزَھُمَا" کا لفظ آیا ہے یعنی ان دونوں کو مہیا فرمایا تھا۔ تو کیا آپؐ نے حضرت علیؓ کو بھی جہیز دیا تھا؟ یہاں ان حدیثوں میں جَھَّزَ کا ترجمہ جہیز دینا صحیح نہیں ہے۔

حضرت فاطمہؓ کے جہیز کی حقیقت

سب جانتے ہیں کہ جہیز کی رسم یہ ہے کہ لڑکی کو رخصتی کے وقت ماں باپ اپنے پاس سے کچھ سامان دیتے ہیں۔ یعنی کچھ کپڑے، برتن، فرنیچر وغیرہ تاکہ وہ اپنا گھر بسائیں تو ان کے کام آئیں اور وہ ان سے استفادہ کرسکیں۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چیزیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے پاس سے نہیں دی تھیں۔

علامہ شہاب الدین ابوالعباس احمد ابن محمد ابن ابی بکر قسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ) نے اپنی سیرت کی مشہور کتاب المواہب اللدنیہ

فی المنح المحمدیہ میں اور علامہ محمد ابن عبد الباقی ابن یوسف زرقانی (متوفی ۱۱۲۲ھ) نے اپنی مشہور کتاب مصابیح السیر المحمدیہ میں (جو المواہب اللدنیہ کی شرح ہے) اس کی پوری تفصیل دیدی ہے۔ اس کے متن اور شرح کا جو نسخہ میرے سامنے ہے وہ مطبعہ ازہریہ مصر ۱۳۲۵ھ کا شائع کردہ ہے۔ یہ دونوں حضرات لکھتے ہیں کہ:

حتی اتیت النبی صلے اللہ علیہ وسلم فقلت تزوجنی فاطمۃ؟ قال عندک شیء؟ قلت فرسی وبدنی۔ قال اما فرسک فلابد لک منھا واما بدنک فبعھا فبعتھا من عثمان ابن عفان باربع مأۃ وثمانین درھما ثم ان عثمان رد الدرع الی علی فجاء بالدرع والدراھم الی المصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم فدعا لعثمان بدعوات کما فی روایۃ۔ فجئتہ بھا فوضعتھا فی حجرہ فقبض منھا قبضۃ فقال ای بلال! ابتع لنا بھا طیبا وفی روایۃ ابن ابی خیثمۃ عن علی امر صلے اللہ علیہ وسلم ان یجعل ثلث الاربع مأۃ وثمانین فی الطیب ...... وامرھم ان یجھزوھا فجعل لھا سریرا مشروطا ووسادۃ من ادم حشوھا لیف۔

(خط کشیدہ الفاظ مواہب لدنیہ کے ہیں یعنی متن کے اور باقی الفاظ زرقانی یعنی شرح کے)۔

ترجمہ۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "کیا آپ میری شادی فاطمہؓ سے فرمائیں گے؟" آپ نے فرمایا" تمہارے پاس (مہر میں دینے کو) کچھ ہے؟" میں نے کہا" میرا گھوڑا ہے اور میری زرہ ہے" آپ نے فرمایا گھوڑے کی تو تمہیں خود ضرورت ہے۔ البتہ اپنی زرہ کو فروخت کردو۔ چنانچہ میں نے زرہ حضرت عثمانؓ بن عفان کے ہاتھ چار سو اسی ۴۸۰ درہم میں فروخت کردی۔ پھر حضرت عثمانؓ نے وہ زرہ بھی حضرت علیؓ ہی کو واپس کردی۔ چنانچہ حضرت علیؓ زرہ اور دراہم کو لے کر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جیسا کہ روایت میں ہے حضرت عثمان کو بڑی دعائیں دیں۔ (حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ) میں آیا اور سارے درہم آپ کی گود میں ڈال دیئے۔ آپ نے ان سے ایک مٹھی بھری اور فرمایا "اے بلالؓ! اس سے ہمارے لئے خوشبوئیں خرید لاؤ۔"

اور حضرت علی سے ابن ابی خیثمہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ چار سو اسی ۴۸۰ درہم کے تہائی میں خوشبوئیں خرید لاؤ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اور آپ نے حکم دیا کہ باقی سے فاطمہؓ کے لئے کچھ تیاری کرو چنانچہ ان کے لئے ایک بنی ہوئی چارپائی اور چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے انہوں نے بنایا۔

ایک شیعہ مؤرخ میر خواند محمد ابن خاوند شاہ ابن محمود

ہروی (متوفی ۹۰۳ھ) نے اپنی کتاب روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء (مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۹۱ء) میں اس کی مزید تفصیل یوں بیان کی ہے:۔

"چوں حضرت علیؓ فاطمہؓ را خواستگاری نمود حضرت رسول فرمودہ کہ مہر اورا چہ می سازی؟ جواب داد کہ نزد من چیزے نیست۔ حضرت فرمودہ "زرۂ محطمیہ تو کجا است؟" عرض کرد "موجود است" حضرت فرمودہ کہ "آں را صداق ساز" گویند کہ حضرت علیؓ آں زرہ را بچہار صد و ہشتاد درہم بعثمان فروخت۔ وآں زرہے بود فراخ و سنگین کہ ہیچ شمشیر بر و کار نمی کرد۔ عثمان بعد از خریدن بحضرت علی بخشید۔ و مرتضیٰ علی زرہ و بہائے آں کہ چہار صد و ہشتا درہم بود بخدمت مصطفیٰ آورد۔ و حضرت دربارۂ عثمان دعار فرمود روایتے آنست کہ دو دانگ وجہ مذکور را ببوئے خوش صرف کردند۔ چہار دانگ اورا چہار مصرف داشتند وازاں جملہ دو جامہ برد بود دو و بازو بند نقرہ و لحاف کتان و یک نہالے ازاں جنس، وجمع دو نہالے گفتہ اند و بعضے از جزئیات دیگر کہ محتاج الیہ بود ازاں زر مرتب ساختند"

ترجمہ:۔ جب حضرت علیؓ نے فاطمہ زہراء کی خواہش ظاہر کی تو حضور نے پوچھا کہ: ان کے مہر کے لئے کیا کرو گے؟

عرض کیا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ فرمایا کہ وہ تمہاری حُطَمی زرہ کیا ہوئی؟ عرض کیا کہ وہ تو موجود ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بس اسی کو مہر قرار دیدو۔ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے وہ زرہ (حضرت) عثمانؓ کے ہاتھ چارسو اسی ۴۸۰ درہم میں فروخت کردی۔ وہ زرہ ایسی کشادہ اور سخت تھی کہ اس پر کوئی تلوار اثر نہیں کرتی تھی۔ (حضرت) عثمانؓ نے وہ زرہ خرید کر حضرت علیؓ ہی کو بخشدی۔ علی مرتضیٰؓ وہ زرہ اور اس کی قیمت چارسو اسی درہم لے کر حاضر خدمت ہوئے اور حضورؐ نے (حضرت) عثمانؓ کے حق میں دعا فرمائی۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضورؐ نے اس رقم کے دو حصے تو خوشبو میں صرف فرمائے اور چار حصے دوسرے چار مصرف میں دو دھاری دار چادریں۔ دو نقرئی بازو بند۔ ایک بستر کا لحاف اور اسی کا ایک تکیہ۔ بعض مؤرخین نے دو تکیئے بتائے ہیں اور بعض دیگر اشیائے ضرورت۔ یہ سب کچھ اسی (مہر کی) رقم سے حضورؐ نے تیار فرمایا تھا۔

تاریخ میں یہ بات ثابت ہے کہ ابوطالب چونکہ کثیر الاولاد تھے اور آمدنی کے ذرائع محدود تھے اس لئے حضرت علیؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی حضرت علیؓ کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ وہ حضورؐ کے گھر ہی میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد الگ گھر بسانے کا مرحلہ درپیش تھا۔ حضرت حارثہ ابن نعمان انصاریؓ نے اپنا ایک گھر اس نئے جوڑے کے لئے پیش

کیا۔ اس خالی گھر کو بہر حال اثاث البیت کی ضرورت تھی۔ چند خانہ داری کی ضروریات اور کچھ دلہن کی تیاری کے لئے چیزیں درکار تھیں۔ انہیں آپؐ نے حضرت فاطمہؓ کی مہر کی رقم سے پورا کر دیا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بڑے داماد حضرت ابو العاص اموی رضی اللہ عنہ کا جن سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا بیاہی گئی تھیں اور منجھلے داماد حضرت عثمان ابن عفان اموی رضی اللہ عنہ کا جن سے حضرت رقیہ کی اور ان کے انتقال کے بعد حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی شادی ہوئی تھی گھر موجود تھا۔ ان کے گھر میں اثاث البیت بھی موجود تھا ان کے لئے کسی ساز و سامان کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں نو ازواج مطہراتؓ موجود تھیں مگر کوئی ایک بھی جہیز لے کر نہیں آئی۔ صبح و شام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی لڑکیوں کی شادیاں ہوتی رہتی تھیں۔ مگر کسی ایک شادی میں بھی جہیز کا ذکر نہیں ملتا۔ عربی زبان جس میں ایک ایک چیز کے لئے ذرا ذرا سے فرق سے ہزاروں لفظ مل جاتے ہیں۔ ایسی متمول زبان میں جہیز کے لئے ایک لفظ بھی نہ ہونا اس کی واضح دلیل ہے کہ عربوں میں اسلام سے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی اس قبیح رسم کا کوئی رواج نہیں تھا۔

بَری کی رسم

ہمارے ہاں دو رسمیں پہلو بہ پہلو چلی آرہی ہیں لڑکا جب شادی کرنے جاتا ہے تو اپنے ساتھ دلہن کے لئے کپڑے، زیورات، سنگھار کا سامان، کچھ کھانے کی چیزیں (خشک میوے) لے کر جاتا ہے اِسے بَری کہتے ہیں۔ اور لڑکی

اپنے ماں باپ کے گھر سے جو کچھ لے کر آتی ہے۔ اسے جہیز کہتے ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جو کچھ دیا تھا وہ حضرت علیؓ کی زرہ کی قیمت سے دیا تھا۔ لہٰذا اس کو بجائے جہیز کہنے کے اگر بری کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ لہٰذا اسے جہیز کی رسم کے لئے دلیل بنا لینا زبردستی ہے۔ اور اگر اس پر ہی اصرار ہے کہ اسے جہیز ہی کہا جائے کیونکہ یہ سب سامان حضرت فاطمہؓ کے مہر کی رقم سے تیار کیا گیا تھا تو ہمیں عرض کرنے دیجئے کہ پھر رواج یوں ہونا چاہیئے کہ لڑکا مہر کی رقم شادی سے پہلے ہی لڑکی کے والدین کو ادا کر دے اور اسی رقم سے جہیز تیار کر دیا جایا کرے لیکن موجودہ رواج کے لئے اسے دلیل بنانا کہاں تک درست ہے کہ مہر کی رقم تو شوہر ادا نہیں کرتا اور جہیز کا مطالبہ کرتا ہے۔

انتہائی بیہودہ رسم اس جہیز کی رسم نے ہمارے معاشرہ میں انتہائی سفلہ پن اور کمینگی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ افسوس ہے کہ اس رسم کی قباحت اور شناعت کے لئے مجھے موزوں الفاظ نہیں مل رہے ہیں ورنہ سفلہ پن اور کمینگی کے الفاظ اس کی پوری شناعت و قباحت کو ادا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں یہ ایک ناسور کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ باقاعدہ سودا بازی کی جاتی ہے کہ ہم تمہاری لڑکی سے اس وقت شادی کریں گے جب تم ہمیں جہیز میں ایک ٹیلی وژن سیٹ ایک فرج ایک موٹر کار اور ایک کوٹھی، اتنے زیورات اور اتنے ملبوسات دو۔ چنانچہ لڑکی پیدا ہو چلا

ماں باپ کے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ بن گیا ہے۔ لوگوں کے مطالبات یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ لڑکے کو انگلینڈ یا امریکہ بھیجنا ہوگا۔ وہ وہاں فلاں تعلیم حاصل کرے گا اور اس کے تمام اخراجات برداشت کرنے ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ معلوم نہیں، یہ کس چیز کی قیمت طلب کی جاتی ہے۔ کیا یہ لڑکے کی قیمت ہوتی ہے؟ اگر لڑکے کی قیمت ہے تو اسے بیوی کے حق میں غلامی کی دستاویز لکھنی چاہیئے۔ لیکن یہ عجیب منطق ہے کہ لڑکے کی قیمت بھی وصول کر لی جاتی ہے اور وہ لڑکی کا زر خرید غلام ہونے کے بجائے لڑکی کا آقا اور مالک بننے کا دعویدار بنتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کیسا معاہدہ ہے اور اگر لڑکی واقعی لڑکے کی زر خرید باندی ہے۔ جیسا کہ سمجھا جاتا ہے تو یہ کیسی زر خرید ہے کہ اس کی قیمت اس کو خریدنے والا ادا نہیں کرتا بلکہ خود لڑکی سے جہیز کی صورت میں وصول کی جاتی ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا تجارتی سودا بھی دیکھا ہے جس میں خریدار تو کوئی قیمت ادا نہ کرے بلکہ الٹا دوکاندار مطلوبہ چیز بھی دے اور اس کی قیمت بھی دے۔ یہ شرمناک سودے بازی صرف شادی کے سلسلہ میں روا رکھی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے شریف گھرانوں کی پڑھی لکھی، تعلیم یافتہ، خوبصورت و خوب سیرت مظلوم لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں اور کوئی انہیں قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ ان کے والدین بھاری بھرکم جہیز نہیں دے سکتے۔ ماں باپ کی زندگیاں اجیرن بن گئی ہیں نہ انہیں

دن کو چین نصیب ہے نہ رات کو آرام اور نیند میسر آتی ہے۔

پچھلے دنوں حکومت نے قانون بنایا تھا کہ لڑکی کی شادی میں جہیز اور شادی کے اخراجات میں پانچ ہزار روپیہ سے زیادہ خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہوگی لیکن اس قانون کا جو حشر ہوا ہے۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ اس کے بعد سے یہ پریکٹس ہوگئی ہے کہ لڑکی والا غریب بھاری بھر کم جہیز شادی سے پہلے ہی دولہا کے گھر پہنچا دیتا ہے اور شادی کے وقت چند گنے چنے جوڑے اور زیورات چڑھائے جاتے ہیں اور حکومت کو حلفی بیان پیش کر دیئے جاتے ہیں کہ ہم نے جہیز میں صرف چند جوڑے کپڑے اور چند زیورات دیئے ہیں اور بارات کے کھانے پر معمولی سا خرچہ کیا ہے۔

تمام علمائے کرام اور فقہائے عظام منہ میں گھونگھنیاں بھرے بیٹھے ہیں اور تمام سوشل انجمنیں اور تنظیمیں سب کچھ جانتے ہوئے خاموش ہیں اور کوئی اس افسوسناک بلکہ شرمناک رسم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔ یہ کام حکومت کے قوانین سے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حکومت کی مشینری میں بھی ہم جیسے ہی بددیانت رشوت خور، قسی القلب افسران بھرے ہوئے ہیں۔ جنہیں قوم کے بھلے بُرے سے کوئی غرض نہیں۔ اُنہیں محض اپنی جیبیں بھرنے سے غرض ہے۔ ان کا اپنا اُلّو سیدھا ہونا چاہیئے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ علمائے کرام، مذہبی انجمنیں سوشل ویلفئر کی سوسائیٹیاں، مفادِ عامہ کی انجمنیں۔ خصوصاً خواتین

کی تنظیمیں اس کے خلاف آواز اُٹھائیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن سے اس کے خلاف بھرپور پروپیگنڈا کیا جائے۔ اور رائے عامہ کو اس کے خلاف تیار کیا جائے۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے سے آج تک نہ دنیا میں کچھ ہوا ہے نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔

قرابت داروں کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زوجین کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کا حق ہے۔ عربی محاورہ میں رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کو "صلۂ رحم" اور بدسلوکی کرنے کو "قطع رحم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسلامی شریعت میں اس کی اہمیت دیگر شریعتوں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ قرآن کریم میں کم ازکم بارہ آیات میں صلہ رحمی کی تاکید فرمائی گئی ہے اور اسے لوگوں کا احسان نہیں بلکہ اُن کا فریضہ اور قرابت داروں کا حق بتایا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ روم میں ہے:-

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (۳۰/۳۸)

ترجمہ:- تو قرابت دار کو اس کا حق ادا کرو۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:-

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (۱۷/۲۶)

اور قرابت دار کو اس کا حق ادا کرو۔

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی گئی ہے کہ مال و دولت کی محبت

ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود خود تکلیف اٹھا کر بھی رشتہ داروں کی مدد کرنی ہی اصل نیکی ہے۔

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی (۲/۱۷۷)

ترجمہ: (اور اصل نیکی تو اسی کی ہے جس نے) باوجود مال کی خواہش اور ضرورت کے اسے اپنے قرابت داروں کو دیدیا۔

والدین کے بعد ہمارے حسن سلوک کے مستحق قرابت دار ہی ہیں۔

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ

(۲/۲۱۵)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر اسلام! کہہ دیجئے کہ جو کچھ تم مال خرچ کرو اس کے حقدار والدین اور قرابت دار ہیں۔

حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بھی یہی عہد لیا تھا کہ وہ ماں باپ اور درجہ بدرجہ تمام رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کیا کریں گے۔

وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی (۲/۸۳)

ترجمہ:۔ اور (بنی اسرائیل سے ہم نے یہ عہد لیا تھا کہ وہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور) والدین کے ساتھ اور قرابت داروں کے ساتھ نیک سلوک کریں گے۔

سورۂ نحل میں رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کو عدل و احسان کے بعد حق تعالیٰ نے اپنا تیسرا اہم حکم قرار دیا ہے:۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ
ذِى الْقُرْبٰى (۱۶/۹۰)

ترجمہ:۔ یقیناً حق تعالیٰ، عدل و احسان اور رشتہ داروں
کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

ایک مسلمان کے مال و دولت کے اولین حقدار اس کے والدین
کے بعد اس کے رشتہ دار ہی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ (۲/۲۱۵)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر اسلام! کہہ دیجئے کہ جو کچھ مال
دولت تم خرچ کرتے ہو تو اس کے حقدار (تمہارے)
والدین اور رشتہ دار، نیز یتیم بچے اور مساکین ہیں۔

اگر کسی رشتہ دار سے کوئی قصور سرزد ہو جائے یا کوئی
کوتاہی عمل میں آجائے تو اس کی وجہ سے تم ان کی امداد سے
ہاتھ نہ روک لیا کرو۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ
يُّؤْتُوْا أُولِى الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ (۲۴/۲۲)

ترجمہ:۔ اور جو لوگ تم میں دولت مند اور صاحبِ وسعت
ہیں وہ رشتہ داروں اور محتاجوں کو دینے کی قسم نہ کھا
بیٹھیں۔

حق تعالیٰ کی عبادت، توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک
کے بعد تیسری اہم چیز رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک ہی کو

بتایا گیا ہے :-

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى (۳۶/۴)

ترجمہ :- اور اللہ ہی کی عبادت کرو، اس میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھی۔

رشتہ داری کے حق کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی کفارِ مکہ کو جب انہوں نے باوجود رشتہ داری اور ایک ہی قبیلے یعنی قریش سے ہونے کے آپؐ کو جی بھر کر خوب خوب ستایا اور طرح طرح کی زحمتیں، محنتیں اذیتیں، تکلیفیں اسلام کی تبلیغ اور حق کی دعوت میں پیش آئیں تو عرب کے عام دستور کے مطابق کہ ایسے موقعوں پر وہ اپنی قوم اور اپنے قبیلہ کی دہائی دیا کرتے تھے، آپ نے بھی اسی قرابت اور رشتہ داری کا واسطہ دیا تھا کہ کم بختو! میرے اس احسان عظیم اور کرم عمیم کا جو ہدایت، تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ میں تم پر کر رہا ہوں اگر تم کچھ بھی لحاظ نہیں کرتے تو نہ کرو مگر ہم قبیلہ ہونے کا اور اس قرابت داری کا تو خیال کرو جو میرے اور تمہارے درمیان میں واقع ہے۔

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (۲۳/۴۲)

ترجمہ :- اے پیغمبر اسلام! آپ کہہ دیجئے کہ میں اپنی اس

جد و جہد پر (جو میں تمہارے اصلاح کے لئے کر رہا ہوں)
تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا مگر کیا قرابت داری کی محبت و
الفت بھی ختم ہو گئی۔

عربی زبان میں رشتہ داری کا حق ادا کرنے کو وَصْلِ رَحْمَ (رحم ملانا) اسی لفظ کی دوسری معروف شکل صلہ رحم (رحم ملانا) ہے اور قرابت داری کے حقوق ادا کرنے کو قطع رحم (رحم کو کاٹنا) کہتے ہیں۔ کیونکہ رشتہ داریوں کے تعلقات کی اصل جڑ رحم مادری ہی ہے۔ کسی معاملہ میں دو انسانوں کے اشتراک کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ہم عمری، ہم درسی، ہم سائیگی، ہم مذاقی، ہم پیشگی، ہم وطنی، ہم قومی اس کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ ان سب اشتراکوں کی وجہ سے انسانوں میں عقد محبت استوار ہوتا ہے اور اسے قائم رکھنے کے لئے جانبین کی طرف سے کوشش کی جاتی ہے کہ حقوق و فرائض کی نگہداشت کریں اور انہیں با حسن وجوہ ادا بھی کریں تاکہ وہ قوی سے قوی تر ہوتے چلے جائیں۔ لیکن ان تمام بندھنوں میں قوی ترین بندھن وہ تعلق ہے جو رحم مادر سے وابستہ ہے۔ یہ ہم رحمی حق تعالیٰ کی باندھی ہوئی گرہ ہے جو مختلف انسانی ہستیوں کو ایک لڑی میں پرو دیتی ہے۔ اور اپنے دست قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے۔ جس کو توڑنا انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت سب سے زیادہ ضروری ہے۔

جو لوگ محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں

اُنہیں زبان وحی نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور ان کو ضلالت و گمراہی کا مستحق ٹھہرایا ہے:۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (۲ / ۲۶-۲۷)

ترجمہ:۔ اس سے وہ انہی فاسقوں کو گمراہ کرتا ہے جو اللہ کے عہد کو اس کے مضبوط طور پر بندھ جانے کے بعد توڑتے ہیں اور جسے اللہ نے ملانے کا حکم دیا ہے اسے قطع کر دیتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جو مجھے جنت میں لے جائے۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کرو۔ صلوٰۃ ادا کرو، زکوٰۃ دو، اور اپنی قرابت کا حق ادا کرو۔ (بخاری کتاب الادب باب فضل صلۃ الرحم)

حضرت جبیر ابن مطعمؓ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو صلہ رحمی (یعنی اپنے قرابت داروں کا حق ادا) نہیں کرے گا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

(بخاری، کتاب الادب، باب اثم القاطع)

مطلب یہ ہے کہ جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک نہیں ہو سکے گا جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہو جائے یا اس کو اس کی سزا نہ مل جائے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جسے اس کی آرزو ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ صلہ رحمی کرے۔

(صحیح بخاری کتاب الادب باب من بسط لہ الرزق لصلۃ الرحم)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس نیک عمل کا نتیجہ واقعی یہ ہوتا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صلہ رحمی سے انسان رشتہ داروں کے خانگی جھگڑوں اور خاندانی افکار سے محفوظ رہتا ہے جس کی وجہ سے انسان کو رزق میں فراوانی اور عمر میں برکت نصیب ہوتی ہے کیونکہ انسانی زندگی خانگی افکار اور خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے غم والم کی بناء پر کوتاہ ہو جاتی اور اکتساب رزق کی جدوجہد میں سستی اور کوتاہی کا باعث بن جاتی ہے۔

احادیث نے اس کو بھی واضح کر دیا ہے کہ صلہ رحمی اس کا نام نہیں کہ کسی نے تمہارے ساتھ کوئی نیک سلوک کیا تو تم نے بھی اس کے بدلہ میں اس کے ساتھ نیک سلوک کر دیا۔ بلکہ اصل صلہ رحمی یہ ہے کہ کوئی رشتہ دار تمہارے ساتھ بُرا سلوک کرتا ہے اور تم پھر بھی اس کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

(ایضاً باب لیس الواصل بالمکافی)

ایک حدیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے کہ "رحم" کا لفظ رحمٰن (اللہ کے نام) سے مشتق ہے۔ چنانچہ محبت والا اللہ رحم کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ جو تجھے ملائے گا میں اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کرے گا میں اسے قطع

کردوں گا۔ (صحیح بخاری کتاب البر والصلۃ)

رحم اور رحمان کے اس تعلق کی طرف خود قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے :۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ

(۴/۱)

ترجمہ :۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے نام کی اور رشتہ داریوں کے تعلق کی دُہائیاں دیا کرتے ہو۔

یعنی جب تمہیں کوئی مشکل پیش آتی ہے تو لوگوں کو اللہ کے واسطے دیتے ہو اور رشتہ داریوں کے بھی واسطے دیتے ہو تو تمہیں اللہ سے ڈرتے رہنا بھی چاہیئے۔ چونکہ یہ تمام رشتہ داریاں اللہ ہی کی پیدا کردہ ہیں لہٰذا یہ بھی اسی کا احسان ہے۔ لہٰذا ان دونوں باتوں کا تقاضا ہے کہ تم بھی اللہ کا تقویٰ پیدا کرو۔

(ھمسایہ کے حقوق)

ہم سایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں۔ انسانیت اور تمدن و تہذیب کی بنیاد ہی باہمی اشتراکِ عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان دوسرے کی مدد کا محتاج ہے۔ اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ وہ دوسرے کو بھی کھِلائے۔ اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہے اسے چاہیئے کہ وہ دوسرے کی تیمارداری کرے۔

ایک پر کوئی مصیبت آپڑے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے اور اس طرح انسانوں کی مجموعی آبادی باہمی محبت و یگانگت اور سلوک کی گرہ میں بندھ کر ایک وحدت بن جائے۔ تمام مذاہبِ عالم نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوں آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہی وقت پر ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ آس پاس رہنے کی وجہ سے جتنا نقصان پڑوسی ایک دوسرے کو پہنچا سکتا ہے اتنا نقصان کوئی دوسرا آدمی نہیں پہنچا سکتا اس لئے ضروری ہے کہ ان کے درمیان موانست اور یگانگت ہو تاکہ ایک دوسرے کے ضرر سے محفوظ رہ سکے۔

عربوں میں اسلام سے پہلے بھی ہمسائیگی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ہر شخص اسے اپنے لئے شرم اور عار کا باعث سمجھتا تھا کہ کوئی آدمی اس کے پڑوسی پر کوئی ظلم ڈھا سکے۔ وہ پڑوسی کی خاطر بڑی سے بڑی قوت سے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ وہ اسے اپنی شرافت کا نشان سمجھتے تھے۔ اسلام نے ان جذبات میں کچھ ترامیم اور اصلاحات کر کے اسے اور قوی بنا دیا ہے۔

اسلام نے پڑوسی کے ساتھ ایک دوسری قسم کے ہمسایہ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ جو اس معنے میں پڑوسی نہیں ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ رہتا بستا ہے۔ لیکن اس معنے میں ضرور ہمسایہ ہے کہ اس کے ساتھ اس کا زیادہ تر وقت گذرتا ہے۔ یعنی سفر کا رفیق، اسکول، کالج اور مدرسہ کا ہم سبق، ایک کارخانہ میں ساتھ کام کرنے والا، ایک ہی

استاذ کے دو شاگرد، ایک ہی دوکان کے دو شریک، ایک ہی ٹیم کے دو کھلاڑی، ایک ہی دفتر کے دو ملازم، یہ اگرچہ الگ الگ رہتے اور بستے ہیں۔ لیکن ان کا زیادہ تر وقت ایک ساتھ گذرتا ہے۔ اس کا دوسرا صحیح نام رفیق، ساتھی (اور صاحب) ہے۔ ان سب میں جو شخص دوہرا تعلق رکھتا ہو یعنی ہمسایہ بھی ہو اور رشتہ دار بھی اس کا حق اس سے مقدم ہے جو صرف ہمسایہ ہے رشتہ دار نہیں۔ اور جو صرف ہمسایہ ہے اس کا حق اس سے مقدم ہے جو آپ کا رفیق اور ساتھی (الصاحب بالجنب) ہے۔

سورۂ نساء میں ہے:

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ
وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ ($\frac{4}{36}$)

ترجمہ:۔ اور ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں قرابت دار ہمسایوں، اجنبی ہمسایوں اور ہم مجلس لوگوں (پہلو کے ساتھیوں) کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

بعض علماء نے اَلْجَارِ الْجُنُبِ سے مراد وہ پڑوسی لئے ہیں جو مسلمان نہ ہوں بلکہ کسی دوسرے مذہب کے پیرو ہوں، مثلاً یہودی، عیسائی، پارسی، مشرک وغیرہ۔ یہ معنے بھی صحیح ہوسکتے ہیں۔ اس سے اسلام کی فراخ دلی کا ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ وہ غیر قوموں کے لوگوں کے ساتھ بھی اگر وہ تمہارے پڑوس میں رہتے ہوں حسنِ سلوک کی تاکید فرماتا ہے۔

مگر ہمارے بیان کردہ معنیٰ قرآنی وسعت کے زیادہ مطابق ہیں، کیوں کہ قریبی ہمسایوں کے ساتھ دور کے ہمسایوں کا بھی تذکرہ آجاتا ہے۔ اور چوں کہ قرآن نے انہیں مطلق بیان فرمایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قریبی اور دور کے ہمسائے چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، بہر صورت ان کے حقوق ہیں۔

اس حکم الٰہی کی تفسیر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات سے فرما دی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ آپؐ صحابۂ کرام کے مجمع میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے فرمایا۔ خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں۔ خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں، خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں۔ صحابہ نے پوچھا۔ اے اللہ کے رسول! کون مؤمن نہیں ہوسکتا؟ آپ نے فرمایا "وہ آدمی جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہ ہو۔" (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب اثم من لا یامن جارہ بوائقہ)

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا "جو اللہ پر اور یوم جزا پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیئے کہ وہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔"

(صحیح بخاری کتاب الادب)

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جو شخص اللہ پر اور روزِ جزاء پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو ایذاء نہ دے۔"

(صحیح بخاری کتاب الادب)

ایک اور موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا "اللہ کے نزدیک بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے رفقاء کے لئے بہتر ہو، اور پڑوسیوں

میں بہتر پڑوسی وہ ہے جو اپنے ہمسایوں کے لئے بہتر ہو۔"

(ترمذی، ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی حق الجار)

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "جبریلؑ نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید فرمائی کہ میں سمجھا کہ وہ اسے وراثت کا حق دلا دیں گے۔"

(بخاری کتاب الادب)

آپ کے اس ارشاد سے پتہ چلا کہ پڑوسی کا حق قریب ترین رشتہ داروں سے کچھ ہی کم ہے۔ وہ ان کے حق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

پڑوسیوں میں محبت، یگانگت اور بھائی چارے کی ترقی و استحکام کا ذریعہ باہم ہدایا اور تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے اس لئے آپ ازواج مطہرات کو اس کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میرے دو پڑوسی ہیں، میں پہلے کسے ہدیئے بھیجوں، آپ نے فرمایا جس کے گھر کا دروازہ تمہارے دروازے سے قریب ہو۔

(بخاری۔ کتاب الادب باب حق الجار فی قرب الابواب)

یہ ضروری نہیں کہ یہ تحائف قیمتی ہی ہوں، کھانے پینے کی معمولی اشیاء بھی ہو سکتی ہیں۔ گھر میں کوئی خاص چیز پکے تو اپنے پڑوسیوں کے ہاں بھی بھیج دینی چاہیئے۔ اور بھی کچھ نہ ہو سکے تو معمولی سالن ہی بھیج دینا چاہیئے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو جو زہد و قناعت میں مشہور ہیں آپ نے نصیحت فرمائی تھی۔ اے ابوذر! شوربا پکاؤ تو

اس میں پانی زیادہ ڈال دیا کرو تاکہ اپنے ضرورت مند پڑوسیوں کی بھی خبرگیری کر سکو۔

(صحیح مسلم. کتاب البر والصلۃ باب ماجاء فی حق الجوار)

اس قسم کے تحائف اور ہدایا بھیجنے کا موقعہ عورتوں کو زیادہ پیش آتا ہے۔ لہٰذا آپ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں ہی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "اے مسلمان بیبیو! تم میں سے کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے تحفہ کو حقیر نہ سمجھے۔ اگرچہ وہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو۔ (صحیح بخاری کتاب الادب باب لا تحقرن جارۃ لجارتہا)

اس حدیث میں یہ نصیحت دونوں کو کی گئی ہے۔ تحفہ بھیجنے والی کو بھی کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ معمولی چیز ہے اسے کیا بھیجوں اور اس پڑوسن کو بھی جسے کوئی تحفہ بھیجا جائے کہ بی پڑوسن کو شرم نہیں آئی۔ یہ انہوں نے کیا بھیجا ہے۔ یعنی ہدیہ اگر حسب استطاعت ہو چاہے کم ہو تو بھیجنے والی اس وجہ سے ہدیہ بھیجنے سے رکے نہیں اور وصول کرنے والی اسے حقیر نہ سمجھے۔

ایک مسلمان کی مروت اور شرافت سے بہت ہی بعید ہے کہ خود تو پیٹ بھر کر مرغن نعمتیں اڑائے اور پہلو میں اس کا پڑوسی مصیبت اور فاقہ میں رہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مؤمن وہ نہیں جو خود تو شکم سیر ہو کر کھائے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا سوئے۔

(بیہقی و ادب المفرد امام بخاری)

برائی، برائی ہے اور گناہ، گناہ ہے۔ لیکن اگر برائی اور گناہ

ایسے موقعہ پر اور ایسی جگہ کیا جائے جہاں بھلائی کرنی چاہیئے تھی تو وہ برائی شدید تر گناہ بن جاتی ہے۔ شراب نوشی ایک جرم ہے اور گناہ ہے لیکن اگر یہی جرم اور یہی گناہ عین کعبہ کی چاردیواری میں کیا جائے تو اس جرم کی شدت شدید ترین ہو جاتی ہے۔ زنا ایک جرم اور گناہ ہے۔ لیکن اگر یہی جرم اور گناہ مسجد میں کیا جائے تو اس کے شدید ترین جرم ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ اسی طرح چوری کرنا بہت بڑا جرم ہے لیکن اگر پڑوسی کے گھر میں چوری کی جائے تو یہ انتہائی گھناؤنا جرم ہوگا۔ بدکاری جس جگہ بھی ہو بدکاری ہے لیکن اگر پڑوس کی کسی عورت کے ساتھ یہی جرم کیا جائے تو اس کے بھیانک جرم ہونے میں کیا شبہ کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ تورات میں ہے:۔

تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔ تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر، تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو پڑوسی کی ہے لالچ نہ کر۔ (خروج ۲۰-۱۷)

تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر نہ اس سے کچھ چھین لے۔

(احبار ۱۳-۱۹)

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی تورات کے ان احکام پر یہ اضافہ فرما کر معاملہ کو اور سنگین بنا دیا کہ:۔

مدزنا حرام ہے۔ اللہ اور اس کے رسول نے اسے حرام کیا ہے۔

لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ چوری حرام ہے۔ اللہ اور اس کے رسول نے اسے حرام کیا ہے لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے چوری کرے۔"

(ادب المفرد بخاری باب حق الجار)

حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا:۔

"تو اپنے پڑوسی سے ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو۔"

(مرقس ۱۲ - ۳۰)

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دو قدم آگے بڑھ کر ارشاد فرمایا:۔

"تم میں کوئی شخص ایماندار ہی نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے پڑوسی کی جان کے لئے وہی پیار نہ رکھے جو خود اپنی جان کے لئے پیار رکھتا ہے۔" (صحیح مسلم۔ کتاب الایمان)

نیز اور آگے بڑھ کر یہ بھی فرمایا:۔

جس کو یہ بات پسند ہو کہ اللہ اور اس کا رسول اسے پیار کرے یا جس کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو تو اسے لازم ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے۔"

(مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی)

پڑوسی کے ساتھ طرزِ عمل انسانی اخلاق کا معیار ہے

نیز آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں سب سے پہلے دو آدمی پیش

ہوں گے جو پڑوسی ہوں گے۔

(احمد ابن حنبل ۔مسند عقبہ ابن عامر)

آدمی کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا اور بہترین معیار یہ ہے کہ اسے وہ لوگ اچھا کہیں جو اس کے قریب تر ہوں چنانچہ ایک دن صحابہ نے دریافت کیا کہ اے رسول اللہ! ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھے اعمال کر رہے ہیں یا بُرے۔ فرمایا کہ جب تم اپنے پڑوسی کو اپنے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کرتے سنو تو سمجھو کہ تم واقعی اچھے اعمال کر رہے ہو اور جب اپنے پڑوسی کو اپنی بدگوئی کرتے سنو تو سمجھو کہ تم برے اعمال کر رہے ہو۔ (سنن ابن ماجہ)

مذکورہ بالا آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے ظاہر ہے کہ اسلام نے ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ گذشتہ ادیان میں لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ لیکن اسلام نے ان کی تعلیمات وہدایات پر کچھ اضافے ہی کئے ہیں ان میں کوئی کمی نہیں فرمائی بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اسلام نے ان ہدایات کی تکمیل فرمائی ہے۔

(یتیموں کے حقوق)

جو بچہ یا بچی باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو جائے تو جماعت کے ہر فرد کا فرض ہے کہ اسے اپنے آغوش محبت میں لے کر اس کی

دلجوئی و دلدہی میں پوری کوشش کرے اور ہر طرح اس کی خبر گیری کرے۔ اگر اس کا باپ کچھ مال اس کے لئے چھوڑ گیا ہے تو اس کی حفاظت کرے۔ اس کی تعلیم و تربیت کی فکر کرے اور جب وہ اس قابل ہو جائے کہ اپنے بھلے برے کو سمجھ سکے تو اس کا مال و متاع اس کے حوالہ کر دے۔ یتیم لڑکی ہو تو اس کی پرورش کرے امور خانہ داری کی تعلیم دے، زیور علم سے اسے آراستہ کرے اور جوان ہو جانے پر اس کی شادی کا بندوبست کرے۔

عربوں میں چونکہ قتل و غارت گری کا بازار گرم رہتا تھا۔ قبائل میں باہمی جنگ و جدال ہوتا ہی رہتا تھا اس لئے قدرۃً عربوں میں یتیموں کی کثرت بھی تھی۔ لیکن ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوتا تھا۔ نہ ان کی غور و پرداخت کا کوئی انتظام تھا نہ وہ اپنے باپ کی وراثت سے کچھ حصہ پاتے تھے۔ کیونکہ عربوں میں چھوٹے بچوں کو وراثت میں حصہ دینے کا کوئی رواج نہیں تھا۔

(تفسیر ابن جریر طبری، سورۂ نساء صفحہ ۱۷/۴)

عموماً یتیموں کے ساتھ بہت ہی برا برتاؤ ہوتا تھا۔ رحم و شفقت کے بجائے قساوت و سنگدلی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ قرآن کریم میں ان کی بدسلوکیوں کا بیان بار بار کیا گیا ہے مثلاً:۔

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ○ فَذٰلِكَ
الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ○ (۱۰۷/۱-۲)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر! کیا آپ نے اسے دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

ایک دوسری آیت میں ان ظالموں کا بیان کیا گیا ہے جن کی تولیت میں یتیم بچے ہوتے تھے اور وہ اس خوف سے کہ یہ جوان ہو جائیں گے تو ان کا مال اُنہیں واپس کرنا پڑے گا جلد از جلد اسے کھا پی کر ختم کر ڈالنا چاہتے تھے۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ○ وَلَا تَحَاضُّونَ
عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ○ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ
أَكْلًا لَّمًّا ○ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ○

(۸۹ / ۱۷ — ۲۰)

ترجمہ: نہیں، یہ بات نہیں۔ بلکہ تم یتیم کی عزت ہی نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو۔ اور مُردے کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیا کے مال و دولت پر جی بھر کر ریجھتے ہو۔

اسلام سے پہلے دیگر ادیان میں اس قابل رحم طبقہ کے ساتھ شفقت و رحمت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ تورات میں عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیموں کا نام بھی دو ایک جگہ مل جاتا ہے۔ مثلاً

"شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں۔" (استثناء ۱۴ - ۲۹، ۲۶ - ۱۲)

مگر انجیل مقدس میں تو کہیں ان کا تذکرہ بھی نہیں آیا اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مظلوم فرقہ کی اصل داد رسی کا وقت اُسی وقت آیا جب مکہ کا ایک دُرِّ یتیم اللہ کی آخری

اور مکمل شریعت لے کر اس دنیا میں ظہور پذیر ہوا۔ وحی الٰہی نے سب سے پہلے اسی کو خطاب کر کے یاد دلایا:۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ .... فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ (۹۳/۹،۶)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر! کیا اللہ نے آپ کو یتیم ہی نہیں پایا تھا؟ تو اس نے آپ کو پناہ دی ...... تو آپ یتیم پر ذرا سی سختی بھی نہ کیجئے۔

مکی زندگی میں آپ کی تعلیمات زیادہ تر اصول دین یعنی توحید ورسالت، عقیدۂ آخرت وغیرہ کے بعد غریبوں یتیموں اور مسکینوں کی خبرگیری اور اعانت ہی سے متعلق رہی ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا ہی اصل کامیابی ہے۔ اور اس گھاٹی کو پار کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ظلم وستم کے گرفتاروں کی گردنیں چھڑائی جائیں، بھوکوں کو کھلایا جائے، یتیموں کی خبرگیری کی جائے۔

اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ (۹۰/۱۵-۱۴)

ترجمہ:۔ یا بھوک کے دن کسی قرابت دار یتیم کو کھانا کھلایا جائے۔

نیک اور صالح لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو:۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا

وَّاَسِیْرًا ۝ (۸/۶)

ترجمہ: باوجود خود اپنی شدید خواہش کے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلاتے ہیں۔

مدینہ منورہ آنے کے بعد ان اخلاقی اپیلوں اور سفارشوں نے قانونی شکل اختیار کرلی۔

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰٓی اَمْوَالَھُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَھُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِکُمْ اِنَّہٗ کَانَ حُوْبًا کَبِیْرًا ۝ (۴/۲)

ترجمہ: اور یتیموں کو ان کے مال حوالے کردو اور پاک مال کے ساتھ ناپاک مال کو نہ بدل لو اور ان کے اموال کو اپنے مالوں کے ساتھ ملاکر نہ کھاؤ۔ یقیناً یہ بڑا ہی گناہ ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَھَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْھُمْ فِیْھَا وَاکْسُوْھُمْ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْھُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَیْھِمْ اَمْوَالَھُمْ وَلَا تَاْکُلُوْھَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ یَّکْبَرُوْا وَمَنْ کَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ ج وَمَنْ کَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْکُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ط فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْھِمْ اَمْوَالَھُمْ فَاَشْھِدُوْا عَلَیْھِمْ ط وَکَفٰی بِاللّٰہِ

ترجمہ:۔ اور نادانوں کو اپنے وہ مال حوالے نہ کردو جنہیں اللہ نے تمہارے لئے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا ذریعہ بنایا ہے۔ ہاں انہیں ان مالوں سے کھلاؤ پلاؤ، اور پہناؤ اور ان سے اچھی باتیں کرو۔ اور یتیموں کو برابر آزماتے رہو حتیٰ کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں (بالغ ہو جائیں) تو اگر تم ان میں صحیح سوجھ بوجھ محسوس کرو تو انہیں ان کے مال حوالے کر دو اور انہیں فضول خرچی کر کے جلد جلد خرچ نہ کر ڈالو کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (تو انہیں دینا پڑے گا) جو یتیموں کے مال سے بے نیاز ہو اسے ان سے بچنا ہی چاہیئے۔ البتہ جو ضرورت مند ہو تو وہ اس میں سے دستور کے مطابق (خدمت کا معاوضہ سمجھ کر) کھا سکتا ہے۔ پھر جب تم ان کے مال ان کے حوالے کر رہے ہو تو اس پہ گواہ بنا لیا کرو اور اللہ حساب لینے کے لئے بہت کافی ہے۔

اس آیت کریمہ میں یہ بات خاص طور پر توجہ طلب ہے کہ جبتک یتیموں کے اموال ان کے اولیاء کی تحویل میں رہیں تو انہیں قرآن کریم نے اَمْوَالَکُمْ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی حفاظت ایسے کرو جیسے تم خود اپنے مالوں کی کرتے ہو۔ یہ نہ سمجھو کہ یہ تو کسی غیر کا مال ہے۔ اپنا مال تھوڑے ہی ہے کہ ہم زیادہ دردسری کریں اور جب انہیں یتیموں کے حوالے کرنے کا وقت آجائے تو اسے قرآن کریم نے اَمْوَالَھُمْ فرمایا ہے۔ یعنی تمہارا مال نہیں

ہے۔ وہ یتیموں کا مال ہے لہٰذا پائی پائی کا اور تنکے تنکے کا حساب کرو۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے اور بلاغت و فصاحت کا کمال ہے۔

یتیموں کی خبر گیری اور ان کی مناسب پرورش کے سلسلہ میں قرآن کریم نے کس قدر دل گداز انداز میں اپیل فرمائی ہے۔

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ اِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۝ (۴/۹-۱۰)

ترجمہ :۔ لوگوں کو ڈرنا چاہیئے جو خود بھی اگر اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمزور بچے چھوڑ جائیں تو انہیں ان کے بارے میں کس قدر اندیشے ستائیں گے۔ تو وہ اللہ سے ڈریں اور صحیح صحیح بات کریں۔ یقیناً جو لوگ یتیموں کا مال ظلم و ستم کر کے کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں جہنم کے انگارے بھرتے ہیں اور وہ عنقریب جہنم رسید ہو کر رہیں گے۔

کس قدر چبھتی ہوئی حقیقت ہے کہ لوگوں کو سوچنا چاہیئے۔ کل کو یہی وقت ان کی اولاد پر بھی پڑ سکتا ہے۔ تم کون سا اللہ کے یہاں سے پٹہ لکھا کر لائے ہو کہ تمہیں اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک تمہارے بچے جوان نہ ہو جائیں۔ زندگی اور موت پر کس کو اختیار ہے۔ اگر کل کو تم بھی مر گئے تو تمہارے بچوں کا بھی یہی حال ہو گا کہ وہ تمہارے وارثوں اور قرابت داروں کے رحم

کرم پر ہوں گے۔ تم اچھی مثال قائم کرو۔ تم دوسروں کے ساتھ بھلائی کرو تاکہ لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں۔

چنانچہ سورۂ انعام میں ہے کہ:-

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ (۶/۱۵۲)

ترجمہ:- یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو مگر اسی طریقہ سے جو (ان کے حق میں) بہترین ہو حتیٰ کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائیں۔

یہ تو ان یتیموں کی بات تھی جن کے ماں باپ ان کے لئے کچھ جائداد یا مال و متاع چھوڑ مریں۔ ان کے علاوہ بے شمار یتیم ایسے بھی تھے اور زیادہ تر ایسے ہی ہوتے ہیں جو غریب، مفلس اور نادار ہوتے ہیں ان کی مناسب پرورش اور امداد و اعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ، سورۂ نساء، سورۂ انفال اور سورۂ حشر میں بار بار ان کی پرورش اور ان کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے اور یتیمیٰ و مساکین کو خیرات صدقات اور زکوٰۃ کا بہترین مصرف قرار دیا گیا۔ چنانچہ ملاحظہ ہوں آیات (۲/۸۳، ۲/۱۷۷، ۲/۲۱۵، ۲/۲۲۰، ۴/۸، ۴/۳۶، ۴/۱۲۷، ۸/۴۱، ۵۹/۷) حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ارشادات سے قوم کو مسلسل اس طرف متوجہ فرمایا۔ چنانچہ یتیموں کی خبرگیری کرنے والوں کو جنت میں اپنی ہمسائیگی کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا کہ جو یتیم کی پرورش کرتا ہے وہ میرے ساتھ جنت میں اس طرح ہوگا جیسے ہاتھ کی یہ دو انگلیاں برابر برابر ہیں۔

(صحیح بخاری، باب فضل من یعول یتیما و صحیح مسلم، باب فضل الاحسان الی الیتیم)

اور فرمایا کہ مسلمانوں کا سب سے اچھا گھروہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ حسن سلوک کیا جارہا ہو اور بدترین گھروہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جارہی ہو۔

(ابن ماجہ وادب المفرد وترغیب وترہیب منذری)

چنانچہ آپؐ کی ان تعلیمات وہدایات کا اثر تھا کہ عربوں کی بالکل ہی کایا پلٹ گئی۔ وہ عرب جو یتامیٰ کے اموال کو شیر مادر سمجھتے تھے اور بیکس وناتواں یتیموں کے لئے جن کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت تھے وہ موم سے زیادہ نرم ہوگئے۔ ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا۔ ایک ایک یتیم کے لئے شفقت ومحبت کے کئی کئی ہاتھ بڑھنے لگے۔ اور ہر ایک اپنا استحقاق جتانے لگا کہ میرا المتوفی سے یہ تعلق تھا اس لئے میں زیادہ حقدار ہوں کہ اس کے بچوں کی پرورش کروں۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا کاشانہ انصار ومہاجرین کی یتیم بچیوں کے لئے پرورش گاہ بن گیا تھا۔ (موطا امام مالکؒ، مسند احمد ج ۶ ص ۲۶۹ وتذکرۃ الحفاظ)

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا یہ حال تھا کہ جب تک دسترخوان پر کوئی یتیم بچہ شریک طعام نہ ہو وہ لقمہ نہیں توڑتے تھے۔

(ادب المفرد باب فضل من یعول یتیما)

چنانچہ حضرات صحابۂ کرام آپ کی ان تعلیمات کے بعد نہ صرف یتیموں کے اموال کی محافظ اور ان کی تولیت ونگرانی میں انتہائی دیانتدار

اور امین بن گئے بلکہ ان کے بارے میں نہایت فیاض اور سیر چشم بھی بن گئے۔ ایک مرتبہ ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک کھجوروں کے باغ کا دعویٰ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش کیا جس کا وہ ثبوت پیش نہ کر سکا۔ آپ نے اس کا دعویٰ خارج کر دیا تو وہ رو پڑا۔ آپ کا دل بھر آیا اور آپ نے اس شخص سے سفارش کی کہ تم یہ باغ اسی یتیم کو دیدو۔ مگر وہ نہیں مانا۔ اس وقت آپ کی خدمت میں ابوالدحداح صحابی حاضر تھے۔ انہوں نے اس شخص سے کہا کہ تم اس باغ کو میرے فلاں باغ سے بدل لو۔ وہ اس پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ حضرت ابوالدحداح نے وہ باغ اس سے لے کر اپنی طرف سے اس یتیم کو بخش دیا۔

(استیعاب لابن عبدالبر تذکرہ حضرت ابوالدحداح)

آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں۔ لیکن ان سب کا کریڈٹ مکہ معظمہ کے اس یتیم کو جاتا ہے جس نے سب سے پہلے اس مظلوم طبقہ کی دادرسی فرمائی۔ اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے یتیموں کو ان کا حق دلایا۔ چنانچہ جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتیں قائم کیں ہر جگہ یتیموں کے لئے پرورش گاہیں تعمیر کیں اور قانوناً اپنے قاضیوں کا یہ فریضہ مقرر کیا کہ وہ یتیموں کے اموال اور جائیدادوں کا انتظام و انصرام کریں، ان کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت اور شادی بیاہ کا انتظام کریں جس کی پیروی میں آج دنیا بھر میں یتیم خانے قائم ہوتے چلے گئے۔

(بیوہ کے ساتھ حسن سلوک)

قدیم زمانہ سے ہر معاشرہ میں بیوہ عورتیں انتہائی مظلوم و مقہور چلی آتی ہیں۔ یہودی مذہب میں ایک بیوہ عورت شوہر کے مر جانے کے بعد اس کے بھائی کی ملکیت ہو جاتی تھی۔ عیسائی مذہب میں یہ قانون تو جاتا رہا مگر اس نے اس طبقہ کے لئے کوئی مثبت پہلو پیش نہیں کیا۔ ہندوستان میں شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کو شوہر کی چتا میں جل جانا یا پھر نہایت قابل رحم حالت میں دنیا کی تمام آسائشوں سے محروم ہو کر ساری عمر سوگ میں گذارنی پڑتی تھی۔ خود عربوں میں یہ رواج تھا کہ شوہر کے مرنے کے بعد ورثہ میں سے جو کوئی اس پر اپنی چادر ڈال دیتا وہ اسی کی ملکیت ہو جاتی تھی۔ وہ جو سلوک چاہتا اس کے ساتھ کرتا۔ طرح طرح کی اذیتیں دے کر اس سے دین مہر معاف کراتا اور اسے اپنی مرضی کے بغیر کہیں نکاح ثانی نہ کرنے دیتا۔

اسلام آیا تو اس نے دیگر مظلوم طبقوں کے ساتھ اس طبقہ کی دادرسی بھی فرمائی۔ اس نے سب سے پہلے تو یہ اصلاحی قدم اٹھایا کہ لامحدود سوگ منانے کے عرصہ کو چار ماہ دس دن تک محدود کر دیا اسے شوہر کے ترکہ میں حصہ دلایا۔ اور اس سوگ کے عرصہ کا نان و نفقہ میت کے ورثہ پر رکھا۔ اگر شوہر نے اس کا مہر ادا نہیں کیا تھا تو میت کے ترکہ میں سے سب سے پہلے دین مہر کی ادائیگی ضروری قرار دی۔

سوگ کے زمانہ کا نام "عدت" رکھا اور اس کے بعد اسے اپنی مرضی سے نکاح ثانی کرنے کی اجازت دی۔ شوہر کے ذمہ ضروری قرار دیا کہ اپنے ورثہ کو وصیت کر کے جائے کہ اس کی بیوی کو سال بھر تک اس کے گھر سے نہ نکالا جائے اور اس عرصہ کا اسے نان و نفقہ دیا جائے البتہ اگر وہ اس عرصہ میں نکاح کر لے تو وہ ایسا کر سکتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۲/۲۴۰)

ترجمہ:۔ اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور پیچھے اپنی بیویاں چھوڑ رہے ہوں تو وہ اپنی بیویوں کے حق میں وصیت کر کے جائیں کہ انہیں ایک سال تک خرچ (نان و نفقہ) دیا جائے گھر سے نکالے بغیر۔ پھر اگر وہ (عدت گزار کر) نکل جائیں۔ (نکاح ثانی کر لیں) تو جو کچھ انہوں نے اپنے نفسوں کے بارے میں دستور کے مطابق فیصلہ کر لیا ہے۔ اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں اور اللہ غلبہ اور حکمت والا ہے۔

مگر ہمارے علماء کرام کو بیوہ عورتوں کے ساتھ اسلام کا یہ حسن سلوک پسند نہیں آیا۔ چنانچہ انہوں نے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کو منسوخ ہی قرار دے دیا ہے۔ اس پر ہم جلد دوم فقہ القرآن میں بحث کر چکے ہیں۔ اسے دیکھ لیا جائے۔

(فقہ القرآن صفحہ ۴۳۵ تا ۴۳۸)

اس بے یار و مددگار طبقہ کے ساتھ اسلام نے دوسرا سلوک یہ کیا کہ بیوہ عورتوں کو نکاح ثانی کی اجازت نہیں تھی اسلام نے اس کی ترغیب دی اور اس ظلم کو ختم کیا۔ چنانچہ سورۂ نور میں ہے۔

وَ اَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ۔ (۲۴/۳۲)

ترجمہ:۔ اور اپنے میں سے بیوہ عورتوں کا نکاح کرا دیا کرو۔

خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس بیہودہ رسم کو ختم کر دیا چنانچہ اسلام آنے سے پہلے ہی آپ نے جس خاتون سے نکاح کیا یعنی ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، وہ بیوہ تھیں۔ آپ سے پہلے ان کے دو شوہر یکے بعد دیگرے وفات پا چکے تھے۔ وہ آپ سے عمر میں بھی تین سال بڑی تھیں جس وقت آپ نے ان سے نکاح فرمایا آپؐ کی عمر پچیس (۲۵) سال اور حضرت خدیجہؓ کی عمر اٹھائیس (۲۸) سال تھی۔ عام طور پر ان کے چالیس (۴۰) سال کی جو شہرت ہے وہ صحیح نہیں۔

(تفصیل فقہ القرآن جلد دوم صفحہ ۳۱۱ تا ۳۲۱ ملاحظہ فرمائیں)

اور ان کی وفات کے بعد آپؐ نے دس خواتین کو اپنے حبالۂ عقد میں قبول فرمایا تو ایک یعنی حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سوا باقی نو (۹) ازواج مطہرات بیوہ ہی تھیں۔ یہ تو آپؐ کا عملی نمونہ تھا اور ویسے بھی آپ کے ارشادات اس بارے میں نہایت ہی مثالی ہیں۔ مؤطا امام مالک صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلم میں ہے:۔

اَلسَّاعِیْ عَلَی الْاَرْمِلَةِ وَالْمَسٰکِیْنِ کَالسَّاعِیْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاَحْسِبُہٗ قَالَ کَالْقَائِمِ لَا یَفْتُرُ وَکَالصَّائِمِ لَا یُفْطِرُ۔

ترجمہ:۔ بیوہ عورتوں اور مسکینوں کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسا جہاد میں دوڑ دھوپ کرنے والا ہوتا ہے (راوی کہتے ہیں کہ) میرا خیال ہے کہ آپ نے (یہ بھی) فرمایا تھا کہ وہ اس صلوٰۃ پڑھنے والے کی طرح ہے جو صلوٰۃ پڑھنے سے تھکتا ہی نہیں اور اس صوم رکھنے والے کی طرح ہے جو افطار ہی نہیں کرتا۔ (برابر روزے رکھے چلا جاتا ہے)

بہت سی بیوہ عورتیں محض اس لئے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ دوسری شادی نہیں کرتیں کہ اس سے بچوں کی پرورش وہ ٹھیک طور پر نہیں کرسکیں گی چنانچہ وہ اپنے آپ کو دوسرے نکاح سے روکتی ہیں۔ ایسی عورتوں کی بڑی فضیلت ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:۔

میں اور محنت و مشقت کے سبب جس بیوہ عورت کا رنگ کالا پڑ جائے قیامت کے دن اس طرح برابر برابر ہوں گے جیسے میری دونوں انگلیاں کیونکہ اس نے اپنا حسن وجمال اور جاہ وعزت یتیم بچوں کی پرورش اور خدمت کی خاطر قربان کر دی۔

(سنن ابوداؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیماً)

اسی بات کو آپ نے تمثیلی انداز میں یوں بیان فرمایا کہ:۔

قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا

کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے جنت میں جانا چاہتی ہے۔ میں پوچھوں گا کہ وہ کون ہے؟ تو وہ جواب دے گی کہ میں ایک بیوہ عورت ہوں جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے۔

(مسند ابو یعلیٰ بحوالہ حاشیہ سنن ابو داؤد مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ)

متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی نکاح بیوگان کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر تحریک مجاہدین کے قائد سید احمد شہید و مولانا اسماعیل شہید رحمہما اللہ اور حضرات علمائے دیوبند خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما نے اس کے خلاف بڑا جہاد فرمایا (شکر اللہ مساعیہم) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب اس میں وہ شدت نہیں رہی۔

(حاجت مندوں کے حقوق)

حاجت مند کا لفظ نہایت ہی وسیع معنے کا حامل ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ غریب نادار اور خالی ہاتھ ہی ہو۔ قرآن کریم نے اس کے لئے دو لفظ استعمال فرمائے ہیں اَلسَّائِلُ اور اَلْمَحْرُوْمُ سائل کے معنے بھیک مانگنے والے کے نہیں ہیں بلکہ ہر وہ شخص اس کے مفہوم میں داخل ہے جس کی کوئی ضرورت آپ سے اٹکی ہوئی

ہے۔ اور محروم سے مراد ہر وہ شخص ہے جسے کچھ ملنا چاہیئے تھا مگر کسی آسمانی اور ناگہانی افتاد سے وہ اس سے محروم رہ گیا۔ ایک دولت مند آدمی جس کی کوئی ضرورت یا اس کا کوئی جائز کام آپ سے اٹک گیا ہے وہ بھی سائل ہے۔ حکومت کے دفتروں میں بڑے بڑے دولت مند چکر لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کا کوئی جائز کام ہے جو آپ سے متعلق ہے تو وہ بھی ضرورت مند اور سائل ہے۔ مثلاً ملازمین سرکار کو اپنی ملازمت کے سلسلہ میں کسی بے انصافی کی شکایت ہے۔ وہ آپ سے اس کا ازالہ چاہتا ہے۔ کسی کی پنشن کا معاملہ ہے کسی کے فنڈ کا معاملہ ہے وغیرہ وغیرہ وہ بھیک نہیں مانگتے بلکہ اپنا جائز حق مانگتے ہیں یہ سب سائل (ضرورت مند) ہیں۔ کسی تاجر کا مال کسٹم میں پڑا ہوا ہے اور متعلقہ افسران اس کا مال نہیں چھوڑ رہے آپ کو واقعی ضرورت کے ماتحت ملک سے باہر جانا ہے مگر آپ کو پاسپورٹ، ویزا، این او سی نہیں مل رہا ہے اور متعلقہ عملہ آپ کو بلا وجہ پریشان کر رہا ہے تو آپ بھی سائل (ایک ضرورتمند) ہیں۔ آپ پر کوئی افتاد پڑی اور آپ کی کھیتی برباد ہو گئی۔ آپ کا باغ ویران ہو گیا۔ متعلقہ عملہ آپ سے حکومتی ٹیکس پھر بھی وصول کرنے پر مصر ہے۔ آپ کسی اعلیٰ افسر کے سامنے اپیل کرتے ہیں تو آپ بھی محروم ہیں (یعنی جو کچھ آپ کو کھیتی اور باغ سے حاصل ہونا چاہیئے تھا وہ نہیں ہوا) قرآن کریم میں ذرا سے فرق کے ساتھ دو موقعوں پر ایک آیت ہے۔

فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۵۱/۱۹)

ترجمہ:۔ اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے۔

اور:۔

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ
لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۷۰
۲۴-۲۵)

ترجمہ:۔ اور جن کے مالوں میں ایک متعین حق ہے ہر ضرورت مند اور محروم کا۔

قرآن کریم نے یہاں بتادیا ہے کہ مال تمہارا اپنا ہے۔ تم اس کے مالک اور قابض ہو ضرورت مند اور محروم آدمی کا بظاہر اس کی ملکیت سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ لیکن اس میں بھی ہر ضرورت مند اور محروم کا حق ہے۔ وہ تمہارا مال تک لے سکتا ہے اور بطور اپنے حق کے لے سکتا ہے تو جو ضروریات اس قسم کی ہوں کہ وہ تمہاری ملکیت نہیں ہیں۔ ان میں صرف تمہارے اختیار و اقتدار کو دخل ہے اُن میں ان کا حق کیوں نہ ہوگا۔ قرآن نے ایک انتہائی حد کو بتا کر اس سے کم از کم تمام ضروریات پر ضرورت مندوں کا حق بتادیا ہے اُن کا حق ہے اور حق بھی کوئی مبہم، غیر متعین اور مجمل نہیں ہے بلکہ متعین، مقرر اور واضح حق ہے۔ تمہیں اس کی ضرورت پوری کرنی ہوگی، شرط صرف اتنی ہے کہ وہ ضرورت ناجائز نہ ہو۔ اگر وہ جائز ضرورت ہے تو تمہیں اس میں کوئی تامل، ٹال مٹول اور سستی و کاہلی کا حق نہیں ہے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ○ (۹۳/۱۰)

ترجمہ:۔ اور جہاں تک ضرورتمند کا تعلق ہے تو اسے جھڑکئے نہیں۔

چونکہ اس سے پہلے:۔

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ○ (۹۳/۸)

ترجمہ:۔ اور کیا اللہ نے آپ کو ضرورت مند اور محتاج نہیں پایا تھا تو اس نے تمہیں غنی اور بے نیاز کر دیا۔

غنی کے معنے مالدار سمجھ لئے گئے ہیں اور اس قرینہ سے پچھلی آیت میں سائل کے معنے بھیک مانگنے والے کے کر لئے گئے ہیں۔ یعنی یہ کہ اگر تمہارے پاس کوئی بھیک مانگنے والا آئے تو اسے جھڑکئے نہیں۔ حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اس معنے میں غنی کبھی نہیں ہوئے کہ آپ مالدار، سرمایہ دار سمجھے جائیں۔ آپ نے سونے چاندی کے ڈھیر کبھی بھی جمع نہیں کئے آپ کے پاس جو کچھ آیا۔ آپ نے ہاتھ کے ہاتھ اسے ضرورتمندوں میں تقسیم کر دیا۔ آپ اس معنے میں غنی تھے کہ آپ کبھی کسی انسان کے محتاج نہیں ہوئے۔ آپ کی یہ بے نیازی مالداری اور سرمایہ داری کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ صبر و قناعت کا نتیجہ تھی۔ لہٰذا اَغْنٰی کے معنے یہ ہیں کہ اللہ نے آپ کو بے نیاز بنا دیا۔ ورنہ آپ بھی دنیوی اسباب کے محتاج اور ضرورت مند تھے (یعنی نبوت سے پہلے) لہٰذا آپ ضرورتمندوں کی ضرورتیں حتی الامکان پوری کیجئے اور اُنہیں دھتکاریئے نہیں جس آدمی کو آپ سے جسمانی، مالی، علمی مدد

مددگار ہو وہ سائل اور ضرورت مند ہے۔ ایک ضعیف آدمی سڑک پار کرنا چاہتا ہے مگر ٹریفک کی کثرت کی وجہ سے وہ سڑک پار نہیں کرسکتا۔ وہ آپ سے مدد کا خواستگار ہے کہ آپ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سڑک کی دوسری طرف پہنچا دیں تو وہ بھی سائل (ضرورت مند۔ امداد کا خواستگار) ہے۔ کسی شخص کو کوئی مسئلہ آپ سے دریافت کرنا ہے یا کوئی علمی اور سائنسی فارمولا آپ سے سمجھنا ہے تو وہ بھی سائل (آپ کی رہنمائی اور مدد کا خواہش مند) ہے۔ کسی کا کاروبار ٹھپ ہوگیا ہے وہ آپ سے مالی امداد کا طلبگار ہے تو وہ بھی سائل (امداد کا خواہش مند) ہے۔ لہٰذا سائل کے معنے بھیک مانگنے والے کے نہیں ہیں بلکہ ہر اس شخص کے ہیں جو آپ سے جسمانی، مالی، علمی کسی قسم کی مدد چاہتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر آپ خود براہ راست کوئی مدد نہیں کر سکتے البتہ جس شخص سے کسی کی ضرورت اٹکی ہوئی ہے اس سے آپ اس کی سفارش کر دیتے ہیں تو وہ بھی اس میں داخل ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:-

وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا
وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ
مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۝

(۴/۸۵)

ترجمہ:- جو کسی کی نیک سفارش کرے گا (یعنی دوسرے سے کہہ کر تعاون کرائے گا) اسے اس میں سے حصہ ملے گا۔ اور جو کوئی کسی کی بُری سفارش کرے گا اسے اس میں سے حصہ

ملے گا۔ اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔

یہ آیت کریمہ اگرچہ جنگ کے سلسلہ میں ہے۔ لیکن حکم عام ہے۔ جنگی معاملات اور معاشی و معاشرتی معاملات سب ہی اس میں داخل ہیں۔ ایک اور آیت میں عمومی حکم دیدیا گیا ہے۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ص وَلَا تَعَاوَنُوْا
عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (۵/۲)

ترجمہ:۔ تمام نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ اور گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

غرضکہ ضرورت مندوں کی حاجت برآری اور ان کی جس قدر بھی تم مدد کر سکو یا کسی سے کروا سکو یہ ان کا ایک حق ہے جو ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من كان فى حاجة اخيه كان الله فى حاجته
ومن فرّج عن مسلم كربة فرّج الله عنه كربة
من كربات يوم القيامة۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

ترجمہ:۔ جو اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں مشغول ہوگا تو اللہ اس کی حاجت برآری میں مشغول ہوگا اور جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے اس کی کسی مصیبت کو دور کرے گا۔

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

واللہ فی عون عبدہ ماکان العبد فی عون اخیہ۔ (ترمذی باب ماجاء فی الستر علی المسلمین)

ترجمہ:۔ اللہ اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں مشغول رہتا ہے۔

صحیح بخاری میں ایک روایت ہے کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی ضرورت مند آتا تو آپ صحابہ سے فرمایا کرتے کہ تم سفارش کرو (یعنی دوسرے سے تعاون کروادو) تو تمہیں بھی ثواب ملے گا۔

(بخاری کتاب الادب باب تعاون المؤمنین و باب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ)

یہ بھی فرمایا کہ کسی بھولے بھٹکے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتا دینا بھی صدقہ ہے۔

(ترمذی، کتاب البر والصلۃ)

یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو راستہ چلتے ہوئے کوئی کانٹا (یا پتھر) راستہ سے ہٹا دے تو حق تعالیٰ اس کے اس کام کی قدر کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کر دیتا ہے۔

(ترمذی کتاب البر والصلۃ)

ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ اگر تم سے اور کچھ نہ ہو سکے تو بیکس حاجتمند کی مدد ہی کر دیا کرو۔ (بخاری باب کل معروف صدقۃ)

بہرحال حاجتمندوں کی حاجت روائی کرنا ہر مسلمان کے لئے

ضروری ہے اور اس کا بڑا ثواب ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ وہ ضرورت جائز ہو ناجائز نہ ہو۔

بیماروں اور معذوروں کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری توجہ اور ہمدردی کا مستحق ہے وہ بیماروں اور معذوروں کا طبقہ ہے۔ عام طور پر وہ اپنی خبر گیری اور خدمت خود نہیں کر سکتے۔ انہیں ضرورت ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ ان کی دیکھ بھال، خدمت، غمخواری اور تیمارداری کریں یہ بھی ایک انسانی فریضہ ہے۔ اسے عربی میں "عیادت" کہتے ہیں۔ عیادت کا مادّہ عَوْدٌ ہے جس کے معنے بار بار لوٹنے کے ہیں عیادت سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ آپ بیمار کو جا کر دیکھ آئیں اور اس کی مزاج پرسی کر آئیں۔ بیشک یہ بھی ضروری ہے اور اسے بھی عیادت کہتے ہیں لیکن عیادت صرف یہی نہیں ہے۔ بلکہ حالات کے مطابق بیمار اور معذور آدمی کی دیکھ بھال اور خبر گیری اس میں داخل ہے۔ اگر اسے آپ کی خدمت کی ضرورت ہے تو اس کی خدمت کریں۔ اگر اسے آپ کی غم خواری کی ضرورت ہے تو اس کی غم خواری کریں۔ اگر اس کے لئے کسی ڈاکٹر، حکیم کو بلانے کی ضرورت ہے تو ڈاکٹر اور حکیم کو بلا کر دکھا دیں۔ اگر اسے دوا کی ضرورت ہے تو دوا لا کر دیں۔ جیسے حالات ہوں ان کے مطابق اس کی ضروریات کو پورا کرنا سب عیادت میں داخل ہے۔ ایک

قدیم شاعر جو حجاج کے زمانہ میں گزرا ہے اس کا ایک شعر ہے:۔

ذَهَبَ الرُّقَادُ فَمَا يُحِسُّ رُقَادُ
مِمَّا شَجَاكَ وَنَامَتِ الْعُوَّادُ

ترجمہ:۔ تجھے جو غم پہنچا ہے اس سے نیند اُڑ گئی ہے
تو نیند معلوم ہی نہیں ہوتی اور عیادت کرنے والے
سو گئے۔

یعنی تمہارے مرض سے تمہاری نیند تو اڑ گئی ہے۔ کسی کروٹ نیند نہیں آتی اور تیماردار (عیادت کرنے والے) جو اب تک راتوں کو جاگتے رہتے تھے اب مایوس ہو گئے ہیں اور مایوسی کی وجہ سے انہیں نیند آ گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عیادت کرنے والے راتوں کو جاگا کرتے اور مریض کی دیکھ بھال اور خدمت کرتے رہتے تھے تا آنکہ وہ مریض سے مایوس ہو گئے۔ تو عیادت محض مریض کو دیکھ آنا اور مزاج پرسی کر لینا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں عیادت کرنے والوں کو جاگنا بھی پڑتا ہے۔

ان بیماروں اور معذوروں کے ساتھ اسلام نے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے کہ اللہ کے حقوق میں بھی ان کے ساتھ رعایت و ہمدردی کا سلوک فرمایا ہے۔ جو شرعی تکلیفات ہر مسلمان کے لئے ضروری ہوتی ہیں ان میں یا تو تخفیف فرما دی یا بالکل ہی معافی دیدی ہے۔ سورۃ نور میں ہے:۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ
وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ (۲۴/۶۱)

ترجمہ:- نابینا پر، لنگڑے آدمی پر اور بیمار پر کوئی حرج نہیں ہے الخ

آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ ان ان لوگوں پر کوئی تنگی نہیں ہے اگر وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے گھر سے کچھ بغیر اجازت کھالیں

سورۂ فتح میں ہے:-

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ط (۴۸/۱۷)

ترجمہ:- نابینا پر، لنگڑے آدمی پر اور بیمار آدمی پر کوئی تنگی نہیں ہے۔

آیت کریمہ میں جہاد سے پیچھے رہ جانے والوں کو عذابِ الٰہی کی دھمکی دیئے جانے کے بعد بتلایا گیا ہے کہ ان مذکورہ معذوروں پر کوئی تنگی نہیں ہے۔ انہیں جنگ کی شرکت سے معاف کیا جا سکتا ہے۔

سورۂ توبہ میں بھی جہاد ہی کے سلسلہ میں ارشاد ہے:-

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ (۹/۹۱)

ترجمہ:- کمزوروں پر، اور نہ مریضوں پر اور نہ اُن لوگوں پر جو (جہاد میں) خرچ کرنے کے لئے کچھ نہ پائیں کوئی تنگی نہیں ہے۔

بیماروں کے لیے وضو معاف ہے وہ وضو کے بجائے تیمم کر سکتے ہیں۔ سورۂ مائدہ میں ہے:-

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى ------ فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا

طَيِّبًا (۵/۶)

ترجمہ:۔ اور اگر تم بیمار ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ تو پاک مٹی سے تیمم کرلو۔

مسلمانوں کو تہجد سے معافی دیدی گئی حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ فرض تھا۔ کیونکہ:۔

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى (۷۳/۲۰)

ترجمہ:۔ اللہ کو معلوم تھا کہ تم میں کچھ لوگ بیمار بھی ہوں گے۔

حج کے احکام میں بھی بیماروں سے رعایت فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ حج کا احرام باندھنے کے بعد سر کو منڈانا یا بال کتروانا جائز نہیں ہے لیکن:۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ

(۲/۱۹۶)

ترجمہ:۔ تو جو تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ (سر منڈالے اور) فدیہ دیدے روزہ رکھ کر، کچھ صدقہ کر کے یا قربانی دے کر۔

- اگر آدمی بیمار ہو تو اسے رمضان کے صیام (روزوں) کے قضاء کر دینے کی اجازت دی گئی ہے:۔

وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۚ (۲/۱۸۵)

ترجمہ :۔ اور جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر پہ ہو تو اسے دوسرے ایام سے شمار پوری کر لینے کی اجازت ہے۔

کھڑے ہو کر صلوٰۃ ادا کرنے کی اگر طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر یا لیٹ کر صلوٰۃ ادا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ (۳/۱۹۱)

ترجمہ :۔ جو اللہ کو کھڑے ہو کر، بیٹھ کر اور اپنے پہلوؤں پر لیٹ کر یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں۔

اللہ کو یاد کرنا (ذکر اللہ) قرآن کریم میں صلوٰۃ سے استعارہ ہوتا ہے۔ (تفصیل فقہ القرآن جلد اول میں گذر چکی ہے) ان تمام رعایتوں اور رخصتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے بیماروں اور معذوروں کی کس قدر رعایت فرمائی ہے کہ اپنے بعض فرائض تک کو معاف فرما دیا ہے تو حق تعالیٰ کی ان رعایتوں کے پیشِ نظر بندوں کو بھی اپنے مطالبات میں کسی قدر کمی کر دینی چاہیئے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مؤمن کو دنیا میں جو کچھ بیماری، آزاری تکلیف اور مشقت پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اگر کوئی بیمار ہو جائے اور صبر و شکر کے ساتھ اس تکلیف کو برداشت کرے تو آدمی گناہوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔

(صحیح مسلم باب ثواب المؤمن فیما یصیبہ وسنن ابوداؤد
اوائل کتاب الجنائز)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مؤمن کے لئے اس کی بیماری بھی ایک رحمت ہے۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو نہ صرف عیادت کی تاکید فرمائی بلکہ اس کے ساتھ اس کے آداب کی بھی تعلیم دی، اس کی دعائیں بھی سکھائیں، اس کا ثواب بھی بتایا۔ فرمایا کہ جو کوئی کسی مسلمان کا غم ہلکا کرے گا حق تعالیٰ اس کا غم ہلکا کریں گے۔

(ابوداؤد کتاب الادب فی المعونۃ للمسلم)

نیز فرمایا کہ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کے پانچ حق ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بیمار پڑے تو وہ اس کی عیادت کرے۔

(صحیح بخاری کتاب الجنائز)

صحابہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم عموماً ہمیں سات باتوں کا حکم دیا کرتے تھے جن میں سے ایک بیمار کی عیادت کرنے کا حکم تھا۔ (صحیح بخاری کتاب الجنائز)

آپ نے فرمایا جب کوئی صبح کے وقت بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں اور جب کوئی شام کو بیمار کی عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔

(سنن ابوداؤد، کتاب الجنائز)

آپ نے یہ بھی تعلیم دی کہ جب کسی بیمار کی عیادت کرنے جاؤ

تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھو، اسے تسلی و تشفی دو اور اس کی شفا کے لیئے بارگاہ الٰہی میں دعا کرو۔

(سنن ابو داؤد۔ کتاب الجنائز)

آپؐ کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ آپ اسے ہر مسلمان کا اسلامی حق سمجھتے تھے اور سب کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے اس معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں رکھا تھا چنانچہ آپؐ سے یہودیوں کی عیادت بھی ثابت ہے۔

(صحیح بخاری کتاب الجنائز)

آپؐ نے منافقوں کی بھی عیادت فرمائی ہے۔

(صحیح بخاری کتاب الجنائز)

چنانچہ ہمارے علماء نے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے۔ (مجمع البحار علامہ طاہر فتنی لفظ عیادۃ)

مسجد مسلمانوں کا ہسپتال

حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ جب زخمی ہوئے تو آپ نے ان کے لیئے مسجد نبوی میں خیمہ نصب کرا دیا تھا۔ تاکہ آپؐ ان کی ہمہ وقت خود عیادت فرما سکیں۔

(سنن ابوداؤد۔ کتاب الجنائز)

حضرت رفیدہ رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ تھیں جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اور ان کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ آپؐ نے ان کا خیمہ بھی مسجد نبوی میں نصب کرایا ہوا تھا تاکہ وہ لڑائی میں زخمی ہونے والوں کی مرہم پٹی اور خدمت و تیمار داری کر سکیں۔

(سیرت ابن ہشام غزوۂ بنی قریظہ)

مختلف غزوات اور جنگوں میں بہت سی خواتین اسی مقصد کے لئے ساتھ ہو لیتی تھیں کہ وہ زخمیوں کی خدمت اور مرہم پٹی کریں گی۔

(صحیح مسلم غزوۃ النساء)

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم بار بار یہی تاکید فرمایا کرتے تھے کہ بھوکے کو کھانا کھلاؤ، قیدی کو چھڑاؤ اور بیمار کی عیادت کرو۔

(مسند احمد صفحہ ۳۹۴ ج ۴)

ایک مرتبہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ دریافت فرمائیں گے۔ اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو تو نے میری عیادت نہیں کی، وہ عرض کرے گا کہ اے بارالٰہا تو تو سارے جہان کا پروردگار ہے۔ میں تیری عیادت کیسے کرتا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا مگر تو نے اس کی عیادت نہیں کی تھی۔ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو تو مجھے اس کے پاس ہی پاتا۔

(صحیح مسلم، باب عیادۃ المریض)

کس قدر مؤثر اور دلکش پیرایۂ بیان ہے اور بیمار پرسی، تیمارداری اور غمخواری کی کس قدر دلنشین تلقین ہے اور ایک بیمار آدمی کی کس قدر ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرہانے کھڑا ہے اور اسے اپنی نوازشوں سے نواز رہا ہے۔ کیسے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو بیماروں کی تیمارداری کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی خوشنودی کو حاصل کرتے ہیں۔

مگر ہماری بدقسمتی کہ ہم ان احکامِ الٰہی پر عمل پیرا نہیں بلکہ

مریضوں اور معذوروں کو لوٹنے پر تلے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس مغرب ان تعلیمات پر عمل پیرا ہوکر مریضوں اور معذوروں کے لئے بھی جنت بنا ہوا ہے۔ وہاں کے ہسپتال ان کے عملے والے جہاں مریض کی صحیح اور مکمل خدمت میں مصروف رہتے ہیں، وہاں اجنبی عیادت کرنے والوں سے بھی ہسپتال بھرے رہتے ہیں۔ کاش اگر ہمیں مغرب کی نقالی کرنی ہی ہو تو ان کی اس قسم کی باتوں میں کریں جس سے ہمارا معاشرہ فائدہ حاصل کر سکے۔

(مہمانوں کے حقوق)

عربوں میں مہمانوں کی حفاظت اور ان کی خدمت کی بڑی اہمیت تھی۔ ہر تمدن میں اس کی اہمیت رہی ہے۔ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلۂ اخلاق کی ہے۔ تمدن و تہذیب کی بنیاد ہی باہمی تعاون پر مبنی ہوتی ہے۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان بننا پڑتا ہے۔ آج ہم کسی کے مہمان ہیں تو کل کو ہم اس کے میزبان ہیں۔ ایک دوسرے کے ہاں جانا اور ملنا جلنا تمدن کی ایک معاشرتی ضرورت ہے۔ پرانے زمانہ میں ہوٹل اور ریستوران تو ہوتے نہیں تھے۔ اور لوگوں کو سفر بھی کرنے پڑتے تھے۔ سفر میں دوسروں کے ہاں ٹھہرنا بھی پڑتا تھا۔ آج ہم اپنے مہمانوں کی خدمت کریں تو کل کو ان سے میزبانی کی توقع کر سکتے ہیں۔ یہ ایک تمدنی ضرورت تھی۔ لیکن حیرت ہے کہ مذاہب عالم میں اسلام کے سوا ہمیں

اس کی کوئی اہمیت کسی مذہب میں نظر نہیں آتی۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا تذکرہ سورۂ ذاریات کی ان آیات میں آیا ہے:۔

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ○ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ○ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ○ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ○ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ○ (۵۱/ ۲۴-۲۸)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر اسلام! ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی بات آپ تک پہنچی ہے؟ جب وہ ان کے پاس پہنچے اور انہوں نے السلام علیکم کہا تو ابراہیم نے بھی جواب میں سلام کہا اور (دل میں خیال کیا کہ) یہ کچھ اجنبی (مسافر) ہیں۔ تو وہ چپکے سے گھر والوں کے پاس گئے (کہ کچھ مہمان آگئے ہیں ان کے کھانے کا انتظام کرو) چنانچہ وہ ایک موٹا تازہ بچھڑا (بھنوا کر) لائے اور ان کے سامنے رکھا (مگر انہوں نے گوشت کی طرف قطعًا توجہ نہیں کی) ابراہیمؑ نے کہا! کیا تم کھاتے نہیں۔ چنانچہ ابراہیمؑ نے (اپنے دل میں) خوف محسوس کیا (کہ یہ کھا نہیں رہے۔ کہیں ان کے ارادے تو خطرناک نہیں ہیں) انہوں نے کہا کہ آپ ڈریئے نہیں۔ (یہ ہماری خوراک ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ہم انسان

نہیں ہیں) اور انہوں نے ابراہیم ایک صاحب علم لڑکے کی بشارت دی۔

گذشتہ انبیاء کے قصے اور ان سے حاصل شدہ سبق اگر قرآن یا سنت میں بغیر کسی نکیر کے بیان کئے گئے ہوں تو وہ ہمارے لئے حجت شرعی ہوتے ہیں (تفصیل گذر چکی ہے) یہ واقعہ ہمارے لئے شرعی حجت ہے۔ ان آیات سے میزبانی کے جو آداب معلوم ہوئے وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

① مہمان و میزبان میں کلام کی ابتداء دعاء سلام سے ہونی چاہیئے۔

② جب کوئی مہمان آئے تو فوراً اس کے کھانے پینے کا انتظام کرنا چاہیئے۔ فَرَاغَ کے لفظ میں سرعت کا مفہوم بھی داخل ہے۔

③ کھانے پینے کا انتظام مخفی طور پر ان کی نظر بچا کر کرنا چاہیئے۔ فَرَاغَ کے لفظ میں یہ مفہوم بھی داخل ہے۔ کیونکہ اُس کے معنے چپکے سے چلے جانے، وزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے اور تیزی کے ساتھ کام کرنے کے ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر مہمانوں کے سامنے علانیہ کھانے پینے کا انتظام کیا جائے گا تو وہ ازراہِ تکلف منع کریں گے یا زیادہ تکلف کرنے میں حارج ہوں گے۔

④ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کچھ دیر مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر ان سے الگ ہو جائے تاکہ کھانے پینے کا انتظام کر سکے اور مہمان آزادی کے ساتھ کچھ آرام کر سکیں۔

⑤ مہمانوں کے سامنے کم از کم ایک مرتبہ حسب استطاعت عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے ایک موٹا تازہ

بچھڑا ان کے لئے ذبح کر دیا تھا۔

⑥ کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ انہیں کھانا کھانے کا حکم نہیں دینا چاہیئے۔ جب حضرت ابراہیمؑ کے مہمانوں نے کھانا نہیں کھایا تو آپؑ نے انہیں حکم نہیں دیا بلکہ یہ سوال کیا کہ آپ کھاتے کیوں نہیں؟

⑦ مہمان کے کھانا کھانے سے خوشی کا اظہار ہونا چاہیئے اور نہ کھانے سے ناگواری اور کبیدگی ہونی چاہیئے۔ اور وجہ معلوم کرنی چاہیئے فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً میں (ان سے خوف محسوس کیا) ایک قسم کی ناگواری اور تعجب کا اظہار ہے۔ اور قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ میں وجہ پوچھی گئی ہے۔

⑧ اگر مہمان کھانا نہ کھائیں تو انہیں عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہیئے۔ فرشتوں نے یہی کہا کہ ہمارے کھانا نہ کھانے سے آپ کبیدہ خاطر اور خوف زدہ نہ ہوں۔ ہم کھانا کھا ہی نہیں سکتے۔ ہم فرشتے ہیں، انسان نہیں اور آپ کو ایک صاحبِ علم لڑکے کی پیدائش کی بشارت دینے آئے ہیں۔

⑨ سورۂ حجر میں حضرت لوط علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس قصہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ میزبان کا یہ بھی فریضہ ہے کہ مہمانوں کی جان، عزت و آبرو اور ان کے سازوسامان کی حفاظت کرے۔ انہیں کسی قسم کی گزند پہنچے تو اس میں مہمانوں ہی کی نہیں بلکہ خود میزبان کی ذلت و رسوائی ہوتی ہے۔ قوم لوط علیہ السلام نے مہمانوں کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو

حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:۔

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝ وَ
اتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۝ (۱۵/۶۸-۶۹)

ترجمہ:۔ لوطؑ نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں تو مجھے فضیحت تو نہ کرو۔ اور اللہ کا خوف کرو اور مجھے رسوا تو نہ کرو۔

قرآن کریم سے مہمانوں کے مذکورہ بالا ۹ حقوق مستنبط ہوتے ہیں۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات سے بھی مہمانوں کے حقوق پر بہت زور دیا ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ:۔
جو شخص اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے پڑوسی کی عزت کرنی چاہیئے اور جو شخص اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ عزت کے ساتھ مہمان کا حق ادا کرے، صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ اس کا حق کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ایک دن یا رات اس کے لئے خاص اہتمام کرنا۔ باقی مہمانی تین دن کی ہے۔ اس کے بعد صدقہ ہے۔

(بخاری کتاب الادب۔ باب من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یوذ جارہ)

نیز آپ نے فرمایا۔ جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور قرابت داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔

(بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ)

ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے متعلق آپ کو یہ شکایت پہنچی کہ رات رات بھر وہ نوافل پڑھتے رہتے ہیں تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے اس کے متعلق دریافت فرمایا جب انہوں نے اس کی تصدیق کی تو آپ نے فرمایا۔ ایسا نہ کیا کرو، صلوٰۃ نفل بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔ روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو کیونکہ تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہارے مہمانوں کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے۔

(بخاری کتاب الادب باب حق الضیف)

ایک اور حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک شب کی میزبانی تو واجب ہے۔اس کے بعد بھی کوئی کسی کے ہاں رہ جائے تو وہ قرض ہے (جس کا بدلہ کرنا ہوگا) لہٰذا وہ چاہے تو میزبانی قبول کرے اور چاہے تو چھوڑ دے۔

(ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف)

کم از کم ایک وقت کا کھانا اہتمام سے ہو

میزبانوں کو اس قسم کی ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مہمانوں کو بھی ہدایت فرمائی ہے کہ وہ کسی کے خوانِ کرم سے ضرورت کی حد سے زیادہ فائدہ نہ اُٹھائیں۔ چنانچہ احادیث میں اس قسم کی تصریحات ملتی ہیں کہ لوگوں کو کسی کے ہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہیئے کیونکہ اس سے صاحبِ خانہ کو تکلیف ہوگی اور اس پر بار پڑے گا۔

(بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ)

اس سے پہلے یہ حدیث گزر چکی ہے کہ تین دن سے زیادہ مہمانی صدقہ ہو گی۔ جسے کوئی عزت مند، خود دار شریف آدمی گوارہ نہیں کر سکتا۔

موجودہ حالات میں ہم سمجھتے ہیں کہ آج کل شہروں میں لوگوں کے پاس جگہ کی شدید تنگی ہوتی ہے اور ٹھہرنے کے لئے ہوٹل اور ریستوران موجود ہیں۔ لہٰذا لوگوں کو شہروں میں کسی کا مہمان نہیں بننا چاہیئے البتہ قصبات و دیہات میں جہاں باہر کے مسافروں کے لئے ٹھہرنے اور کھانے کا بندوبست نہ ہو، ان ہدایات پر عمل کرنا چاہیئے۔ لیکن شہروں میں جو ہم نے کسی کا مہمان نہ بننے کا مشورہ دیا ہے وہ عام لوگوں کے بارے میں ہے۔ قریبی رشتہ دار جن سے پردہ وغیرہ نہ ہو بہرحال اس سے مستثنیٰ ہیں۔

(مسلمانوں کے باہمی حقوق)

اسلام سے پہلے عربوں میں قبائلی نظام رائج تھا اور قبائل کی باہمی عداوت و رقابت اپنے عروج پر تھی۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا۔ ایک ہی قبیلہ کی مختلف شاخوں میں بھی یہی عداوت و رقابت کارفرما تھی۔ باہمی خانہ جنگیوں سے پورا عرب میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ دو قبیلوں میں اگر جنگ چھڑ گئی ہے تو وہ سو سو سال تک ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ خود مدینہ منورہ

میں اوس اور خزرج کی باہمی جنگیں سو سال سے جاری تھیں۔ اسلام آیا تو اس نے نہ صرف یہ کہ ان باہمی رقابتوں اور عداوتوں کا خاتمہ کر دیا بلکہ خون کے رشتہ سے بھی زیادہ قوی اور مضبوط ان کے درمیان ایک اور رشتہ کو جنم دیا اور یہ رشتہ ہم دینی کا رشتہ تھا جس نے دشمنوں کو دوست اور غیروں کو بھائی بھائی بنا دیا۔

بھائی بھائی

سورۂ آل عمران میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۝ (۳ / ۱۰۲-۱۰۳)

ترجمہ:۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم اسی حالت میں مرو کہ تم اللہ کے پورے مطیع و فرماں بردار ہو اور اللہ کی رسّی (اس کے دین اور دینی صحیفہ یعنی قرآن کو) سب مل کر مضبوطی سے تھامے رکھو اور باہم اختلاف نہ کرو اور اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ اس نے تمہارے دلوں میں اُلفت ڈال دی اور تم اللہ کے احسان سے بھائی بھائی بن گئے۔

اس آیت کریمہ میں دونوں حقیقتوں کا اظہار فرمایا گیا ہے یعنی پہلے اس حقیقت کا کہ تم اسلام سے پہلے ایک دوسرے سے کٹے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور دوسرے اس حقیقت کا کہ حق تعالیٰ نے اسلام کی نعمت سے تمہیں نوازا تو تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت پیدا کر دی اور تم بھائی بھائی بن گئے۔ اور اسے حق تعالیٰ نے اپنا فضل و احسان اور انعام و اکرام فرمایا ہے۔ اس لئے کہ اگر حق تعالیٰ کی اپنی مشیت نہ ہوتی تو صدیوں کی یہ دشمنیاں ختم نہیں ہو سکتی تھیں۔

سورۃ انفال میں ہے:۔

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْاَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۸/۶۳)

ترجمہ:۔ اور اللہ ہی نے ان کے دلوں میں الفت ڈال دی ورنہ (اے پیغمبر اسلام!) اگر آپ وہ ساری دولت خرچ کر دیتے جو ساری زمین میں بکھری ہوئی ہے تب بھی آپ ان کے دلوں میں الفت پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن وہ تو اللہ ہی نے ان کے درمیان الفت پیدا کر دی ہے۔ یقیناً وہ غلبہ اور حکمت والا ہے۔

یہ صرف حق تعالیٰ ہی کا احسان اور فضل و انعام اور اس کے احکام کی برکت ہے کہ اس نے صدیوں کی عداوتوں کو محبت و الفت میں تبدیل کر دیا۔ لہٰذا تمہیں اس کی قدر کرنی چاہیئے اور اس کی

صورت یہی ہے کہ اس کے دین کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو۔

نااتفاقی کی ممانعت

وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ (۸/۴۶)

ترجمہ:۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو (یعنی دینی احکام کی پیروی کرو) اور آپس میں جھگڑو نہیں اس سے تم میں بزدلی پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

باہمی اختلافات اور باہمی جھگڑوں سے اول تو خود تمہارے دلوں میں بزدلی پیدا ہو جائے گی۔ کیونکہ باہمی اتفاق و اتحاد کی صورت میں تمہیں جو یہ احساس ہوتا ہے کہ پوری قوم کی متحدہ قوت میری پشت پر ہے وہ احساس ختم ہو جاتا ہے اور تم سمجھنے لگتے ہو کہ میرے ساتھ پوری قوم کی متحدہ طاقت نہیں ہے۔ اس احساس کا لازمی نتیجہ کمزوری اور بزدلی ہوتا ہے اور دوسرا نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ دشمن پر تمہارا رعب نہیں رہتا اور تمہاری ہوا اکھڑ جاتی ہے۔ دشمن خود تمہاری صفوں میں سے اپنے مطلب کے آدمی ڈھونڈھ نکالتا ہے اور تم پر ایسی ضرب لگاتا ہے کہ تم صدیوں اس سے سنبھلنے نہیں پاتے۔ بلکہ بعض اوقات وہ تمہیں نیست و نابود ہی کر ڈالتا ہے۔ لہٰذا باہمی نزاع و اختلاف سے ہمیشہ بچو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ:۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ

وَالرَّسُوْلِ (۴/۵۹)

ترجمہ:۔ پھر اگر تم میں کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو (اور احکام الٰہی کے مطابق اس کو حل کر لو)۔

بین الاسلامی عدالتِ انصاف قائم کرنے کا حکم جس کے پاس قوت نافذہ بھی ہو،

اگر یہ جھگڑا حل ہی نہ ہو اور باہم جھگڑنے والے آدمی باہم دست و گریبان ہونے لگیں اور نوبت جنگ کی آجائے تو غیر جانبدار مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ ان کے درمیان صلح کرا دیں اور اگر وہ صلح پر آمادہ نہ ہوں تو دیکھیں کہ زیادتی کس کی ہے اور کونسا فریق حق پر ہے۔ جس فریق کی زیادتی ہو اس سے سب مسلمان جنگ کریں اور اسے صلح پر مجبور کریں۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ (۴۹/۹)

ترجمہ:۔ اور اگر مؤمنین کے دو فریق جنگ کرنے لگیں تو ان دونوں کے درمیان صلح کرا دو اور اگر ان میں سے ایک فریق دوسرے فریق پر زیادتی کرے تو اس فریق سے تم سب

جنگ کرو جو زیادتی کر رہا ہے حتیٰ کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف
واپس آجائے۔ تو اگر وہ واپس آجائے تو ان دونوں کے
درمیان صلح کرادو انصاف کے ساتھ، اور انصاف پر قائم
رہو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ یاد
رکھو، حقیقت یہی ہے کہ تمام مؤمن بھائی بھائی ہیں تو
اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔

صلح کرانے کی تاکید کے ساتھ حق تعالیٰ نے پھر اس حقیقت کی طرف متوجہ فرمایا ہے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ یہ رشتہ اتنا قوی ہے کہ باوجود باہمی جنگ و جدال کے یہ رشتہ منقطع نہیں ہوتا۔ اس کے بعد بھی حق تعالیٰ ان کو بھائی بھائی ہی قرار دیتا ہے۔ اور تیسری مرتبہ پھر فرمارہا ہے کہ اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔ اس سے پہلے اسی آیت کریمہ میں دو مرتبہ صلح کرا دینے کا حکم دیا جا چکا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق تعالےٰ کے نزدیک مسلمانوں کے درمیان صلح و صفائی کی کس قدر اہمیت ہے۔ اسی آیت کی تفسیر میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا۔ (بخاری، مظالم)

ترجمہ:۔ اپنے بھائی کی مدد کرو۔ قطع نظر اس کے کہ
وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔

صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد تو کی جانی چاہیئے۔ لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کے کیا معنے ہو سکتے ہیں؟

آپ نے فرمایا کہ اس کو ظلم کرنے سے روک دو یہی اس کی مدد ہے۔ لہٰذا جس فریق سے تم جنگ کر کے اسے صلح و صفائی پر مجبور کر رہے ہو یہ بھی اس کی مدد ہے کہ اس سے احکامِ الٰہی کی تعمیل کرا کر اس کا بھلا کر رہے ہو۔ نیز فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصے میں گرفتار ہو کہ جس میں اس کی عزت چلے جانے کا اندیشہ ہو تو ہر مسلمان پر فرض ہے کہ اس کی آبرو بچانے کی کوشش کرے۔

(سنن ابوداؤد، کتاب الادب)

اور ارشاد ہوا کہ جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقعہ پر بے سہارا چھوڑے گا۔ جس میں اس کی عزت پر حرف آ رہا ہو اور اس کی آبرو جانے کا اندیشہ ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو ایسے ہی موقعوں پر بے یار و مددگار چھوڑ دے گا۔ اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقعہ پر مدد کرے گا تو اللہ بھی اس کی ایسے موقعہ پر مدد فرمائے گا۔ (ایضاً)

ایمان لاتے ہی بھائی

ایک شخص آپ کا دشمن ہے۔ آپ سے برسرِ جنگ ہے۔ آپ اس کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور وہ آپ کو قتل کر دینے کے درپے ہے لیکن جونہی اس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا اور توحید و رسالت کی شہادت دیدی اُسی وقت وہ آپ کا بھائی بن گیا۔ جواب سے ایک منٹ پہلے آپ کا دشمن تھا وہ آپ کا ساتھی اور رفیق بن گیا۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ۔ (۹/۱۱)

ترجمہ:۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں، اور صلوٰۃ قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں تو وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں۔

غلام بھی بھائی

اب وہ ساری عداوتیں اور ساری دشمنیاں ختم ہو گئیں اور اب وہ تمہارے بھائی بن گئے۔ جو شخص پشتہا پشت سے غلام چلا آرہا ہے۔ اگر وہ بھی کلمہ پڑھ لے اور مسلمان ہو جائے تو وہ اسلامی رشتہ سے تمہارا بھائی بن گیا۔ اس کے باپ کا نام، اس کا حسب و نسب کچھ بھی ہو۔ اب وہ تمہارا بھائی ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآئَھُمْ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ وَمَوَالِیْکُمْ۔ (۳۳/۵)

ترجمہ:۔ پھر تمہیں ان کے باپوں کے نام معلوم نہیں ہیں تو نہ سہی وہ تمہارے بھائی اور تمہارے دوست ہیں۔

قاتل بھی بھائی

ایک مسلمان تمہارے کسی عزیز و قریب کو غلطی سے قتل کر ڈالے تو یہ اللہ کی بارگاہ میں شدید ترین جرم ہے اور وہ اس عزیز و قریب کے قصاص میں قتل کیا جانا چاہیئے۔ لیکن اس قدر شدید جرم کا مرتکب ہونے کے بعد بھی وہ اخوت اسلامی کے رشتہ سے کٹ نہیں گیا۔ اب بھی وہ تمہارا بھائی ہے اس لئے اگر تم کچھ حصہ معاف کر کے دیت لینے پر آمادہ ہو جاؤ تو ضرور ایسا کرو۔

فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ

(۲/۱۷۸)

ترجمہ:۔ تو جسے اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی مل جائے
تو (خون بہا وصول کرنے کے لئے) دستور کے مطابق اس کا مطالبہ
کرنا چاہیئے۔

اس طرح حق تعالیٰ مقتول کے ورثہ کے دل میں جذبۂ ترحم کو بیدار کر رہے ہیں۔

غیبت کی ممانعت

آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا، آپس میں گالم گلوچ کرنا انتہائی گناہ ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان کو گالی دینا، خدا کی نافرمانی (فسوق) ہے اور اس سے لڑنا (قتال) اللہ کا انکار (کفر) ہے۔ لہٰذا اس سے ہمیشہ محترز رہنا چاہیئے حتیٰ کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی پیٹھ پیچھے بھی بدگوئی نہیں کرنی چاہیئے:۔

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ
يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا۔ (۴۹/۱۲)

ترجمہ:۔ اور تم آپس میں ایک دوسرے کے پیٹھ پیچھے
بھی بدگوئی نہ کرو، کیا تم میں کوئی شخص اس بات کو پسند
کر سکتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کا گوشت کھائے جب وہ
مر چکا ہو۔

اس آیت کریمہ میں ایک نہایت ہی دل نشین تمثیل سے غیبت کی شناعت بتائی گئی ہے کہ اپنے بھائی کے مر جانے کے بعد اس خیال سے کہ اب تو وہ موجود نہیں ہے۔ وہ تو مر چکا، تم میں سے کوئی اس

کا گوشت کھانا پسند نہیں کرتا تو اسی طرح اس تصور کے ماتحت کہ بھائی یہاں موجود نہیں اور وہ ہماری بدگوئی کو نہیں سن رہا ہے تم بیٹھ پیچھے اسے کس طرح بُرا بھلا کہہ لیتے ہو۔ یہاں بھی اس شخص کو جس کی ہم بدگوئی کرتے ہیں ہمارا بھائی جتلا کر ہمیں اس کی برائی کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

یتیم بھی بھائی

بعض لوگ یتیموں کا مال خورد برد کر لیا کرتے تھے اور اسے بے احتیاطی سے خرچ کرتے تھے کہ کل کو وہ جوان ہو جائیں گے تو ان کے حوالے کرنا پڑے گا۔ اس پر تنبیہہ فرمائی گئی اور بتایا گیا کہ جو یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں وہ اپنے شکم میں جہنم کے انگارے بھرتے ہیں۔ اس کے بعد صحابہ کی اکثریت بھی جو دیانت و امانت کے ساتھ ان کے اموال خرچ کرتے تھے بہت زیادہ محتاط ہو گئے اور انہوں نے ان کی روٹی الگ ان کی ہانڈی الگ پکوانی شروع کر دی کہ کہیں ان کی کوئی چیز ہمارے پیٹ میں نہ چلی جائے۔ لیکن یہ احتیاط قابل عمل نہیں تھی۔ لہٰذا گھروں میں اس سے تنگی محسوس کی جانے لگی اس لئے حق تعالیٰ کو وضاحت فرمانا پڑی کہ ہمارا یہ مطلب نہیں تھا۔

قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ط وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ط (۲/۲۲۰)

ترجمہ:- اے پیغمبر اسلام! آپ کہہ دیجئے کہ یتیموں کی خیر خواہی بہتر ہے۔ اور اگر تم ان کا کھانا پینا اپنے ساتھ ہی

ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ
کون بدنیت ہے اور کون خیر خواہ ہے۔

ظاہر ہے کہ یتیموں کے لئے ہر چیز الگ پکوائی جائے تو اس میں یتیموں کا خرچ بھی زیادہ ہی ہو گا۔ یہ تو ان کی خیر خواہی نہیں ہوئی لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ملا جلا کر پکایا جائے۔ یہاں اس حکم کے ساتھ کہ ان کا کھانا اپنے کھانے کے ساتھ ہی ملا جلا کر پکواؤ، یہ بتایا گیا ہے کہ آخر وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں۔ اتفاقاً ان کا کوئی دانہ تمہارے پیٹ میں چلا گیا یا تمہارا کوئی دانہ ان کے پیٹ میں چلا گیا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

جو گذر چکے وہ بھی بھائی

مسلمانوں کا یہ بھی ایک دوسرے پر حق ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے لئے دل میں نیک آرزوئیں اور نیک تمنائیں رکھیں ایک دوسرے کے لئے دعائے خیر کرتے رہیں۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا
بِالْاِيْمَانِ (۵۹/۱۰)

ترجمہ:۔ اے ہمارے پروردگار! ہماری اور ہمارے
ان بھائیوں کی جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گذر چکے
ہیں مغفرت فرمادے۔

اس میں ان لوگوں کو بھی جو ہم سے پہلے گذر چکے ہیں یعنی مر چکے ہیں مسلمانوں کا بھائی بتلایا گیا ہے۔ اور ایک بھائی کی طرف کسی بھائی کے دل میں حسد، کینہ، بدخواہی کے جذبات ہرگز نہیں

ہونے چاہئیں۔

وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا
اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ○ (۵۹/۱۰)

ترجمہ:۔ اور ہمارے دلوں میں مؤمنین کے لئے کسی کینہ کو جگہ نہ دے۔ اے ہمارے پروردگار بیشک آپ بڑے مہربان اور رحم فرمانے والے ہیں۔

رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ

مسلمان دشمن کے مقابلہ میں فولاد ہوتے ہیں تو آپس میں مسلمانوں کے لئے حریر و پرنیاں ہوتے ہیں۔

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔ (۴۸/۲۹)

ترجمہ:۔ وہ کفار کے لئے بڑے سخت ہوتے ہیں مگر آپس میں ایک دوسرے کے لئے رحم کرنے والے ہوتے ہیں۔

سورۂ مائدہ میں ہے۔

اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ○

(۵/۵۴)

ترجمہ:۔ وہ مؤمنوں کے لئے بڑے نرم دل اور کافروں پر بڑے سخت ہوتے ہیں۔

وہ جب کسی مسلمان سے ملتے ہیں تو ہمیشہ جھک کر ملتے ہیں لیکن کافروں کے مقابلہ میں بڑے رعب و داب سے پیش آتے ہیں۔

ایک دوسرے سے بدظنی نہ ہو

اگر ہم ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں

پالیں گے تو ردعمل میں دوسری طرف بھی یہی ہوگا اس لئے ارشاد الٰہی ہوا کہ ایک دوسرے کے متعلق سُنی سنائی بات پر بدظنی بھی نہیں ہونی چاہیئے۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ
بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ○

(11/24)

ترجمہ:۔ کیوں نہ سنتے ہی مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں نے اپنے ہی ایک فرد کے متعلق نیک گمان کا اظہار نہ کیا، اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ تو قطعی غلط بات ہے۔

ہاں اگر تحقیق کے بعد کسی کے متعلق کوئی جرم ثابت ہو جائے تو اس کی قانونی چارہ جوئی کرنی چاہیئے۔

احادیث نبوی

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت، محبت اور مہربانی کی مزید تشریح و تاکید حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بھی ملتی ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح ہونا چاہیئے کہ اگر جسم کے ایک عضو میں کوئی تکلیف ہوتی ہے تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

(صحیح بخاری کتاب الادب و صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب)

ایک اور روایت میں ہے کہ سارے مسلمان ایک آدمی کی طرح ہیں کہ اگر اس کی آنکھ آشوب کر آئے تو سارا بدن اس کا دکھ محسوس

کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔

(صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب)

اسی بات کو آپ نے ایک تمثیل سے یوں بیان فرمایا کہ مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے تقویت حاصل کرتی ہے۔

(بخاری کتاب الادب و مسلم کتاب البر والصلۃ)

بخاری میں ہے کہ یہ فرما کر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالا اور دکھایا کہ ایک حصہ دوسرے حصہ سے کس طرح تقویت حاصل کرتا ہے۔ اس تمثیل میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر قوت پاتی ہے اور ناقابل تسخیر بن جاتی ہے یعنی ایک قلعہ یا حصار بن جاتی ہے اسی طرح ملت اسلامیہ بھی ایک قلعہ ہے جس کی ہر اینٹ ہر مسلمان ہے۔ یہ قلعہ اسی وقت تک ناقابل تسخیر ہے جب تک اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے۔ جب ایک اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی تو پوری دیوار زمین بوس ہو جائے گی۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کر سکتا ہے نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑ سکتا ہے (کہ کوئی دوسرا اس پر ظلم توڑ سکے) اور نہ ہی اس کی تحقیر کر سکتا ہے۔

انسان کے لئے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے بھائی مسلمان کی تحقیر

کرے۔ مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون، اس کا مال، اس کی آبرو۔

(صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب)

یہی مضمون کچھ اضافوں کے ساتھ ابوداؤد میں بھی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ نہ تو اس پر خود ظلم کرتا ہے اور نہ اسے دشمن کے حوالہ کر سکتا ہے۔ جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں مشغول ہوگا تو حق تعالیٰ اس کی ضرورت کو پورا فرمائے گا اور جو کوئی مسلمان کسی مسلمان بھائی کی تنگی ترشی کو دور کرے گا تو حق تعالیٰ اس کے بدلہ میں قیامت کے دن اس کی تنگی کو دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو حق تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھیں گے۔

(ابوداؤد کتاب الادب)

نیز آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔ (بخاری کتاب الایمان)

نیز دوسری ایک حدیث نبوی میں ہے کہ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ اے رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سب سے اچھا مسلمان کون ہے۔ آپ نے فرمایا جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔ (بخاری کتاب الایمان)

یعنی جس کی زبان اور ہاتھ سے کسی دوسرے مسلمان بھائی کو تکلیف نہ پہنچے وہی بہتر مسلمان ہے۔

باہمی قتل اور جھگڑا

کسی مسلمان کو عمداً قتل کر دینا حق تعالےٰ کے نزدیک انتہائی سخت جرم ہے اور اس کی سزا وہی ہے جو ایک کافر اور مشرک کی ہوا کرتی ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (۴/۹۳)

ترجمہ:۔ جو کوئی کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی جزا جہنم ہے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ اس پر غضب فرمائے گا اور لعنت بھیجے گا اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اسی کی تفسیر میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ۔

(بخاری کتاب الایمان)

ترجمہ:۔ مسلمان آدمی کو گالی دینا اللہ کی نافرمانی (فسق) ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے (اللہ کا انکار ہے)۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ نے فرمایا تھا:۔

دیکھو، میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان)

جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی سخت ترین گناہ ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سب سے بڑا گناہ کسی مسلمان کی آبرو پر دست درازی کرنا ہے۔

(سنن ابوداؤد کتاب الادب)

نیز فرمایا کہ۔ اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو کہ جس میں اس کی عزت چلے جانے کا اندیشہ ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی آبرو بچانے کی کوشش کرے۔ ارشاد ہوا جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقعہ پر بے سہارا چھوڑے گا جس میں اس کی عزت پر حرف آرہا ہو اور اس کی آبرو جانے کا اندیشہ ہو تو اللہ تعالےٰ بھی اس کو ایسے ہی موقعوں پر بے یارو مددگار چھوڑ دے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقعہ پر مدد کرے گا تو اللہ بھی اس کی ایسے موقعہ پر مدد فرمائے گا۔ (ایضاً)

اگر دو مسلمانوں میں بدمزگی کے سبب بول چال بند ہو جائے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے تین دن سے زیادہ اس صورتِ حال کو جاری رکھنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے کہ کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے آمنا سامنا ہو تو یہ اِدھر منہ پھیر لے اور وہ اُدھر اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو پہلے سلام کرے۔

(صحیح بخاری کتاب الادب و سنن ابوداؤد کتاب الادب)

ایک مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو سے بھی بڑھ کر اس کے ایمان کا معاملہ ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور اظہار اسلام کے طور پر آپ کو سلام بھی کر رہا ہو تو تم اسے کہہ دو کہ تو مسلمان نہیں ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلَامَ لَسْتَ

مُؤْمِنًا (۴/۹۴)

ترجمہ:۔ اور جو شخص تمہیں سلام کرے اسے یہ مت کہو کہ تو مسلمان نہیں ہے۔

ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پاکر اس پر حملہ کیا تو اس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا مگر اس پر صحابی نے یہ سمجھ کر کہ ڈر کے مارے کلمہ پڑھ رہا ہے اسے قتل کر دیا۔ آپؐ نے اس صحابی سے سخت باز پرس فرمائی اور فرمایا کہ تم قیامت میں اس کے لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے؟

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "کیا تم نے اس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا؟"

(صحیح بخاری غزوۂ حرقات وکتاب الدیات نیز فتح الباری کتاب الدیات)

نیز حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں:۔

① اس کے سلام کا جواب دینا۔
② اسے چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو یرحمک اللہ کہنا۔
③ اس کی دعوت کو قبول کرنا۔
④ بیمار ہو تو عیادت کرنا۔
⑤ مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ چلنا۔

(سنن ابو داؤد کتاب الادب)

یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں جو سے دو مسلمانوں کے درمیان

خوش خلقی اور حسن تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ "جب کوئی مسلمان اپنے بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو جبتک وہ واپس نہ ہو جنت کی روش پر ہوتا ہے۔ (صحیح مسلم کتاب البر والصلہ)

حضرت ابوہریرۃؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا" جو کوئی ایمان واخلاص کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازے کے پیچھے چلتا ہے۔اس کی نماز پڑھتا ہے اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے تو اس کو ثواب کی دو رتی (قیراط) ملتی ہے جن میں سے ہر رتی (قیراط) احد پہاڑ کے برابر ہوگی۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان)

یعنی یہ رتی دنیوی پیمانوں سے نہیں بلکہ اس پیمانہ کے حساب سے ہوگی جس کا ایک ایک ذرہ اپنی عظمت میں پہاڑ کے برابر ہوگا۔

یہ تمام حقوق جن کی جزئیات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا اسی برادرانہ الفت و محبت کی شاخیں ہیں جن کے بغیر کسی مؤمن کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ اسی لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا" تم میں کوئی کامل مؤمن نہیں ہوگا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان)

الغرض ملت اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے۔ ابوداؤد میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا" مسلمان، مسلمان کا آئینہ ہے اور مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے" وہ اس کے نقصان کو دور کرتا ہے اور اس کے پس پشت

اس (کے مفادات) کی حفاظت کرتا ہے۔ (کتاب الادب)

ملاحظہ فرمائیے کہ اللہ اور اس کے رسول آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلامی سوسائٹی کی بنیاد کس قدر مستحکم ڈالی تھی۔ مگر ہم نے ان ہدایات کو پس پشت ڈال کر اس عمارت کی دیواریں کتنی شکستہ کر ڈالی ہیں۔ مسلمان جب بھی اپنی نشأۃ ثانیہ کی سعی کریں گے۔ اُنہیں انہی بنیادوں پر کام کرنا ہو گا سچ فرمایا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ:۔

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ

(مسلم وغیرہ)

ترجمہ:۔ مسلمان تو درحقیقت وہ ہے جس کے ہاتھ سے اور جس کی زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

(انسانی برادری کے حقوق)

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح صرف اپنے ہم مذہبوں سے حسنِ سلوک کی تاکید نہیں کرتا۔ بلکہ وہ غیر مذہب والوں کے ساتھ بھی نیک سلوک کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ ہر مسلمان پر اسلام کی تبلیغ فرض ہے۔ اس کا مقصد بھی یہ نہیں ہے کہ اُنہیں اپنی تعداد میں اضافہ کرنا ہے بلکہ چونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ اسلام ہی میں انسانیت کی فلاح و بہبود مضمر ہے۔ اس لئے جسے وہ سچائی سمجھتا ہے اسے اپنے دوسرے بھائیوں تک بھی پہنچانا چاہتا ہے۔ قرآن کریم نے تورات

کے بعض احکام کو دہرایا ہے جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲/۸۳)

ترجمہ:۔ اور لوگوں سے حسن کارانہ باتیں کہو۔

لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور حسن کارانہ انداز سے پیش آنا ہر انسان کا فرض ہے جس میں کسی دین اور کسی مذہب کی تخصیص نہیں، دین و مذہب کے امتیاز اور نسلی و قومی تفریق کو اسلام قبول نہیں کرتا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کی تاکید کرتا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵/۸)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو، اللہ کے لئے عدل و انصاف کے پیکر بنو، دیکھو تمہیں کسی قوم کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو۔ انصاف کرو۔ یہی بات تقویٰ سے قریب تر ہے۔

لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بُرا سلوک یا بے رحمانہ برتاؤ نیز قومیں ایک دوسرے کے ساتھ ایسے سلوک اسی لئے تو کرتی ہیں کہ وہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتی ہیں۔ قرآن ہر قسم کے غیر عادلانہ اور غیر منصفانہ برتاؤ کو جڑ سے کاٹ دینا چاہتا ہے۔ حضرت ابوہریرۃ اور حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہما نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے۔

لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَکُوْنُوْا

عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا۔

ترجمہ:۔ ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو۔

انسانی برادری اگر اسی ایک ہدایت پر سچے دل سے عمل پیرا ہو جائے تو دنیا کا یہ جہنم زار جو طرح طرح فتنہ و فساد سے بری طرح بھر گیا ہے جنت کدہ بن جائے۔ بخاری میں ہے۔

مَنْ لَّا یَرْحَمُ لَا یُرْحَمُ۔

ترجمہ:۔ یعنی جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

اس کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ جو اللہ کے بندوں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ بھی رحم نہیں کرتا مگر اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جو دوسروں کے ساتھ رحم کا سلوک نہیں کرتا دوسرے بھی اس کے ساتھ رحم کا سلوک نہیں کرتے۔

مستدرک حاکم میں ہے کہ:۔

اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ۔

(کتاب البر والصلۃ ص ۱۵۹/۴)

ترجمہ:۔ تم زمین والوں پر رحم کرو تاکہ آسمان والا (اللہ) تم پر رحم فرمائے۔

مسلمانوں کا اللہ رب العلمین ہے، ان کا رسول رحمۃ للعلمین ہے، مسلمانوں کا ضابطۂ حیات (قرآن) ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْن ہے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کا مرکزِ ملت (مکہ مکرمہ اور خانۂ کعبہ) مَثَابَةً لِّلنَّاس

پوری نوع انسانی کی جائے پناہ ہے۔ آپ کی شان رحمت اپنی پوری عمومیت کے ساتھ پوری انسانیت کو محیط ہے۔ نہ صرف پوری انسانیت کو بلکہ پوری کائنات کو محیط ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے۔

جو مسلمان کوئی درخت لگائے، اس سے جو انسان یا پرندہ کچھ بھی کھائے گا تو اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملے گا۔

(بخاری)

ایک دفعہ آپ نے ایک قصہ بیان فرمایا کہ کسی آدمی نے کسی جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا تو اس کو اس پر بھی ثواب ملا۔ صحابہ نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا جانوروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا بھی ثواب ملتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہر تر جگر (ذی حیات) کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا ثواب ملتا ہے۔

(بخاری کتاب الادب، جلد دوم)

آپ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو نصیحت فرمائی کہ جہاں بھی ہو اللہ کو یاد رکھو، کوئی تم سے برائی کرے تو تم اس سے بھی بھلائی کرو۔ اس طرح تم اس کی برائی کو مٹادو گے اور لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آؤ۔

(جامع ترمذی، باب ماجاء فی معاشرۃ الناس صلـ۳۲)

خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو اور تمام مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے یہ ہدایت فرما رکھی تھی کہ:-

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط (۱۶/۱۲۵)

ترجمہ :۔ اے پیغمبر اسلام! آپ لوگوں کو اپنے پروردگار کی راہ (صراط مستقیم) کی طرف بڑی دانائی اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دیجئے اور ان سے بحث (بھی کرنی پڑے تو) ایسے انداز سے کیجئے جو بہترین ہو۔

لہٰذا غیر مسلموں کے ساتھ بھی انسانیت اور خوش خلقی کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے پانچ ضروری باتیں گنلائیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ :۔

وَاَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ۔

ترجمہ :۔ یعنی تم لوگوں کے لئے (الناس۔ مسلم وغیر مسلم سب کے سب) وہی پسند کرو جو تم خود اپنے لئے پسند کرتے ہو تو تم سچے مسلمان بن جاؤ گے۔

(ترمذی ابواب الزہد)

اس حدیث میں الناس کا لفظ ہے جو پوری نوع انسانی کو شامل ہے جس میں تمام انسان داخل ہیں۔ وہ مسلم ہوں، کافر ہوں، منافق ہوں، مشرک ہوں۔ کسی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک ایک مسلمان کے دل میں پوری نوع انسانی کی بھلائی کا جذبہ موجود نہ ہو وہ سچا مسلمان نہیں بن سکتا۔

تورات اور انجیل میں بھی تعلیم ان الفاظ کے ساتھ ملتی ہے کہ :۔

"تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو۔"

لیکن تورات اور انجیل کی اس تعلیم میں پڑوسیوں کی تخصیص

فرمائی گئی ہے جو زیادہ تر ہم مذہب ہی ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کی تعلیم زیادہ عام اور مکمل ہے جس میں پوری انسانیت کے لئے یہ تعلیم دی گئی ہے۔

صدقہ و خیرات کے باب میں فقراء اور مساکین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے ان میں مسلم وغیر مسلم میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ ہمارے فقہاء کرام نے بھی فرض زکوٰۃ کے علاوہ تمام صدقات وخیرات کے لئے کافر اور غیر مسلم فقراء و مساکین کو دیدینا جائز قرار دیا ہے۔

قاضی ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے آدمی کو جو نابینا بھی تھا ایک دروازہ پر کھڑے بھیک مانگتے دیکھا۔ حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور پوچھا کہ تمہیں بھیک مانگنے کی ضرورت کیوں پڑی۔ اس نے جواب دیا۔ مجھے اپنے جزیہ کی رقم ادا کرنی ہے نیز اور بھی ضرورتیں ہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں، کسب معاش کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور اپنی جیب خاص سے اس کی امداد کی۔ پھر بیت المال کے خزانچی کے پاس اسے بھیجا اور کہلوایا اس جیسے لوگوں کا خیال کرو۔ خدا کی قسم ہم انصاف نہیں کریں گے اگر ہم ان کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور بوڑھے ہونے کے بعد ان کی خبرگیری نہ کریں۔ (کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص۷۲ مطبوعہ مصر)

ایک مرتبہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی خاندان کو صدقات میں سے دیا تھا۔ ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے

اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار درہم کی مالیت کا صدقہ دیا تھا۔ امام مجاہدؒ کا قول ہے کہ مشرک رشتہ دار کا قرضہ معاف کر دینا بھی کارِ ثواب ہے۔

(کتاب الاموال امام ابو عبیدہ ص ۶۱۳-۶۱۴ مطبوعہ مصر)

قرآن کریم نے نیک اور صالح بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ○ (۷۶/۸)

ترجمہ :- اور وہ کھانے کی شدید خواہش کے باوجود مسکین یتیم اور اسیر (قیدی) کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔

حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس قید (اسیرانِ جنگ) مسلمان تو نہیں ہوتے تھے۔ وہ سب کافر اور مشرک ہی ہوتے تھے لیکن خود بھوکے رہ کر وہ ان کو کھانا کھلاتے تھے اور حق تعالیٰ نے ان کی اس بات کی تعریف فرمائی ہے۔ ابو میسرہؓ ، عمرو ابن میمونؓ اور عمرو ابن شرجیلؓ کے متعلق آتا ہے کہ وہ صدقہ فطر سے عیسائی راہبوں کی مدد فرمایا کرتے تھے۔

(کتاب الاموال امام ابو عبیدہ ص ۶۱۳-۶۱۴ مصر)

ایک صحابی نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا تھا۔ (بخاری - کتاب الجمعہ)

اس کے علاوہ بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو ان کے مشرک والدین کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کی اجازت دی ہے۔

(مسلم باب فضل الصدقة علی الاقربین)

اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جب بعض صحابہؓ نے مذہبی اختلاف کی وجہ سے غریب مشرک رشتہ داروں کی امداد سے اپنا ہاتھ روک لیا تو یہ آیت نازل ہوئی تھی :-

لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ اللّٰہِ ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ (۲/۲۷۲)

ترجمہ :- اے پیغمبر اسلام ! اُن (لوگوں) کو ہدایت دیدینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جو کچھ مال تم خرچ کرتے ہو اس کا فائدہ خود تمہیں ہی پہنچتا ہے۔ اور تم تو اللہ کی رضا ہی کی طلب کے لئے خرچ کرتے ہو جو کچھ مال تم خرچ کرتے ہو اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تم پر کوئی ظلم (اجر میں کمی) نہیں کیا جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ غیر مسلم ہونے کی وجہ سے تمہیں ان کی امداد سے دست کش نہیں ہونا چاہیئے۔ تم تو اللہ کی رضا کے لئے حسن سلوک کرتے ہو اور اس کا تمہیں حق تعالیٰ کے ہاں پورا پورا اجر ملیگا۔ اور تمہارے اجر میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ البتہ فرق مراتب کا خیال ضروری ہے۔ اگر تمہارے رشتہ داروں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کے ضرورت مند اور محتاج ہوں جو تمہاری امداد کے قابل ہیں تو اول تمہیں مسلم قرابت داروں کو ترجیح دینی چاہیئے اور

اس کے بعد غیر مسلم قرابت داروں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

مسند احمد ابن حنبلؒ میں ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک پورا مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اور لوگوں کے لیئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو خود اپنے لئے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ لوگوں سے محض اللہ کے لئے محبت اور پیار نہ کرے۔"

اس حدیث میں بھی محبت انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دی گئی ہے۔

بہر حال اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ تمام انسانوں سے انسان ہونے کی حیثیت سے محبت اور حسن سلوک کرنا چاہیئے۔ اس میں قطعاً مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں کرنی چاہیئے۔ غیر مسلم بھی انسان ہیں اور انسانی برادری ہی کا حصہ ہیں۔ اگر انہیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے تو ضرور ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ اسی حسن اخلاق کا اثر تھا کہ لوگ دلائل و براہین سے زیادہ مسلمانوں کے حسن اخلاق اور نمونۂ عمل کو دیکھ کر متاثر ہوئے اور جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔

(جانوروں کے حقوق)

اسلام دنیا میں لطف و محبت اور شفقت و رحمت کا جو پیغام لے کر آیا ہے وہ صرف انسانوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر جاندار

تک وسیع ہے۔ لوگ عام طور پر حیوانوں اور جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ چنانچہ عربوں میں بھی جانوروں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کیا جاتا تھا جسے بہر حال اسلام نے پسند نہیں فرمایا۔ وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے اور لوگوں سے کہتے کہ کھاؤ۔ اسے بڑی ہی فیاضی سمجھا جاتا تھا۔ دو آدمی شرط باندھ کر باری باری ایک ایک اونٹ ذبح کرتے چلے جاتے جب ایک آدمی رک جاتا تو وہ ہار جاتا۔ یہ بھی فیاضی کا ایک نشان تھا۔ یہ سب جانور دوست احباب کی دعوت کے نذر ہو جاتے۔ ان واقعات کا ذکر فخریہ طور پر عرب کے اشعار میں موجود ہے۔ ایک دستور یہ بھی تھا کہ کوئی جنگجو بہادر مر جاتا تو اس کی قبر پر اس کی سواری کے جانور بھی باندھ دیئے جاتے۔ ان کا دانہ پانی بند کر دیا جاتا اور وہ سوکھ سوکھ کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ایسے جانوروں کو بَلِیَّۃٌ کہتے تھے۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ کسی جانور کو باندھ کر اس پر نشانہ بازی کی مشق کی جاتی تھی۔ یہ بھی دستور تھا کہ زندہ اونٹنی کا کوہان، زندہ دنبے کی چکتی، یا کوئی عضو کاٹ کر بھون کر کھا جاتے تھے مگر اسلام نے بلا ضرورت اور سفاکانہ طریقے سے کسی جانور کے قتل کرنے کو پسند نہیں فرمایا۔ حق تعالیٰ نے جانوروں کی تخلیق کے بھی کچھ مقاصد بیان فرمائے ہیں۔ ہمیں ان سے وہی مقاصد حاصل کرنے چاہئیں۔ قرآن کریم نے جانوروں کو انسانی زندگی کی ضرورت اور زینت و زیبائش سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ بڑی ہی قساوت قلبی ہوگی کہ جو چیزیں ہمارے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور ہم ان سے طرح طرح کی منفعتیں

حاصل کرتے ہیں، ہم ان کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کریں۔

سورۂ نحل میں ہے:۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ○ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ط وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

(۱۶ / ۸-۵)

ترجمہ :۔ اور اللہ نے یہ تمام چوپائے تمہارے (فائدہ) کے لئے پیدا کئے ہیں۔ ان میں تمہارے لئے سردی سے بچاؤ کا سامان ہے اور بے شمار فائدے ہیں۔ اور ان سے تم کھاتے بھی ہو۔ (ان سے تمہیں رزق بھی حاصل ہوتا ہے) اور ان میں تمہارے لئے کتنی خوبصورتی و خوش نمائی ہے جب اُنہیں چرا کر شام کو گھر لاتے ہو یا صبح کو اُنہیں چرانے کے لئے جنگل کی طرف لے جاتے ہو۔ وہ تمہارے بوجھ لاد کر ایسی آبادی تک پہنچا دیتے ہیں جہاں تک تم اپنی جانوں کو مشقت میں ڈالے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یقیناً تمہارا پروردگار بڑا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے اس نے گھوڑے، خچر، گدھے پیدا کئے ہیں تاکہ تم ان پر سواری کرو اور وہ تمہارے زینت و آسائش کا باعث بنیں۔ اور (ان کے علاوہ بھی) وہ ایسی ایسی

مخلوق پیدا کرتا رہتا ہے جنہیں تم جانتے بھی نہیں۔

سورۂ انعام میں ہے:۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ط كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط (۶/۱۴۲)

ترجمہ:۔ اور چوپایوں میں سے (اللہ نے) بار برداری کے جانور (اونٹ، خچر، گھوڑا، گدھا وغیرہ) اور گوشت کھانے کے جانور (مینڈھا، بکری، بھیڑ وغیرہ) پیدا کئے۔ جو اللہ نے تمہیں رزق دیا ہے اس سے خوب کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔

سورۂ آل عمران میں ہے:۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط (۳/۱۴)

ترجمہ:۔ لوگوں کے لئے مرغوب چیزوں کی محبت بڑی ہی مزین بنادی گئی ہے۔ مثلاً عورتیں، بچے، سونے، چاندی کے جمع کئے ہوئے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں، حیات دنیوی کا منفعت بخش سامان یہی ہوتا ہے۔

بہرحال حیوانات اور جانور بھی حق تعالیٰ کی ایک نعمت اور انسانوں کے لئے باعث زینت اور باعث منفعت ہوتے ہیں۔ ان کی خبرگیری کرنا۔ ان کی صحیح پرورش کرنا انسانیت کا فریضہ ہے جو

لوگ بے زبان جانوروں پر ظلم وستم کرتے ہیں جو خود بھی انسانوں کی طرح خدا کی ایک جاندار مخلوق ہیں وہ کبھی خدا کی گرفت سے نہیں بچ سکتے اسی سلسلہ کی ایک داستانِ عبرت وموعظت کو قرآن کریم نے اپنے دفتین میں محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔

سامی اقوام کی پیشرو قوموں میں ایک قوم ثمود گذری ہے۔ الثَّمْدُ۔ اَلثَّمَدُ۔ الثِّمَادُ تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں جو کہیں جمع ہو جائے اور جس کا کوئی چشمہ نہ ہو۔ مثلاً بارش کا پانی۔ اس قوم کا نام ثمود (بعض محققین کے نزدیک) اسی لئے پڑ گیا تھا کہ ان کے علاقہ میں پانی کی شدید قلت تھی اور یہ بارش کے پانی پر گذارہ کیا کرتے تھے اور چونکہ پانی کی بڑی قلت تھی اس لئے ان کے ہاں کھیتی باڑی بھی برائے نام ہی تھی۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی علاقہ پر حکمران تھی جسے وادی القریٰ کہتے تھے حِجر ان کا دارالحکومت تھا جو اس قدیم راستہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا ہے یہ علاقہ آتش فشاں پہاڑیوں سے لبریز تھا۔ یہ قوم میدانوں میں وسیع و رفیع محلات تعمیر کرتی اور پہاڑوں کو کاٹ کر ان میں مستحکم ترین قلعے بناتی تھی جو سنگ تراشی کا اعلیٰ نمونہ تھے ($\frac{7}{74}$، $\frac{15}{82}$)

انسانیت کے ابتدائی دور کی طرح ان میں بھی قبائلی نظام جاری تھا اور نو سرداروں کی ایک ٹولی ان پر حکمران تھی جن کا ایک سردار اعلیٰ ہوا کرتا تھا۔ مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں کو ہمیشہ اپنی ملکیت بنالیتی ہیں جس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ کمزور انسان بھوکے مرجاتے ہیں۔ حضرات انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ رزق کے سرچشموں

کو مستبد قوتوں کے چنگل سے نکال کر نوع انسانی کے لئے عام کر دیں لیکن ان کے ہاں مسئلہ بے زبان مویشیوں کا بھی تھا۔

صحرا نورد اقوام میں پانی کے ذخائر اور چراگاہوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ قوم ثمود کے ہاں بھی یہی حالت تھی اور سرداروں نے پانی کے چشموں کو اپنے قبضے میں لے رکھا تھا اور کمزور انسان ان کے دست نگر تھے۔ معاشرہ کے اس فساد کو مٹانے کے لئے ان میں حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے (۷/۳) جنہوں نے ان سے کہا کہ وہ ملک میں اس قسم کی ناہمواریاں پیدا نہ کریں (۷/۴) مورخین کا اندازہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا زمانہ اڑھائی ہزار سال قبل مسیح سے لیکر ۱۶۰۰ قبل مسیح کے درمیان واقع ہے۔ آپ کی دعوت کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں جو مسلک ہمارے اسلاف سے چلا آرہا ہے۔ ہم اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی پوزیشن مستحکم تھی اس لئے قوم کے سرداروں نے آپ سے معاہدہ کر لیا کہ پانی کے چشموں پر جانوروں کی باریاں مقرر کر دی جائیں اور امیروں غریبوں کے جانور اپنی اپنی باری پر پانی پی لیا کریں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اس بات کے ثبوت کے لئے کہ تم اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہو یا نہیں اپنی ایک اونٹنی اللہ کے نام پر چھوڑ رہا ہوں یہ اونٹنی کسی کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اللہ کے نام پر وقف ہے۔ اگر تم نے اسے اپنی باری پر پانی پی لینے دیا تو سمجھا جائے گا کہ تم اپنی بات پر قائم ہو (۷/۳) لیکن ان مفسدین نے اس معاہدہ کو نبھایا نہیں

ان کے سرغنہ نے (جوان کا سردارِ اعلیٰ تھا) اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر اسے مار ڈالا۔ چونکہ یہ اونٹنی اللہ کے نام پر چھوڑی گئی تھی اور معاہدہ کی پابندی کی نشانی تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے اسے ناقۃ اللہ اور آیۃ (نشانی) فرمایا ہے (۷/۲۴) وہ لوگ عیش وآرام کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک رات آتش فشاں پہاڑوں میں دھماکہ ہوا۔ ایک چیخ، ایک گرج، ایک کڑک کی آواز فضا میں گونجی اور قومِ ثمود کی بستیاں راکھ کا ڈھیر بن گئیں (۷/۵)۔

یہ عذابِ الٰہی اگرچہ ان کی معاہدہ شکنی، اور غریبوں کے مویشیوں کو پانی نہ پینے دینے کی بناء پر نازل ہوا تھا۔ لیکن اس عذاب الٰہی کا سببِ قریب اس ایک اونٹنی کو ظلم و تعدی کا نشانہ بنانا ہی تو تھا جو حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ کے نام پر چھوڑی تھی اور جو کسی کی ملکیت نہیں تھی کہ اس کا مالک اس کی حفاظت کرتا۔ وہ بظاہر بیکس اور بے والی، وارث اونٹنی تھی۔ ایک ایسی اونٹنی پر ظلم وستم کا یہ انجام ہوا کہ پوری قوم ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ قرآن کریم نے اس معمولی واقعہ کو (معمولی اس لئے کہ اونٹ روزانہ معلوم نہیں کتنے ذبح ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک معمول ہے) اس لئے بیان فرمایا ہے تاکہ اس سے لوگ عبرت حاصل کریں اور سمجھیں کہ بدنیتی سے بلا وجہ ایک بے زبان جانور کو ستانے کا انجام کتنا دردناک اور حسرت ناک ہو چکا ہے۔

احادیث نبوی ؐ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اگر کسی نے چھوٹی سی چڑیا

(کنجشک) کو یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر مار ڈالا تو اللہ کے ہاں اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ صحابہ نے پوچھا۔ اے اللہ کے رسول! اس کا حق کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا حق یہ ہے کہ ضرورت کے ماتحت اسے باقاعدہ ذبح کرکے کھاؤ، یہ نہیں کہ یونہی اس کا سر کاٹ کر اسے پھینک دو۔[1]

(مشکوٰۃ۔ کتاب الصید و الذبائح)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو جانور کھائے نہیں جاتے اور وہ درندہ بھی نہیں ہیں جن سے کوئی اندیشہ ہو۔ انہیں شکار کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے۔

(مشکوٰۃ، کتاب الصید والذبائح)

جو جانور کھائے جاتے ہیں۔ ان کو بھی ذبح کرنا ہو تو اس طرح ذبح کرو کہ اُنہیں کم سے کم اذیت پہنچے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا اللہ نے ہر چیز پر احسان فرمانے کا حکم دیا ہے۔ اس لئے جب تم کسی جانور

---

[1] اس حدیث نبوی سے معلوم ہوا کہ حلال جانوروں کو بھی صرف کھانے کے لئے ذبح کیا جا سکتا ہے۔ ویسے ہی ذبح کر کے پھینک دینا جائز نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کے ہاں اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ حج کے موسم میں جو حاجی جانوروں کو ذبح کر کے یونہی پھینک دیتے اور کھیتوں میں دبا دیتے ہیں۔ یا ان کو جلا دیا جاتا ہے وہ بھی جائز نہیں ہے۔ کیا ہمارے علمائے کرام اس صورت حال پر غور کرنے کی تکلیف فرمائیں گے؟ ہم اس پر فقہ القرآن جلد اول کتاب الحج کے قربانی کے باب میں اپنی گذارشات پیش کر چکے ہیں۔ (مؤلف)

کو ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو۔ تمہیں چاہیئے کہ تم اپنی چھری کو خوب تیز کر لو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔

(مسلم کتاب الصید والذبائح)

ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جب میں کسی بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔ آپ نے فرمایا، تمہیں بکری پر رحم آتا ہے تو حق تعالیٰ بھی تم پر رحم فرمائے گا۔

(مسند احمد ابن حنبل ص ۴۳۶ ج ۳)

لوگ عام طور پر جانوروں کے ستانے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے آپ نے بتایا کہ جیسے انسانوں کو ستانا گناہ ہے اسی طرح جانوروں کو ستانا بھی گناہ ہے۔ چنانچہ ایک عورت کی مثال آپ نے دی جس نے ایک بلی کو بند کر دیا اور اسے کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا۔ اور وہ بھوکی پیاسی مر گئی تو حق تعالیٰ نے اس عورت کو عذاب میں مبتلا فرمایا۔ (بخاری۔ کتاب الانبیاء ص ۴۹۵)

ایک دفعہ آپ کسی سفر میں پڑاؤ پر تھے۔ آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولھا ایک ایسی جگہ جلایا ہے جہاں چیونٹیوں کا سوراخ تھا۔ یہ دیکھ کر آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ اُن صاحب نے عرض کیا کہ یہ میں نے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا "بجھاؤ، بجھاؤ"، مطلب یہ تھا کہ چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو یا وہ جل نہ جائیں۔

(مسند احمد ابن حنبل ص ۳۹۶ ج ۱)

ایک غزوہ میں آپ شریک تھے۔ کوئی صحابی ایک چڑیا کے دو بچے

پکڑ لائے، چڑیا فرط محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی، آپ قضائے حاجت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ واپس آ کر یہ حالت دیکھی تو آپ بے چین ہو گئے اور فرمایا کہ اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اسے بیقرار کیا ہے۔ اس کے بچوں کو چھوڑ دو۔

(بخاری صفحہ ۴۲ جلد ۱ کتاب بدء الخلق)

ایک صحابی نے سوال کیا کہ میں نے اپنے ذاتی اونٹوں کے لئے پانی کے حوض بنائے ہوئے ہیں تاکہ ان سے میرے اونٹ پانی پی سکیں لیکن جو حوضوں پر لوگوں کے بھولے بھٹکے اونٹ بھی آجاتے ہیں۔ اگر میں ان کو بھی پانی پلا دوں تو کیا مجھے اس پر بھی ثواب ملے گا؟ آپ نے فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر جاندار کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔ (ابن ماجہ۔ باب الادب۔ باب فضل صدقۃ الماء)

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص سفر میں جا رہا تھا۔ راستہ میں اسے پیاس لگی۔ اتفاق سے ایک کنواں مل گیا اور اس نے کنویں میں اتر کر پانی پی لیا۔ کنویں سے نکلا تو وہاں ایک کتا کھڑا تھا جو پیاس کی شدت سے ہانپ رہا تھا اور کیچڑ چاٹ رہا تھا۔ اسے ترس آیا اور وہ دوبارہ کنویں میں اتر کر پانی نکال کر لایا اور کتے کو پلایا۔ حق تعالےٰ کے ہاں اس کا یہ عمل مقبول ہو گیا اور اس کی بخشش ہو گئی۔ صحابہ نے یہ واقعہ سنا تو پوچھا یا رسول اللہ! کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے پر بھی ثواب ملتا ہے آپ نے فرمایا کہ ہر جاندار کے ساتھ سلوک کرنا موجب ثواب ہے۔ (بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم)

صرف جانداروں تک ہی نہیں بلکہ نباتات کی خدمت اور پرورش

کو بھی موجب اجر بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ جو کوئی مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اسے کچھ چڑیاں، یا انسان یا جانور کھاتے ہیں تو یہ بھی مالک کے حق میں صدقہ ہوتا ہے اور اسے اس کا ثواب ملتا ہے۔

(بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب فضل الزرع و الغرس اذا اکل منہ)

جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ فرمایا۔ جب تم سرسبزی و شادابی میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ اٹھانے دو۔ اور جب قحط اور خشک سالی کے زمانہ میں سفر کرو تو انہیں تیز چلاؤ (یعنی سفر کو جلد ختم کردو)

(مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحت الادب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق)

مطلب یہ ہے کہ قحط کی وجہ سے چوپایوں کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے اس سے جلد از جلد ان کو چھٹکارا مل جائے۔

جانوروں کے منہ پر مارنے یا ان پر داغ لگانے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد باب وسم الدواب)

جانوروں کو باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا کہ اس سے وہ بیفائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف اٹھاتے ہیں۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم)

ملاحظہ فرمائیے کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم ہے اور کس قدر رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے کہ جانوروں تک کو تکلیف پہنچانا بھی اسے گوارہ نہیں ہے۔

فہرست کتب حوالہ

- احکام القرآن للجصاص الرازی
- ترجمہ تفسیر ابن کثیر مطبوعہ نور محمد کارخانۂ کتب کراچی۔
- تفسیر ابن کثیر طبری
- تفسیر در منثور للسیوطی
- ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد
- جمع الفوائد مطبوعہ مطبعہ خیریہ میرٹھ
- مسند احمد ابن حنبل
- سنن دارمی
- سنن ابوداؤد
- جامع ترمذی
- مستدرک حاکم
- صحیح مسلم
- سنن ابن ماجہ
- نیل الاوطار للشوکانی رح
- سنن دارقطنی
- سنن کبریٰ بیہقی
- کتاب الآثار للامام ابی یوسف تحقیق ابوالوفا افغانی۔
- اعلاء السنن لشیخ الاسلام العلامہ العثمانی رح
- فتح الباری شرح صحیح بخاری لابن حجر عسقلانی۔
- تنویر الحوالک شرح مؤطا الامام مالک للسیوطی۔
- مؤطا امام مالک
- سنن نسائی
- فیض الباری شرح صحیح بخاری لمولانا انور شاہ الکاشمیری رح
- شرح معانی الآثار للطحاوی
- الترغیب والترہیب للمنذری
- الادب المفرد للبخاری

- مشکوٰۃ المصابیح للخطیب
- کتاب الام للامام الشافعی
- الاختیارات العلمیہ المطبوعہ مع الفتاویٰ لابن تیمیہ۔
- المدونۃ الکبریٰ للسحنون (فقہ مالکی)
- العنایہ برحاشیہ فتح القدیر
- المحلی لابن حزم الاندلسی (فقہ ظاہری)
- ردالمحتار علی الدر المختار لابن عابدین شامی۔
- المدخل لابن الحاج
- فتاویٰ قاضی خاں امام فخرالدین حسن بن منصور المتوفی ۲۹۵ھ۔
- بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع للکاشانی رحمہ اللہ
- بدایۃ المجتہد لابن رشد
- البحرالرائق لابن نجیم مصری
- کتاب الخراج لابی یوسف مطبوعہ مصر
- کتاب الاموال لابی عبیدہ مطبوعہ مصر
- نورالانوار ملاجیون مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی۔
- تاج العروس فی شرح القاموس للزبیدی۔
- معجم مقاییس اللغۃ لابن فارس
- مفردات امام راغب رحمہ اللہ
- لطائف اللغۃ
- مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران
- مجمع الامثال میدانی مطبوعہ مصر
- تہذیب التہذیب لابن حجر رحمہ اللہ
- میزان الاعتدال فی اسماء الرجال للذہبی رحمہ اللہ
- الاصابہ فی تمییز الصحابہ لابن حجر العسقلانی
- شذرات الذہب لابن عماد الحنبلی
- الاستیعاب فی اسماء الاصحاب لابن عبدالبر
- تہذیب الاسماء والصفات للنووی
- رجال کشی (شیعہ اسماء الرجال)
- طبقات ابن سعد مطبوعہ لیڈن
- تاریخ الامم والملوک للطبری مطبوعہ لیڈن
- البدایہ والنہایہ لابن کثیر مطبوعہ بیروت
- خلفائے راشدین مولانا معین الدین ندوی
- انسانیت موت کے دروازہ پر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔
- سیرت النبی علامہ شبلی نعمانی دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ (نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان)
- حیات سید العرب علامہ حسنین عبداللہ باسلامہ۔
- سیرۃ ابن ہشام مطبوعہ مصر۔
- عیون الاخبار لابن قتیبہ

- الفاروق شبلی نعمانی
- تاریخ الکامل لابن اثیر
- سیرت عائشہ مولانا سید سلیمان ندوی
- المواہب اللدنیہ للقسطلانی مطبوعہ مصر
- مصابیح السیر المحمدیہ شرح مواہب لدنیہ مطبوعہ مصر۔
- روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء و الملوک والخلفاء۔ لمیر خواند ابن خاوند شاہ ابن محمود الہروی مطبوعہ نولکشور لکھنؤ۔ (تاریخ شیعہ)
- قرآن اور علم جدید از ڈاکٹر رفیع الدین ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور۔
- انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا
- تورات مقدس (عہد نامۂ عتیق)
- انجیل مقدس (عہد نامۂ جدید)
- منوسمرتی
- چانک نیتی
- الطرق الحکمیہ فی السیاستہ الشرعیہ لابن القیم۔
- العقد الفرید لابن عبد ربہ
- الامامۃ والسیاستہ (منسوب الی ابن قتیبہ)
- اظہار حقیقت از مولانا محمد اسحاق صاحب ندوی۔
- مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی
- مبادی نظام الحکم الاسلامی ڈاکٹر عبد الحمید متولی
- حجاب المرأۃ المسلمۃ فی الکتاب والسنۃ ناصر الدین البانی مطبوعہ المکتبۃ الاسلامی بیروت طبع ثالث۔
- کشف الغمہ للشعرانی
- مجمع البحار للعلامۃ الفتنی

اعلاء السنن جلد دوم

کتاب الصلوٰۃ کی وہ احادیث جن سے فقہاء حنفیہ نے استدلال فرمایا ہے۔ حدیث نبوی کی عظیم الشان کتاب مؤلفہ شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ۔

(قیمت بیس روپے)

قرآن مجید اور مروجہ اسلام

ہمارا موجودہ اسلام کہاں تک قرآنی تعلیمات کے مطابق ہے۔

(قیمت پینتیس روپے)

حور کی حقیقت

فقہ القرآن جلد سوم (حقوق نسواں) میں ہم نے حورٌ کے سلسلہ میں اپنی یہ تحقیق پیش کی تھی کہ یہ لفظ اَحْوَرُ بروزن اَفْعَلُ کی جمع بھی ہے جو مذکر کے لئے آتا ہے۔ اور حَوْرَاءُ بروزن فَعْلَاءُ کی بھی جمع ہے جو مؤنث کے لئے آتا ہے۔ لہٰذا لفظ حُوْرٌ مذکر و مؤنث کا جامع ہے جس طرح لفظ اَلنَّاسُ مرد و عورت دونوں کے لئے ہے۔ اب یہ طے کرنے کے لئے کہ کہاں یہ لفظ مذکر کے لئے آیا ہے اور کہاں مؤنث کے لئے قرینہ دیکھنا ہوگا۔ اور اس کے مطابق مفہوم اختیار کرنا ہوگا ——— ہم چاہتے ہیں کہ قرآنی آیات کی روشنی میں اس مبحث پر مزید غور کریں۔ ایک صاحب نے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "جنت کی نعمتوں میں اگر مرد کے لئے حور کا ذکر ہے تو دوسری بیشمار نعمتیں عورتوں کے لئے بھی رکھی گئی ہیں جنکی تفصیلات قرآن و احادیث صحیحہ میں موجود ہیں۔ یہ خیال کہ جنت میں مرد کو حوریں ملنے سے عورت کی کمزوری ثابت ہوتی ہے قطعی غلط ہے۔"

یعنی ان صاحب کو ہمارے مقصد تحریر سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ بھی اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں کہ اس بات سے عورت کی کمتری اور مرد کی برتری کا ثبوت مہیا کرنا غلط ہے

ہم میں اور ان میں اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ کیوں غلط ہے؟

یہی صاحب کہتے ہیں کہ حوریں جنتی عورتیں ہوں گی جو مردوں کو عطا ہوں گی ۔ یہ نعمت مردوں کے ساتھ مخصوص ہوگی لیکن عورتوں کو اس کے بجائے دوسری نعمتیں ملیں گی جو مردوں کو نہیں ملیں گی ۔ لہٰذا ایک کی کمتری اور دوسرے کی برتری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ لیکن ان صاحب نے ان نعمتوں کی کوئی تفصیل نہیں بتائی جو خصوصیت سے عورتوں کو ملینگی اور مردوں کو نہیں ملیں گی ۔ اور اپنے قارئین کو پھر اندھیرے میں چھوڑ دیا ہے کہ وہ خود ڈھونڈتے رہیں اور اگر انھیں ایسی نعمتوں کا سُراغ نہ ملے تو وہ صبر کر کے بیٹھ جائیں ۔

اس کے برعکس فقہ القرآن جلد سوم میں ہم نے اس کا دو ٹوک جواب یہ دیا ہے کہ عربی زبان میں فُعْلٌ کا وزن جمع کے لیئے آتا ہے اور یہ أَفْعَلُ اور فَعْلَاءُ دونوں کی جمع ہے ۔ اَحْوَرُ (مذکر) کی جمع بھی حُوْرٌ ہے اور حَوْرَاءُ (مؤنث) کی جمع بھی حُوْرٌ ہے ۔ لہٰذا حُوْرٌ کے معنے ۔ نہایت سفید فام مرد اور عورتیں دونوں کے ہیں ۔ جیسے سفید فام عورتوں کو حُوْرٌ کہا جاتا ہے ایسے ہی نہایت سفید فام مردوں کو بھی حُوْرٌ کہا جا سکتا ہے ۔

جنت میں جو مرد جائیں گے اور جو عورتیں جائیں گی وہ سب نہایت سفید فام ہوں گے جسمانی طور سے بھی اور روحانی اعتبار سے بھی جیسا کہ احادیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی رو

سے جنت میں سب کے سب نو عمر اور جوان سال ہونگے وہاں کوئی بوڑھا اور ادھیڑ نہیں ہوگا۔ ایسے ہی وہاں کوئی سیاہ فام اور زرد رو نہیں ہوگا سب سفید فام ہوں گے۔

ان صاحب نے ہمارے متعلق یہ بات نہ معلوم کس طرح منسوب کر دی کہ

"عمر احمد عثمانی صاحب کے فلسفے کے مطابق چونکہ (حور) مرد بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے ان کی مراد غالبًا یہ ہے کہ جس طرح مردوں کو "حور" عورتیں عطا کی جائیں گی اسی طرح عورتوں کو "حور" مرد عطا ہوں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کریم کی مذکورہ آیات میں صیغہ ہائے تانیث کا استعمال نہ کیا جاتا۔"

یہ ہم پر بیجا تہمت ہے۔ ہم نے اپنی کتاب میں وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان پاکیزہ جوڑوں کی کیا صورت ہوگی۔ یہ جوڑے کسی جنتی مخلوق سے ترتیب دیئے جائیں گے یا خود دنیوی زندگی میں نیک اور صالح افراد کے اعمال صالحہ کی وجہ سے جو مرد اور عورتیں جنت کے مستحق افراد ثابت ہوں گے انہی سے یہ جوڑے ترتیب

دیئے جائیں گے۔ یعنی دنیا میں جو میاں بیوی بن کر رہ چکے تھے۔ وہاں بھی ان کی یہ جوڑیاں علی حالہ باقی رکھی جائیں گی۔ اور ان ہی لوگوں کو جنت کے سفید فام (حور) کے لقب سے یاد کیا جائے گا۔ بہر حال اخروی زندگی کی کیفیات سے متعلق ہم اس دنیا میں مرنے سے پہلے کوئی رائے زنی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہاں کے حالات وکیفیات۔ ہماری موجودہ علمی وعقلی سطح سے بہت بلند ہیں۔ ہم انھیں سمجھ ہی نہیں سکتے۔ (فقہ القرآن ص ۱۳۳ ج ۳ - ۴)

لہٰذا ناقد صاحب نے خبر نہیں کہاں سے یہ خیال جما لیا کہ عثمانی صاحب غالباً اس کے قائل ہیں کہ جنت میں ایک جنتی مخلوق حوروں کی ہوگی۔ جیسا کہ مردوں کو سفید رنگت والی عورتیں عطا کی جائیں گی اور عورتوں کو جنتی حوریں یعنی سفید رنگت والے مرد عطا کیے جائیں گے۔

جیسا کہ میں نے فقہ القرآن جلد سوم کا اقتباس اوپر نقل کیا ہے، اس میں تو ہم کوئی فیصلہ ہی نہیں دے رہے کہ جنت میں کیا صورت پیش آئے گی ہم صاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ ہم اس دنیا میں اپنی موجودہ علمی وعقلی سطح پر عالم آخرت کے معاملات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے ان پر کوئی رائے زنی نہیں کی جا سکتی

ہمارے اس اقتباس سے البتہ ایسا نظر آتا ہے کہ اگرچہ ہم کوئی فیصلہ نہیں دے رہے مگر ہمارا رجحان اسی طرف ہے کہ یہ حوریں یعنی سفید فام مرد و عورت اسی دنیا کے صالح بندے ہوں گے جو اپنے اعمال کی جزا میں جنت میں جائیں گے اور جیسا کہ وہ دنیا میں میاں بیوی تھے اسی طرح جنت میں بھی یوں ہی میاں بیوی بن کر رہیں گے۔

رہی یہ بات کہ قرآن کریم کی مذکورہ آیات میں صیغہ ہائے تانیث کیوں استعمال کئے گئے ہیں تو ہمیں حیرت ہے کہ ناقد صاحب کو اتنی سی بات بھی معلوم نہیں کہ "حُوْرٌ" جمع مکسّر کا صیغہ ہے اور جمع مکسّر کے لئے تانیث کے صیغے ہی کا استعمال ہوتے ہیں

ہمارا بیان قطعاً صحیح ہے کہ فُعْلٌ کے وزن پر اَفْعَلُ کی جمع بھی آتی ہے اور فَعْلَاءُ کی جمع بھی آتی ہے۔ اس کے ثبوت میں قرآن کریم سے بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس وقت صرف چند مثالوں پر ہی اکتفا کروں گا جو خود قرآن کریم میں استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً اَصَمُّ کی جمع صُمٌّ، اَبْکَمُ کی جمع بُکْمٌ، اَعْمیٰ کی جمع عُمْیٌ، اَسْوَدُ کی جمع سُوْدٌ، اَصْفَرُ کی جمع صُفْرٌ، اَحْمَرُ کی جمع حُمْرٌ، اَبْیَضُ کی جمع بِیْضٌ، اَخْضَرُ کی جمع خُضْرٌ میرے خیال میں بات کو سمجھنے کیلئے اتنی ہی مثالیں کافی ہوں گی۔ لہٰذا حورٌ جیسا کہ حَوْرَاءُ (مونث) کی جمع ہے اسی طرح اَحْوَرُ (مذکر) کی جمع بھی ہے۔ لہٰذا "حُوْرٌ" کے لفظ سے یہ سمجھنا کہ وہ صرف عورتیں ہی ہوتی ہیں لغت اور قرآنی

استعمالات دونوں کے خلاف ہے۔

موصوف نے اس کے بعد چند قرآنی آیات پیش کی ہیں۔ چونکہ ان کے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ حوریں عورتیں ہی ہوتی ہیں اس لئے انھیں ان آیات میں بھی عورتیں ہی نظر آرہی ہیں۔ مثلاً سورۂ دخان میں ($\frac{۴۴}{۵۴}$) میں بحورٍ عینٍ کا ترجمہ یوں ہے۔

كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝

"یونہی ہوں گا۔ اور ہم ان کے جوڑے بڑی بڑی آنکھوں والے سفید فام لوگوں کے ساتھ بنادیں گے۔"

موصوف نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

"اسی طرح ہوگا۔ گوری رنگت اور خوبصورت آنکھوں والیوں سے ہم ان کا بیاہ کر دیں گے۔"

محترم موصوف کے نزدیک آیت میں جنتی مردوں ہی کا ذکر ہو رہا ہے اور مردوں کو بیویوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کا بیاہ انھوں نے گوری رنگت اور خوبصورت آنکھوں والیوں سے فرمادیا۔ حالانکہ سورۂ دخان میں صرف مردوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ عام اہل جنت کا ذکر ہے جن میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔ پوری آیات یوں ہیں

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۝ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۝ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ

مُتَقٰبِلِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝ (۴۴/۵۱-۵۴)

"پرہیزگار لوگ امن والے مقام میں ہوں گے۔ باغات میں اور چشموں۔ اور وہ باریک اور دبیز ریشم (سندس اور استبرق) کے کپڑے پہنے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یوں ہی ہوگا اور ہم ان کے جوڑے سفید فام بڑی بڑی آنکھوں والوں سے بنائیں گے۔"

ناقد صاحب ارشاد فرمائیں کہ پرہیزگار، کیا صرف مرد ہی ہوتے ہیں عورتیں نہیں ہوتیں؟ امن والے مقام یعنی باغات اور چشموں میں صرف مرد ہی رہ سکتے ہیں، عورتیں نہیں رہ سکتیں؟ باریک اور دبیز ریشم (سندس اور استبرق) کے کپڑے پہن کر صرف مرد ہی بیٹھ سکتے ہیں۔ عورتیں نہیں بیٹھ سکتیں؟ (سندس اور استبرق پہننے والے مردوں سے زیادہ ہمیں تو عورتیں زیادہ موزوں نظر آرہی ہیں) اگر ان آیات کریمہ میں مردوں اور عورتوں، دونوں کا ذکر ہے تو آخری آیت میں آپ نے مردوں کی تخصیص کہاں سے فرمادی؟ کیا نکاح یا بیاہ صرف مردوں ہی کا کیا جاسکتا ہے عورتوں کا نہیں کیا جاسکتا؟

اس کے بعد سورۂ "طور" میں بھی (۵۲/۲۰) میں یہی لفظ آیا ہے۔ وہاں سلسلۂ کلام یوں چلا آرہا ہے —

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنّٰتٍ وَعُيُونٍ ۝ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ۝

"یقیناً متقی لوگ باغات میں اور عیش میں ہوں گے جو کچھ ان کے پروردگار نے عطا کیا ہوگا اس سے محظوظ ہو رہے ہوں گے۔ اور ان کے پروردگار نے انھیں جہنم کے عذاب سے بچا لیا ہوگا۔ ان سے کہا جائیگا کہ مزے سے کھاؤ پیو، ان اعمال کے بدلے جو کچھ تم کرتے رہے ہو وہ قطار در قطار بچھے ہوئے تختوں پر تکئے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ اور ہم نے ان کے جوڑے سفید فام بڑی بڑی آنکھوں والوں سے بنا دیئے ہوں گے۔ (۵۳/۲۰۱۷)

ان آیات کریمہ میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ بات متقیونکی ہو رہی ہے۔ ناقد صاحب ارشاد فرمائیں کہ کیا متقی صرف مرد ہی ہو سکتے ہیں۔ عورتیں نہیں ہو سکتیں؟ باغات اور عیش و آرام میں صرف مرد ہی ہو سکتے ہیں۔ عورتیں نہیں ہو سکتیں؟ پروردگار کے عطیات سے محظوظ ہونیکا حق صرف مردوں ہی کو ہو سکتا ہے، عورتوں کو نہیں ہو سکتا؟ عذاب جہنم سے صرف مردوں ہی کو بچایا جائے گا، عورتوں کو نہیں؟ مزے سے کھانے پینے کی اجازت صرف مردوں ہی کو ہوگی، عورتوں کو نہیں ہوگی؟ قطار در قطار بچھے ہوئے تختوں پر تکیہ لگا کر صرف مرد ہی بیٹھ سکیں گے یا عورتیں بھی بیٹھ سکیں گی؟ اگر ان تمام آیات میں عام جنتی متقیوں کا

ذکر ہے، یعنی مردوں اور عورتوں دونوں کا، تو آخری آیت میں آپ نے صرف مرد کہاں سے مراد لے لئے کہ ان کا نکاح گوری رنگت اور خوبصورت آنکھوں والی جنتی حوروں سے آپ نے کرا دیا؟

اس کے بعد سورۂ واقعہ میں "حُورٌ عِینٌ" کا لفظ آیا ہے۔ وہاں سلسلۂ کلام یوں چلا آرہا ہے۔:

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ٥ ... وَحُورٌ عِینٌ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ٥ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ٥

اور سب سے اول ایمان لانے والے سب سے پہلے جنت میں داخل ہونیوالے ہوں گے۔ یہی مقرب لوگ ہیں جو نعمت کے باغات میں ہوں گے۔ بہت سے پہلوں میں سے اور تھوڑے سے پچھلوں میں سے جو جڑاؤ تختوں پر براجمان ہوں گے۔ ان پر آمنے سامنے تکئے لگائے بیٹھے ہونگے۔ ان پر ہمیشہ رہنے والے خدام (لڑکے) گشت کر رہے ہونگے شراب طہور کے آبخورے، کوزے اور پیالے لئے ہوئے جس سے نہ تو ان کو سرور ہو گا اور نہ وہ مست ہونگے اور ان کے پسندیدہ میوے لئے ہوئے اور جنکی انھیں خواہش ہوگی ان پرندوں کے گوشت لئے ہوئے۔ وہ سفید فام بڑی بڑی آنکھوں والے ہونگے ان موتیوں کی طرح جنھیں آفتاب کی تمازت سے بچا کر رکھا گیا ہو۔ یہ بدلہ ہوگا ان اعمال کا جو وہ کرتے رہے ہوں گے۔ ($\frac{56}{10-24}$)

اس آیت کریمہ میں وَحُورٌ عِینٌ کا عطف مُخَلَّدُونَ پر ہے

جو وِلدانٌ کی صفت ہے یعنی جو خادم شراب طہور کے آبخورے کوزے اور پیالے لئے، ساتھ ہی پسندیدہ میوے اور پسندیدہ پرندوں کے گوشت لئے گھوم رہے ہوں گے وہ ایک تو ہمیشہ رہنے والے ہونگے اور دوسرے گوری رنگت والے اور بڑی بڑی آنکھوں والے حسین نوعمر خدام ہوں گے۔ اس آیت میں تو حُورٌ عِینٌ خدام جنت کے سلسلے میں آیا ہے جو لڑکے ہوں گے۔ لہذا حوروں کا عورتیں ہونا اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ثابت ہورہا ہے۔

واضح رہے کہ حُورٌ اور عِینٌ دونوں اسماء صفت ہیں لہذا انکا وِلدانٌ کی صفت ہونا قرین قیاس اور مطابق اصل ہے اسکی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہاں حُورٌ عِینٌ کے لئے "لؤلؤ مکنون" کہا گیا ہے۔ اور یہ لفظ قرآن کریم میں جہاں کہیں آیا ہے ان ہی وِلدانٌ اور غِلمانٌ کے لئے آیا ہے۔ مثلاً سورۂ طور میں ہے۔

وَأَمْدَدْنَاهُم بِفَاكِهَةٍ وَلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ۝
يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ ۝
وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ۝

اور ہم انھیں میوے اور گوشت جس کی وہ خواہش کرینگے بافراغت دینگے۔ وہاں وہ ایک دوسرے سے (شراب طہور کے) پیالے لے رہے ہونگے جنمیں نہ کوئی بیہودگی ہوگی اور نہ ماندگی اور ان پران کے لڑکے (خدام) گھوم رہے ہونگے گویا کہ وہ غلافوں میں چھپائے ہوئے موتی ہوں (۵۲/۲۲-۲۴)

نیز سورۂ دہر میں ہے

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۝ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ۝ (76/19)

اور وہاں انھیں ایسے پیالے پلائے جائیں گے جنمیں زنجبیل، (سونٹھ) کی آمیزش ہوگی۔ یہ ایک چشمہ ہے جسکا نام وہاں سلسبیل ہے اور ان پر ہمیشہ باقی رہنے والے لڑکے (ولدان) گھوم رہے ہونگے۔ جب انھیں دیکھو تو انھیں بکھرے ہوئے موتی سمجھو۔

البتہ سورۂ رحمٰن کی آیات (55/70-74) میں حُورٌ سے مراد سفید فام عورتیں ہی ہیں۔ ان کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝

جنت کے باغات میں نیک اور خوب صورت عورتیں ہونگی تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ وہ سفید فام ہوں گی خیموں میں قیام پذیر۔ تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ انھیں ان سے پہلے نہ کسی آدمی نے چھوا ہوگا نہ کسی جن نے۔ تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟۔

اس آیت میں بیشک حُورٌ کے معنے سفید فام عورتوں کے ہیں۔

مرد مراد نہیں ہیں۔ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ حُوْرٌ صرف اَحْوَرٌ کی جمع ہوتی ہے اور اس کے معنے صرف سفید فام مرد ہی ہوتے ہیں اور یہ کہ حُوْرٌ ، حَوْرَاءُ کی جمع نہیں ہے۔ اور اس کے معنے سفید فام عورت کے نہیں ہو سکتے۔ میں نے تو اس کے دونوں معنے تسلیم کئے ہیں سفید فام مرد بھی اور سفید فام عورتیں بھی۔ لہٰذا اگر کسی جگہ یہ لفظ صرف سفید فام عورتوں کے لئے آ گیا ہے تو وہ ہمارے خلاف نہیں ہے۔ آیات ($\frac{۵۶}{۲۴-۱۰}$) میں حُوْرٌ کا لفظ صرف سفید فام مردوں کے لئے آیا ہے اور آیات ($\frac{۵۵}{۲۴-۷۰}$) میں صرف سفید فام عورتوں کے لئے اور باقی تمام آیات میں یہ لفظ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے آیا ہے۔ ایک وہ لفظ جو دو معنوں میں مشترک ہے اس میں یہی ہوتا ہے کہ کہیں دونوں معنے مراد ہوتے ہیں اور کہیں کوئی ایک معنے۔ اس کی تعیین کہ کہاں مشترک معنے مراد ہیں اور کہاں کوئی ایک معنے قرینہ سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن کسی مشترک المعنی لفظ کے صرف ایک ہی معنیٰ تسلیم کرنا اور دوسرے معنے کا انکار کر دینا بڑی زیادتی کی بات ہے اور یہی زیادتی ہمارے ناقدین کر رہے ہیں۔